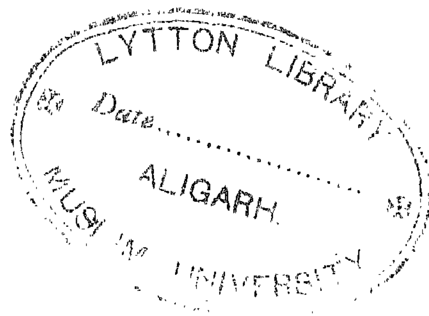
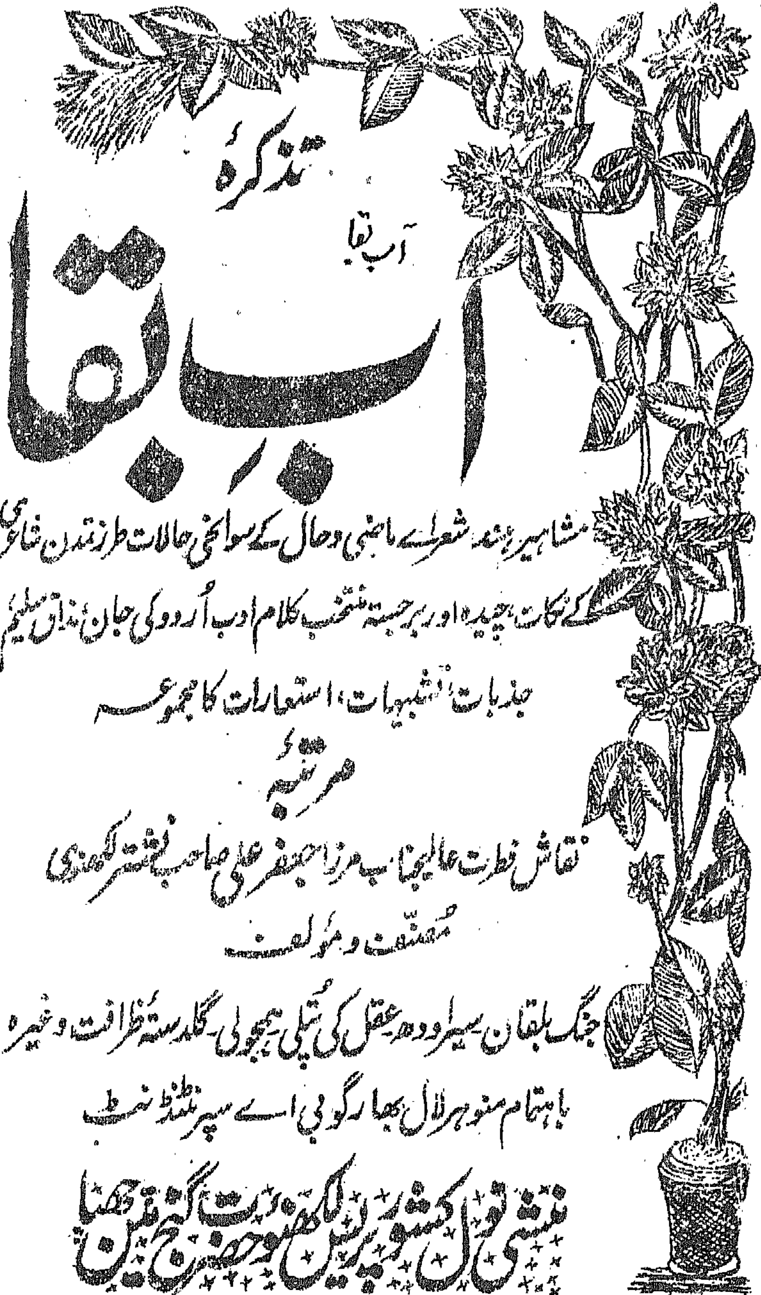

LYTTON LIBRARY
Date
ALIGARH.
MUSLIM UNIVERSITY



تذکرہ

آب بقا

مشاہیر ہند شعرائے ماضی و حال کے سوانحی حالات طرز تمدن شاعری کے نکات جیدہ اور برجستہ منتخب کلام ادب اُردو کی جان مذاق سلیم جذبات تشبیہات استعارات کا مجموعہ

مرتبہ

نقاش فطرت عالیجناب مرزا جعفر علی صاحب نشتر لکھنوی

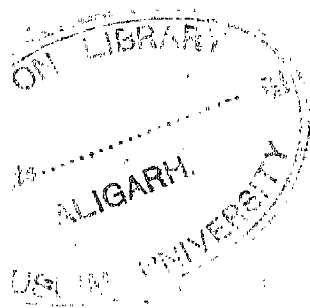
مصنف و مولف

جنگ بلقان سیر و دھ عقل کی پتلی پہیلی۔ گلدستہ ظرافت وغیرہ

باہتمام منوہر لال بھارگوی اے سپرنٹنڈنٹ

منشی نول کشور پریس لکھنؤ حضرت گنج میں چھپا

بار اوّل ایکہزار جلد　　　قیمت　　　فروری ۱۹۱۸ء



بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مرتبہ

جناب مرزا جعفر علی صاحب نشتر لکھنوی

فہرست مضامین

تمہید

ہندوستان میں کوئی ایسا شخص نہ ہوگا۔ جو اخبارات اور رسالجات دیکھنے کا شوق رکھتا ہو اور جناب مولوی منشی خواجہ محمد عبد الرؤف صاحب عشرت لکھنوی کو نہ جانتا ہو۔ کوئی ایسا مشہور شاعر اور مستند انشا پرداز نہیں ہے۔ کہ جو لکھنؤ میں آیا ہو اور ان سے ملاقات نہ کی ہو۔

ہندوستان کا کوئی مقتدر رسالہ ایسا نہیں جس نے کوئی نہ کوئی مضمون خواجہ صاحب کا شایع نہ کیا ہو۔

عموماً نامور لوگ یا تو نثار ہوتے ہیں یا شاعر۔ مگر ہمارے خواجہ صاحب میں دونوں اوصاف بحد کمال موجود ہیں آپ کی نثر سلک گوہر ہے تو نظم عقد ثریا۔ نثر آب حیات ہے تو نظم جام کوثر ایک موہن بھوگ ہے تو دوسری من و سلوا۔ ایسے مرد میدان بہت کم ہیں جو دونوں معرکوں میں دلیری کے ساتھ قدم رکھ سکیں۔ خواجہ صاحب جس برجستگی کے ساتھ نظم کے دریا بہا دیتے ہیں اسی مستند معلومات سے نثر کے میدان میں قدم رکھتے ہیں۔ اسی واسطے آپ کی نظم و نثر دونوں مقبول عالم ہیں

آپ کا سلسلہ تلمذ خاندان ملک الشعرا میر دہلوی سے ہے میر کے فرزند سید محمد عسکری عرف میر کلو عرش کے شاگرد رشید شیخ محمد جان شاد پیر و میر لکھنوی آپ کے اُستاد تھے۔ پیرو میر اس لئے مشہور ہوئے کہ آپ گیارہ برس کے سن میں میر کی خدمت میں غزل لے کر حاضر ہوئے۔ تو اُستاد نے دست شفقت شاگرد کی پیٹھ پر پھیرا اور اپنے فرزند کی شاگردی میں دیدیا۔ پیرو میر مشہور عروضی تھے۔ اور بغیر عروض و قافیہ پڑھائے کسی کو اپنا شاگرد نہیں کرتے تھے۔ اسی تعلیم کا فیض تھا کہ رفتہ رفتہ خواجہ صاحب کا کلام مقبول عام ہوا۔ لوگ اس کی نقلیں محفوظ رکھنے لگے اور بعض احباب نے مجھ سے اصرار کیا کہ اگر مختلف مضامین جمع کئے جائیں تو دنیائے ادب میں ایک کثیر

اضافہ ہوگا۔ میں نے کئی برس کی مشقت اور تلاش سے کلام مرتب کیا۔ میری ترتیب کی پہلی کتاب "سیر اودھ" ہے جس میں اودھ کے بادشاہوں کے حالات، خاندان اودھ کے امرار کی کیفیت، محلات شاہی کی ضیافتیاں، لکھنؤ کی تمدنی حالت، شہر کی آبادی اور عمارات قدیم کا تذکرہ ہے۔

اس کے بعد "صرف نحو" کے مختلف مضامین مرتب کئے۔ چند مضامین اردو کی حمایت میں لکھے تھے۔ ان کو علیحدہ مجموعے میں جمع کیا۔

تعلیم نسواں کی غرض سے چند چھوٹے چھوٹے قصے سلیس عام فہم نثر میں خاص عورتوں کی زبان میں لکھے تھے، ان کو جدا ترتیب دیا۔ اور اس مجموعہ کا نام "سہجولی" رکھا

غزلیں جس قدر مطبوعہ غیر مطبوعہ دستیاب ہوئیں۔ اُن کو دیوان کی صورت میں لکھا۔

ظرافت کے پیرائے میں جتنے نظم و نثر مضامین شایع ہو چکے تھے اُن کو کتابی جامہ پہنایا۔

یہ کتاب جس کا نام "آب بقا" ہے لکھنؤ اور دہلی وغیرہ کے بعض شعرا کا مفصل اور جامع تذکرہ ہے۔ ان شعرا کے حالات تو اور مصنفوں نے بھی لکھے ہیں۔ مگر خواجہ صاحب نے خاص تحقیقات سے مزید حالات بہم پہنچائے ہیں اور کلام کا انتخاب شاعرانہ حیثیت سے کیا ہے۔

آخر میں خواجہ عشرت صاحب کی نیچرل نظموں کا مجموعہ بھی اسی کے ساتھ شامل ہے۔ مجھے اس بات کا بہت افسوس ہے کہ بہت سے شعرا کے حالات اور بہت سی نیچرل نظمیں جو مختلف رسالوں میں شایع ہو چکی تھیں دستیاب نہ ہوئیں تاہم اس کتاب میں نظم و نثر کے بہت سے جواہر مجتمع ہیں۔ اور اردو زبان کے محاورات، اصطلاحات حاصل کرنیوالوں کیلئے ایک عمدہ سبق آموز کتاب ہے، جو کچھ اس مجموعہ میں ہے سب ٹکسالی زبان ہے اور طلبا کیلئے بھی کارآمد ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ کتاب ملک میں دلچسپی سے دیکھی جائیگی۔

یہ شکر کا مقام ہے کہ خواجہ صاحب کی تصنیف میں سے ایک کتاب "زبان دانی" صیغہ تعلیم گورنمنٹ بنگال نے تمام ہائی کلاسیس کے طلبا کیلئے منظور فرمائی۔

مجھے امید ہے کہ یہ کتاب بھی طلبا کیلئے کارآمد ثابت ہوگی اور صیغہ تعلیمات میں داخل ہو جائیگی۔ طلبا کو اس کتاب سے نظم و نثر کا اچھا سبق حاصل ہوگا۔ خاصکر مختلف شعرا کے مستند کلام سے صنایع، بدایع، استعارات، تشبیہات، امثلہ، محاورات پر عبور حاصل ہوگا۔

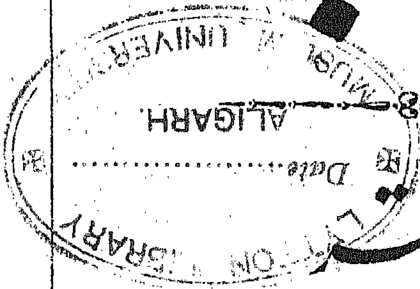
سرائے سیوہ۔ لکھنؤ
مورخہ یکم جنوری ۱۹۱۶ء

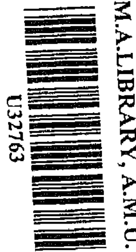
احقر مرزا جعفر علی نشتر عفی عنہ



بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آب بقا





شاہ اختر

ہمارا دعوےٰ ہے کہ حضرت سلطان ابن سلطان خاقان ابن خاقان ابو المنصور ناصر الدین سکندر جاہ بادشاہ عادل قیصر زماں سلطان عالم محمد واجد علی شاہ اختر سابق شاہ اودھ اُردو کی ہر صنف میں قادر الکلام تھے اور نظم کے ہر صیغے میں آپ نے دادِ سخن دی ہے۔

شاہی میں مشاعرے نہایت شان و شوکت اور دھوم دھام سے ہوتے تھے۔ لال بارہ دری میں سہ پہر کو چمن بندی گُل و فوارہ کی ہوتی تھی۔ کمرے میں تمام سامانِ عیش تیار ہوتا تھا دریچیاں سبز/سرخ کاشانی مخمل کی جن میں گز گز بھر کی جھالر نقرئی طلائی ٹنکی ہوئی۔ چاروں طرف گلدستے قرینے سے رکھے ہوتے۔ جھاڑ، جھاپے، کنول، فانوس شام سے روشن ہو گئے، پردوں میں بنت، گوکھرو، لچکا ٹنکا ہوا۔ چاروں طرف قدِ آدم آئینہ بندی۔ مشاعرے عام نہ ہوتے تھے۔ مشاعرے میں ہمیشہ اہلِ دربار شریک ہوتے تھے۔ اور کبھی خاص اعزائے بادشاہ مدعو ہوتے تھے شاہ سے مرزا خورم بخت بہادر نواب یحییٰ علی خاں مرزا عظیم الشان نواب محمد تقی علی بہادر مرزا رفیع الشان بہادر نواب مجید الدولہ عظمت الدولہ مرزا سلیمان قدر بہادر دارا سطوت۔ مرزا

حیدر نیشاپوری تشریف فرما ہوئے اور اپنے اپنے مراتب کے موافق دہنے بائیں بیٹھے بیچ میں مسند پر بادشاہ جلوہ افروز ہیں۔

خواجہ سرا گنگا جمنی کشتیاں جن میں بھاری بھاری لچکے گپے کے ہار الائچیاں چکنی ڈلیاں عطر کے کنٹر رکھے ہوئے عملی کشتی پوش پڑے ہوئے سب کے سامنے ایک ایک کشتی لگا گئے۔ ملازمین اٹھا لے گئے۔

اس کے بعد مشاعرہ شروع ہوا ہر ایک نے غزل پڑھی۔ اور یہ پُر لطف صحبت بارہ بجے شب تک ختم ہو گئی۔ اہلِ دربار کا مشاعرہ ہر مہینے میں ہوا کرتا تھا۔ اور یہ صحبت بہت ہی پاکیزہ اور پُر لطف ہوتی تھی۔ گرمی کے دن ہیں شام سے لال بارہ دری کی چھت پر چھڑکاؤ ہو رہا ہے۔ قنائیں گھیری جاتی ہیں پھولوں کے گلدستے منڈیروں پر رکھے جاتے ہیں۔ مکلّف فرش بچھایا جاتا ہے۔ قنانوں پر بیلے کے ہار پھیلے ہوئے ہیں۔ اہلِ دربار اپنے قرینے سے مودب بیٹھے ہوئے ہیں۔ یہ کون ہیں؟ مدار الدولہ علی نقی خاں بہادر وزیر۔ یہ کون ہیں؟ فتح الدولہ بخشی الملک مرزا محمد رضا خاں برقؔ، یہ کون ہیں؟ آفتاب الدولہ قلقؔ، یہ کون ہیں؟ تدبیر الدولہ دبیر الملک منشی مظفر علی خاں بہادر جنگ اسیرؔ۔ یہ کون ہیں؟ مقبول الدولہ احسان الملک کپتان مرزا مہدی علی خاں ثابت جنگ قبولؔ اسی طرح تمام درباری تشریف لائے۔ اور اپنی اپنی جگہ پر فروکش ہوتے۔ اتنے میں حضور جہاں عالم برآمد ہوئے۔ تمام ارکین سروقد کھڑے ہوئے اور بسم اللہ۔ بسم اللہ کی صدا چاروں طرف سے آنے لگی۔ حضور مسند زرنگار پر باجاہ وجلال جلوہ افروز ہوئے۔ مشاعرہ دہنی طرف سے شروع ہوا۔ اور مختصر غزلیں پڑھی گئیں۔ علی قدر مراتب ہر ایک کی تعریف ہوئی۔ سب کے بعد حضور نے اپنا کلام پڑھا اور مشاعرہ برخاست ہوا۔ رؤسا اور امرائے شہر کے بہت سے مشاعرے ہوتے تھے۔ مگر حضور کبھی کسی مشاعرے میں تشریف نہیں لے گئے۔ فتح الدولہ برقؔ نے اور منشی اسیرؔ نے بادشاہ کی اکثر غزلوں پر مصرعے لگائے ہیں۔ جو مشہور عام ہیں۔ یوں تو بادشاہ کا کلام بہت ہے۔ مگر اس وقت ہمارے سامنے کلیات مبارک ہے۔

حمد باری تعالیٰ

تری الفت میں ہر سلطاں کو رتبہ ہو گدائی کا
سوا تیرے کسے زیبندہ ہو دعویٰ خدائی کا

لگی ہو چوٹ جس کو عشق کی باتوں میں پچھاہو
زباں نے خاصہ پیدا کیا ہے موسیائی کا

ولہ

پابند دل ہوا جو تمہارے خیال کا ہر دم ہے پیشِ چشم تصورِ جمال کا

ولہ

ہر عاشقِ دل سوختہ دیوانہ ہے اس کا وہ شمعِ تجلے ہے یہ پروانہ ہے اس کا

ولہ

بخش دے گا نامۂ اعمال کو رب کریم دستِ عصیاں میں جو تو اپنا لکھائے جائیگا

عارض کی صفت

عارض صاف ترا رشک قمر دیکھ لیا جان سی آ گئی جب ایک نظر دیکھ لیا
جو شب کو کوٹھے پہ وہ چاند بے نقاب آیا چھپا ہلالِ فلک اس قدر حجاب آیا

ولہ

بیاضِ رُخ سے آئینہ کی قلعی کھل گئی بالکل سوادِ زلف پر دھوکا ہوا ہے مجھکو سنبل کا
آنکھیں ہیں نرگس ہیں رخسار رُخ گل ہیں چھوتا ہے ہونٹوں کو یہ سیبِ ذقن تیرا
رُخ اپنا ہم کو دکھلایا تو ہوتا ذرا سورج کو شرمایا تو ہوتا
گالوں پہ جو اس یار کے بالا نہیں رہتا شب کو کبھی مہتاب پہ ہالا نہیں رہتا

ولہ

اے آفتابِ حسن ترا آفتابہ ہے سورج کو منہ دھلانے کا لوٹا بنا دیا

زیور کی تعریف

کان کی بالی سے دل چھا کر ہوا ہے خار دار ناک کا ٹھنکا ہماری آنکھیں کھٹکا کیا

عشق و محبّت

اُلفت نے تری ہم کو تو رکھا نہ کہیں کا دریا کا نہ جنگل کا ہوا کا نہ زمیں کا

ولہ

مری زباں سے پوچھو مزا محبت کا یہ خوب جانتی ہے ذائقہ محبت کا
نصیب فتح ہو یا ہو مجھے شکست اختر خدا بچائے ہوا سامنا محبت کا

ولہ

دلِ گویا کو ترے عشق نے خاموش کیا یادِ غیروں کی ہوئی مجکو فراموش کیا

ولہ

محبت کا بندہ بنا لیجیئے گا مرا دل بھی نامِ خدا لیجیئے گا
ابھی امتحانِ محبت نہ کیجے کبھی تیغ سے آزما لیجیئے گا

ولہ

مرا پتلا بنا دے اے خدا اُلفت کی مٹّی کا تبو نسے تانہ رہجائے کوئی پھر حوصلہ دل کا

دل کی حالت

عجیب کوچہ ہے اپنے جی کا کہ باؤں مکتا نہیں خوشی کا
پتا نہیں اُس کی دل لگی کا یہ دل بھی معشوق ہے کسیکا

ولہ

بلادِ دل جو بگاڑ ابنائے گا پھر کیا؟ اُجاڑتا ہے رعیت بسائے گا پھر کیا؟

ولہ

اتنی چاہت سے بھی دل بے سروساماں ہوگا راحتِ کم کے سبب رنج فراواں ہوگا

ولہ

دل ہدف ہوگیا ہے تیر کے سبحان اللہ کیا کماں دار تھا وہ اور نشانہ کیا تھا

ولہ

آنسو بہے رخسار پر دل نے مجھے رسوا کیا

دنیا کی ہوس

ہوس بڑھتی ہے اتنی جسقدر یہ عمر گھٹتی ہے
ضعیفی کہہ رہی ہر کوئی کمسن ہو تو میں آؤں

ولہ

گئی بہار نہ کر الفتِ زن و فرزند
خزاں چمن میں ہوئی موسمِ خضاب آیا

ولہ

طالبوں نے پست کی آخر بلندی حرص کی
دفن ہمراہ خزانہ آپ بھی قارون ہوا

فلک کی شکایت

ارمان دل میں رہ گئے بوس و کنار کے
کیا چرخ نے بٹھا دیا مجھکو ابھار کے

متفرق

اندھیرا بزم میں تھا تو جو انجمن میں نہ تھا
چمن اُداس تھا اے گُل جو تو چمن میں نہ تھا
ابھی لگاتے تھے مہندی جو تم گلستاں میں
تمہارا پاؤں مرے دل میں تھا لگن میں نہ تھا
غرور کا جو کیا امتحان اختر پر
کلام کبر زباں پر نہ تھا دہن میں نہ تھا

ولہ

اختر اس بے مہر سے ناحق وفا کا دھیان ہے
تو نے کیسا خیالِ خام اے نادان کیا

ولہ

نہ کیونکر بلبلِ شیراز مرقد میں پھڑک جائے
جہاں قائل ہے اے اختر تمہاری خوش بیانی کا

ولہ

مجھی کو واعظا پند و نصیحت
ذرا اس کو بھی سمجھایا تو ہوتا

ولہ

کچھ لطف خوشی ہے نہ مجھے خوف الم کا — حسرت ہے نہ راحت کی نہ دھڑکا ہے ستم کا
حیراں ہوں میں ان دونوں میں ترجیح کسے دوں — ہستی کی تمنا ہے نہ کچھ خوف عدم کا

ولہ

زور سے غیر نے آ کر در جاناں مارا — دیو نے منہ پہ پرے تخت سلیماں مارا
ان نگاہوں کے لیے ہم سا بہادر ڈھونڈھو — دل کو مارا تو کوئی رستم دستاں مارا

ولہ

ہمارے سامنے جب شوخ مہ لقا آیا — گلے لگا لیں یہی دل میں بارہا آیا

ولہ

حیف ہے شہر خموشاں کا نہ کچھ حال کھلا — نہ وہ صورت نہ وہ سیرت نہ وہ احوال کھلا

ولہ

در آیا جو سینے میں پھر غم نہ نکلا — جو سمجھو تو مجنوں سے میں کم نہ نکلا

ولہ

جس نے تجھے پیدا کیا — اس نے مجھے شیدا کیا

خواجہ حیدر علی آتشؔ لکھنوی

زبان کے قواعد اور کلیات انہیں اصطلاحات و محاورات سے بنتے ہیں جن کا استعمال مستند فصحا کی زبان پر ہوتا ہے اسی لئے کہا جاتا ہے کہ صرف نحو زبان کے تحت میں ہے نہ زبان صرف نحو کے تحت میں ہر زبان کا ایک مرکز ہوتا ہے باقی تمام صوبہ اس کے ماتحت ہوتے ہیں مرکز وہی شہر قایم ہوتا ہے جو سلطنت کا پایہ تخت ہوتا ہے۔ اس لئے کہ بادشاہ اپنے ملک کی زبان کی پرورش میں فیاضیاں کر کے اہل مستند نثار اور شعرا کو جمع کر لیتے ہیں اور وہ زبان کو اپنے صحیح مذاق سے آراستہ و پیراستہ کرتے ہیں اس لئے اکثر یہ ہوا ہے کہ پایہ تخت کے پاس زبان کا بھی دارالسلطنت قایم ہوتا ہے۔ اردو زبان فی نفسہ ایک شیریں اور دلکش زبان ہے ہر زبان کے حروف اسمیں شامل ہیں اور یہ خود سنسکرت زبان سے ماخوذ کی گئی ہے اسکی خوبی اس میں ہے کہ فارسی اور عربی ترکیبوں اور اضافتوں سے اس کو پاک صاف رکھا جائے۔

اس میں شک نہیں کہ اردو علم ادب لکھنؤ میں دہلی سے آیا اور اس بدیہی امر میں انکار کرنا سخت احسان فراموشی ہے یا یہ کہیے کہ دہلی کا ٹکسال لکھنؤ میں اٹھ آیا اس لئے کہ دہلی جن لوگوں سے عبارت تھی وہ سب شہزادے اور شاعر اپنی پختہ کلامی اور کہنہ مشقی کے زمانہ میں دہلی کو سلام کر کے لکھنؤ چلے آئے اور اسی سرزمین میں دفن ہوئے۔ لکھنؤ کے دربار میں ان کی توقیر اور عزت حد سے سوا ہوئی۔ ملک الشعرا میر تقی میرؔ لکھنؤ میں مع اہل و عیال کے چلے آئے اور زندگی بھر مفتی گنج میں رہے اور اب بھی وہیں سو رہے ہیں۔ ملک الشعرا مرزا رفیع السوداؔ لکھنؤ مینا بازار میں آ کر بسے اور میر باقر سوداگر کے امام باڑے میں دفن ہوئے۔ انشاء اللہ خان انشاؔ لکھنؤ میں آئے اور فراشخانے میں رہے اور حسین گنج میں آئینہ بی بی کے باغ میں دفن ہوئے۔ میر حسنؔ، میر خلیقؔ، میر جعفر زٹلیؔ، صاحبقرانؔ، میر تقیؔ، ہوسؔ، میر سوزؔ، طالب علی خان عیشیؔ یہ سب کہاں رہے کہاں دفن ہوئے وطن کو چھوڑ کر غربت میں وہ آرام پایا کہ مر کے بھی لکھنؤ سے نہ نکلے۔ اس قدر دانی کا یہ صلہ ملا کہ لکھنؤ نقشِ ثانی بن گیا۔ اور اب تک اسکا وقار زبان اردو کی تحقیق میں اتنا ہی ہے جتنا شاہی میں تھا۔

جب دلی کے لوگ مر چکے تو خدا نے لکھنؤ کی سرزمین میں بھی ایسے لوگ پیدا کیے جن کی شہرت اور زباں دانی کے نقارے تمام ہندوستان میں بج گئے۔ ناسخ اور آتش کا زمانہ لکھنؤ میں اردو علم ادب کی تاریخ کا زمانہ ہے۔ اس لحاظ سے آتش کے واقعات اور اُن کی اردو کی مستقل خدمت کا احسان تمام ہندوستان پر ہے۔ اردو علم ادب کے ایسے محسن کا ذکر ہر طرح ملک کیلئے مفید ہے۔

خواجہ حیدر علی نام، آتش تخلص تھا۔ آبا و اجداد قدیم باشندے دہلی کے تھے۔ شجاع الدولہ بہادر کے عہد میں ان کے والد خواجہ علی بخش درویش سالک (جو خواجہ زادوں کے خاندان سے تھے) دہلی سے فیض آباد آئے اور محلہ مغل پورہ میں قیام کیا۔ پیری و مریدی کا سلسلہ شروع کیا۔ اسی پر اوقات بسر ہونے لگی۔ اس زمانہ میں دلی اُجڑ رہی تھی۔ عالمگیر ثانی کا بھی انتقال ہو چکا تھا۔ اب سوائے اودھ کے اور کوئی مقام نہ تھا جہاں آسائش سے بسر ہو سکے۔ تھوڑے زمانے کے بعد بکسر کی لڑائی میں شجاع الدولہ بہادر کو شکست ہوئی جس کا رنج بہت کچھ ہوا۔ اس لحاظ سے کوئی شکستِ بکسر کا نام بھی نہ لیتا تھا اس اثنا میں فوج مغلیہ سے بادشاہ بدظن ہو چکے تھے۔ آتے ہی تمام فوج کو برطرف کر دیا مغل لوگ فیض آباد سے شاہجہانپور چلے گئے۔ اس سبب سے مغل پورہ بہت ویران ہو گیا ہر چند مغلوں نے خواجہ علی بخش سے چلنے پر اصرار کیا لیکن خواجہ صاحب کی یہاں اچھی طرح بسر ہو رہی تھی، اس سبب سے کہیں نہ جا سکے۔ اس اثنا میں جناب عالی (نواب شجاع الدولہ بہادر) نے اپنے فرزند نواب آصف الدولہ بہادر کی شادی نواب خانخاناں کی پوتی سے کی جس میں چوبیس لاکھ روپیہ صرف کیا۔ یہ واقعہ ۱۷۶۹ء کا ہے۔ ابھی چہل پہل ہو رہی تھی کہ خواجہ علی بخش کے گھر میں خواجہ حیدر علی آتش پیدا ہوئے۔ باپ کی طرح گورے چٹے اور خوبصورت۔ ابھی لڑکا اچھی طرح جوان نہ ہونے پایا تھا اور تعلیم بھی نامکمل تھی کہ باپ نے انتقال کیا۔ مزاج میں آوارہ گردی تھی اور سر پر کوئی مربی موجود نہ تھا۔ فوج کے لڑکوں کی صحبت میں آتش بانکے اور شوریدہ پشت ہو گئے۔ اُس زمانہ میں بانکپن اور بہادری کی بہت قدر تھی۔ آتش کو بہادری دکھانے کے بہت سے مواقع ملے مغل بچوں کی صحبت میں تیغ زنی بہت اچھی آ گئی تھی۔ آدمی تھے جیوٹ کے بات بات پر تلوار کھینچ لیتے تھے کسنی سے تلوریے مشہور ہو گئے سیکڑوں تلواریں کھائیں ہزاروں ٹانکے لگے۔ اس جوہر کے قدردان فیض آباد میں نواب میر محمد تقی تھے جو آتش کو نوکر رکھکر اپنے ساتھ لکھنؤ میں لے آئے۔ اُنہیں کے ساتھ ناسخ بھی فیض آباد سے لکھنؤ آئے۔

اُس وقت میں ناسخ اور آتش کو یہ خیال بھی نہ تھا کہ ہم کبھی لکھنؤ میں شاعری کے زمرے

میں آئینگے اور ایک مشہور اُستاد کے نام سے مشہور ہوں گے۔ سردی کے زمانہ میں شب کو نواب صاحب کے بنبئی پردے اوڑھ لیتے تھے اور دن کو تنزیب کا انگرکھا پہنے ہوئے اکڑتے پھرتے تھے۔

آتش گورے شکیل وجیہ چھریرا بدن اور رندانہ وضع کے آدمی تھے۔ آدھا سر منڈا ہوا اور آدھے سر پر پٹے (اُس وقت اچھے بانکوں کی یہی وضع تھی۔ اور ان کو اک پٹے جوان کہتے تھے) کھانڈا باندھتے تھے بھنگیرن کی دوکان پر چرس کا دم لگا رہے ہیں کسی نے ان کو دیکھ کر کھنکارا یا سامنے سے مونچھ اونچی کرتا ہوا نکلا بس غضب آگیا تلوار کھینچ لی اور کہا آؤ ہمارے تمہارے دو دو ہاتھ ہو جائیں۔

لکھنؤ میں آکر رفتہ رفتہ آتش کی صحبت بدل گئی۔ ان کو کتب بینی کا شوق ہوا اور دن رات علمی چرچے رہنے لگے۔ اسی زمانہ میں ان کو مذاق سخن پیدا ہوا۔ اور شیخ غلام ہمدانی مصحفی کے شاگرد ہوئے۔ ناسخ بھی ان کے شاگرد ہوئے۔ تھوڑے ہی زمانے کی مشق میں روزمرہ کے محاورے اور صفائی زبان میں اُستاد سے سبقت لے گئے۔ اس مدت میں نواب میر تقی کا انتقال ہوگیا۔ آتش کے شاگردوں کی جمعیت بڑھنے لگی۔ اور کلام کی شہرت ہونے لگی۔

نوازگنج کے قریب چوپٹیوں سے آگے مادھولال کی چڑھائی مشہور ہے وہاں سے اُتار کو ایک چھوٹا سا باغیچہ اور ایک کچا سا مکان تھا وہ آتش نے خرید لیا۔ اور اسی میں رہنے لگے مکان لینے کے بعد آتش نے اپنا نکاح کسی شریف خاندان میں کر لیا۔ تھوڑے زمانے کے بعد ایک صاحبزادے پیدا ہوئے جن کا نام آپ نے محمد علی رکھا۔ ان کی بیوی بہت نیک عورت تھی ان کی وارستہ مزاجی اور اس کی گرہستی نے مل کر گھر سنبھال لیا۔ عقد سے پہلے تو آتش کو ایک ہزار روپیہ ماہوار ملتا تھا جب بھی مہینے میں دو ایک فاقے ضرور ہو جاتے تھے لیکن نکاح کے بعد بی بی کے پس انداز کرنے سے میاں فاقہ کشی سے بچ جاتے تھے۔

مولوی صادق علی کہتے تھے۔ آتش کو میں نے دیکھا ہے گیروا تہہ بند باندھتے تھے۔ ڈنڈا ہاتھ میں رہتا تھا جس میں ایک چھلّہ سونے کا رہتا تھا۔ دوسرے تیسرے فاقہ کی حالت میں چھلّہ رہن رکھکر فاقہ شکنی کرتے تھے۔

سچے کام کا سلیم شاہی جوتا ایک اشرفی کی قیمت کا پہنتے تھے۔ بے طمع اور بے غرض تھے۔ کبھی شاگردوں سے اپنی حاجت کا اظہار نہ کرتے تھے۔ اور اکثر اپنی دولت دعوت اور ضیافت میں اُڑا دیا کرتے

تھے۔ کچھ تنخواہ اودھ کے بادشاہ کی طرف سے ملا کرتی تھی وہ چار دن میں خرچ کر ڈالتے تھے۔

منشی امیر اللہ تسلیم مرحوم شاگرد نسیم دہلوی کہتے تھے ہم نے جس وقت آتش کو دیکھا کوئی ستر برس کے قریب ہو نگے۔ ایک بالشت سے زیادہ ڈاڑھی تھی۔ مہندی کا خضاب کرتے تھے معالی خان کی سرا میں رہتے تھے ایک لنگوٹ باندھے ٹوٹے ہوئے کھٹولے پہ جو زمین دوز تھا تکیہ لگائے ہوئے بیٹھے رہتے تھے بیچ میں بچا حقہ سامنے رکھا رہتا تھا۔ جو کوئی امیر غریب آتا سب کے سامنے وہی ٹوٹا ہوا حقہ پیش ہوتا۔

وارث علی خان اُن کے رفیق بھنگ گھوٹ کر پلایا کرتے تھے۔ مزاج میں توکل تھا جو کچھ آتا اس کو اُسی روز خرچ کر ڈالتے تھے۔ دوسرے روز کے لئے کچھ نہ رکھتے تھے جس روز فاقہ ہوتا دروازہ بند کر کے گھر میں بیٹھ رہتے۔ ایک روز رسالدار فقیر محمد خاں گویا کو معلوم ہوا کہ آتش آج کل بہت تکلیف میں ہیں کچھ روپیہ لیکر گھر پر آئے دروازہ بند تھا۔ آواز دی۔ اندر سے آواز آئی۔ کون ہے؟ یہ بولے فقیر۔

آتش نے کہا فقیر کا میرے یہاں کام نہیں آج خدا مہمان ہے (فاقہ ہے) دوسرے روز پھر آئے مشکل سے دروازہ کھلوا ان کا لڑکا بہت کمسن تھا۔ کوٹھے پر کنکوا اڑا رہا تھا سامنے بلایا اور اُس کا کنکوا، چرخی، ڈور دیکھکر کہا۔ یہ کنکوا تو اچھا نہیں ہے کتنی لیتا ہوگا ڈور بھی اچھی نہیں سستی ہے۔ دو ہزار کی دو تھیلیاں سامنے رکھوا دیں کہ یہ بھی اس کا ڈور کنکوا منگا نا۔

آتش اس بات کی تہ کو پہنچ گئے کہ خانصاحب مجھکو زیر بار احسان کرنا چاہتے ہیں۔ کہنے لگے۔ خاں صاحب آپ کو چاہیئے تھا اس کو تا دیب دیتے کہ ایسے اشغال سے باز رہتا نہ کہ آپ خود ڈور کنکوے سے مدد دیں۔ یہ کہکر پانچ روپئے اٹھا کر لڑکے کو دیئے اور کہا خاں صاحب کو سلام کرو۔ اس کی چیز کھانا۔ باقی روپئے خان صاحب کے واپس کر دیئے۔ کبھی ہنی ہوئی مرچیں کھایا کرتے تھے۔

مولوی فصیح اللہ صاحب وفا کا بیان ہے کہ اس زمانے میں جو مشاعرے ہوتے تھے انہیں ایک قافیہ لازمی قرار دیا جاتا تھا۔ طرح مقرر ہوئی۔ ؎

اپنے بیمار سے بیگانہ مسیحا ہو کر

اس میں "میلا" کا قافیہ لازمی قرار دیا گیا۔ جو قافیہ لازمی ہوتا تھا اُس پر سب شاعر زور دے کر کہتے تھے۔ نواب سید محمد خان رند نے اس میں غزل کہی۔ اصلاح کے واسطے لائے اور کہنے لگے

اُستاد مشروطہ قافیہ تو میں نے اپنے حصہ کا لکھا ہے۔ پھر بہت ناز سے پڑھا ؎

اگر ٹی کا سبب ہے گماں تُنک بہے مالاگیری کا
رنگ لایا ہے دوپٹہ ترا میلا ہوکر

تمام غزل پر اصلاح دی اور کہا ذرا ٹھہرو سید آتا ہوگا (صبا سے مراد ہے) اُس کا قافیہ بھی سُنتے جاؤ۔ تھوڑی دیر کے بعد میر وزیر علی صبا آئے۔ آتش نے پوچھا غزل مشاعرے کی لائے ہو۔ عرض کیا جی ہاں۔ کہا پڑھو۔ صبا نے کہا نواب صاحب بیٹھے ہیں ان کے سامنے میں بھلا غزل پڑھ سکتا ہوں۔ کہنے لگے کیوں کیا نواب صاحب چور ہیں۔ اچھا ایک قافیہ "میلا ہوکر" پڑھ دو۔ صبا نے کہا ؎

باغباں بلبلِ کشتہ کو کفن کیا دیتا
پیرہن گُل کا نہ اُترا کبھی میلا ہوکر

کہنے لگے دیکھئے نواب صاحب شعر اس طرح کہتے ہیں۔

شیخ فضل احمد کیف کہتے ہیں ایک مرتبہ طرح ہوئی زوال نہیں، انتقال نہیں، اس میں "بول چال" کی قید تھی، یہیں بھی طرح کا مصرعہ آیا۔ غزل کہی۔ خواجہ صاحب کو قید کا قافیہ جب سُنایا تو کہنے لگے اب کی بار غزل نہیں پڑھنا۔ تم نے قافیہ خوب کہا ہے میں تو نہ پڑھوں گا۔ وہ شعر یہ ہے ؎

کسی نے باغ میں ایسا شگوفہ چھوڑا ہے
کہ آج تک گُل و بُلبل میں بول چال نہیں

نواب معتمد الدولہ بہادر ناسخ کے شاگرد تھے۔ ان کے مشاعرے بہت دھوم دھامی ہوا کرتے تھے اکثر آتش کو بھی بلواتے تھے۔ یہ اسی بانکپن سے اکڑتے ہوئے جاتے تھے تلوار میان سے دو انگل باہر رہتی تھی۔ لوگ کہتے تھے خدا خیر کرے۔ ایسا نہ ہو مشاعرے میں خون کی ندیاں بہہ جائیں۔

دونوں مشہور شاعر اور دونوں کے شاگرد بے شمار۔ ایک مرتبہ جو مشاعرہ کیا تمام شہر میں مصرعہ طرح تقسیم کر دیا لیکن آتش کو ایک روز بیشتر مصرع طرح بھیجا۔ آپ نے فرمایا شاید معتمد الدولہ بہادر کو ہمارا امتحان منظور ہے جو طرح عین وقت پہ بھیجی۔ خیر دن تو ہم آتے نہ آتے مگر اب جانا ضروری ہے۔ غزل کہی، تلوار کمر سے لگائی، بانکے دار ٹوپی دی۔ شاگردوں کے جم غفیر سے مشاعرے میں داخل ہوئے دیکھا تو معتمد الدولہ نے نیا مکان جو تعمیر کرایا ہے، اُنہیں مشاعرہ کیا ہے۔ آپ نے مکان کو دیکھ کر فی البدیہہ یہ مطلع کہا جب آگے سامنے آیا تو پڑھا ؎

یہ کس رشکِ مسیحا کا مکان ہے
زمیں جس کی چہارم آسمان ہے

مطلع تھا موقع کا دشمن کے منہ سے بھی واہ نکل گئی۔ معتمد الدولہ نے اسی وقت خلعت دیا اور بہت عزت کی۔

آتش کے شاگردوں میں ایک نواب اصغر علی خاں صاحب اصغر بہت خوشگو شاعر تھے مگر وارستہ مزاج غزل پڑھنے کے بعد پھینک دیتے تھے۔ اکثر لوگوں میں ان کے شعر آتش کے نام سے مشہور ہو گئے ہیں۔ ان کا ایک یہ شعر بہت مشہور ہے ؎

اگر بخشے زہے رحمت نہ بخشے تو شکایت کیا
سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے

جب میر تقی میر نے انتقال کیا تو سعادت علی خان کا زمانہ تھا۔ آتش کا سن اسوقت اکتالیس برس کا تھا بہت رنج کیا۔ اس لئے کہ میر صاحب ان کی بہت قدردانی کرتے تھے آتش اور ناسخ کی شاعری میں جتنا فرق تھا اتنا ہی مزاج میں تفاوت تھا۔ آتش رند اور متوکل آدمی تھے۔ اس وجہ سے وہ ہر ایک امیر غریب کو برابر سمجھتے تھے اور دنیاوی ساز و سامان کی چنداں طمع نہ تھی۔ ناسخ مرفہ حال تھے اور لوگوں کی ان کے مرتبے کے موافق عزت کرتے تھے۔ امرا کی آؤ بھگت سوا تھی اس لئے کہ اکثر رئیس اُن کے شاگرد ہوتے تھے۔ ناسخ کے شاگرد جو غریب ہوتے تھے ان کو سفارش کر کے کہیں نوکر رکھوا دیتے تھے۔ اور حد سے زیادہ دنیاسازی کرتے تھے۔ لوگوں کا رجوع ان کی طرف زیادہ ہونے لگا۔ اور رفتہ رفتہ نواب معتمد الدولہ بہادر ان کے شاگرد ہوئے۔ تو ملک میں ان کا اعزاز اور وقار زیادہ ہو گیا۔ آتش نے یہ رنگ دیکھا تو اپنی فقیری کی آڑ لے لی۔ ایک لنگوٹ بھنگ کا سونٹا اور چاروں ابرو کا صفایا گھر سے نکلنا کم کر دیا گیروے کپڑے پہننے لگے مگر وہ فقیری بھی بادشاہت سے بہتر تھی۔ آرام سے اپنے گھر میں فکرِ سخن میں موتی پرو رہے ہیں کسی نے آواز دی دل چاہا تو دروازہ کھول دیا نہیں تو صاف جواب دیا اس وقت آرام میں ہیں۔

خواجہ محمد علی جب تعلیم سے فراغت حاصل کر چکے تو عین شباب میں شعر کہنے لگے۔ جوشش تخلص رکھا گیا۔ مچھلی کے بچوں کو کون تیرنا سکھاتا ہے۔ چند روز میں اچھے مشاق ہو گئے۔ آخر وقت میں آتش کی بینائی جاتی رہی تھی۔ میر دوست علی خلیل ان کی خدمت کرتے تھے۔ غالب جنگ کے بیٹے جے دیال جو آتش کے شاگرد تھے مصر ہوئے کہ آپ جوشش کی شادی کر دیجئے۔ آتش نے عذر کیا کہ فقیر کی

کی کیفیت مجکو معلوم ہے شادی حوصلے کے موافق ہونا چاہئے۔ لائق شاگرد نے ہاتھ باندھکر عرض کیا۔ آپ اپنے کُف میں نسبت ٹھہرالیں۔ شادی کا سامان مناسب مہیا ہو جائیگا۔ آتش کی غیرت نے اس کو بھی قبول نہ کیا۔ آخر بار بار کے تقاضوں سے تنگ آکر جوش کی نسبت ٹھہرانا پڑی۔ شادی کے دھوم دھامی جلسے کے لئے دلارام کی بارہ دری لے لی گئی۔ تمام دوست احباب شاگرد و عزیز مدعو ہوئے بہت معقول انتظام تھا۔ سارا خرچ سجے دیال نے نہایت حوصلے سے کیا جب محمد علی نوشہ بنکر آتش کے سامنے آئے تو آپ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ شاگردوں نے عرض کیا اُستاد یہ وقت خوشی کا ہے خدا نے آپ کو بیٹے کا سہرا دکھایا۔ خدا کا شکر بھیجئے بدشگونی نہ کیجئے۔ ان کی اولاد سے خدا آپ کی نسل قایم رکھے۔ کہنے لگے میں اس بات پر روتا ہوں کہ محمد علی کی والدہ جو خوش ہونے والی تھی وہ زندہ نہیں ہے۔ جو اپنے بیٹے کو دولھا بنے ہوئے دیکھے۔ میں آنکھوں سے اندھا ہوں صورت دیکھ نہیں سکتا۔ یہ کونسا خوشی کا مقام ہے خیر تم لوگوں کو خدا مبارک کرے۔

شیخ ناسخ کے مرنے کی خبر سُنی تو چیخ مار کر رونے لگے۔ لوگوں نے کہا وہ تو آپ کے مخالف تھے ہمیشہ سے دشمنی چلی آتی تھی۔ آپ کو خوش ہونا چاہئے کہ ایک دشمن کم ہو گیا۔ کہنے لگے میاں کیا کہتے ہو۔ ہم اور وہ فیض آباد میں مدتوں ایک رئیس کے نوکر رہے۔ مدت تک ہم پیالہ ہم نوالہ رہے ہمیشہ دوستی کا برتاؤ رہا۔ شاعرانہ نوک جھوک کی اور بات ہے اور اتنا پُرانا تو دشمن بھی نہیں ملتا۔

نواب محمد علی خاں قمر عرف نواب چھدا میاں نے خواجہ آتش کو دیکھا ہے اُس زمانہ میں خواجہ صاحب نابینا ہو چکے تھے۔ مکان میں ایک چھپر پڑا تھا۔ ایک کھٹولا بچھا تھا۔ اُس پر بیٹھے رہتے تھے۔ نرکل کی چٹائیاں سامنے بچھی رہتی تھیں۔

غازی الدین حیدر بادشاہ نے ایک مرتبہ اپنے وزیر معتمد الدولہ سے پوچھا ہمارے شہر میں کوئی نامی شاعر بھی ہے عرض کیا شاعر تو بہت ہیں لیکن ان میں شیخ امام بخش ناسخ اور خواجہ حیدر علی آتش بہت مشہور ہیں۔ ارشاد ہوا اچھا ہماری کوٹھی میں مشاعرہ منعقد کیا جائے۔ معتمد الدولہ نے اس مشاعرے کی خبر ناسخ کو کر دی اور انہیں کی تجویز سے تاریخ اور مصرع طرح مقرر ہو گیا اور آتش کو ایک روز پیشتر چوبدار کے ہاتھ رقعہ طلب آیا۔

بہت پیچ و تاب کھا کر کہا معتمد الدولہ نے اچھا سلوک کیا۔ اب یہ شہر ہمارے رہنے کے قابل نہیں رہا۔ یہ کہکر گھر میں کہلا بھیجا کچھ شگون کی روٹی پکا دو ہم کچھ دنوں کے لئے لکھنؤ چھوڑ دیں گے۔ دوسرے روز علی الصباح تلوار ستہ پیادہ پا نکل کھڑے ہوئے۔ شہر کی ٹھٹ میں مرزا محمد تقی

مرزا حیدر صاحب بیٹھے ہوئے سیر دیکھ رہے تھے۔ آتش کو دیکھ کر کہا اُستاد آج گھر سے کیوں نکلے۔ آدمی بھیج کر بلوا لیا۔ آتش نے کہا ہمارا سلام کہہ دیا اور کہا ہم سفر کو جا رہے ہیں۔ مرزا محمد تقی یہ سن کر خود بوچے پر سوار ہو کر آتش کے پاس پہنچے۔ راہ میں روک کر سب حال دریافت کیا اور کہا اُستاد آپ کو اس کی کیا پرواہ ہے۔ آپ نہیں جانتے کہ میرے پاس پانچسو بانکا پچاس پچاس روپیہ ماہوار کا ملازم ہے یہ کس کام آئیگا آپ دیکھ لیجئے گا۔ اگر معتمد الدولہ نے ہٹ دھرمی کی تو بارہ دری میں لہو کی ندیاں بہہ جائینگی۔ مرزا صاحب دس ہزار روپیہ ماہوار کے وثیقہ دار تھے۔ اُن کے سمجھانے سے آتش وہیں بیٹھ رہے۔ اور شام تک غزل کہا کئے۔

اتنی دیر میں مرزا صاحب نے آتش کی طرف سے ایک درخواست لکھی حضور میں ایک فقیر گوشہ نشین ہوں اگر حضور نے یاد فرمایا ہے تو اتنی اجازت چاہتا ہوں کہ سب سے پیشتر غزل پڑھوں اور دوسری گزارش یہ ہے کہ گزرگاہِ خاص مرحمت ہو۔ یہ عرضداشت محل کے اندر پیش ہوئی اور اس عنوان سے پیش ہوئی کہ بادشاہ نے دستخط فرما دیئے حالانکہ شاہی دربار میں سوائے بادشاہ کے ولیعہد تک کو اجازت نہ تھی۔ شام تک اس مشاعرے کی شہرت تمام شہر میں ہوگئی۔ آتش کے تمام شاگرد نواب غضنفر الدولہ، نواب مہدی علی خان، نواب نصرت یار خان، نواب سید محمد خاں رند، خلیل وغیرہ مرزا صاحب کے دولت کدہ پر جمع ہوگئے۔ شاہی مشاعرے کی طرح "فسانہ کیا" "نشانہ کیا" اٹھی۔ شام کو جب یہ خبر آچکی کہ ناسخ مع اپنے شاگردوں کے مشاعرے میں پہنچ چکے۔ تو آتش نے بھی ٹوٹی تلوار اٹھا کر کمر سے لگائی۔ ایک تہمد آدھی باندھی آدھی اوڑھی ننگے سر ننگے پاؤں گھر سے نکلے۔ پیچھے پیچھے آدمی چھتر لگائے ہوئے اس کے بعد رؤسا، امراء، شاگرد وغیرہ اس کے بعد پانچسو بانکا تلوار کمر سے لگائے۔ کتنے مرنے پر تلے ہوئے۔ اس بات کے تمام لوگ قائل ہیں کہ مشاعرے میں آتش کے سامنے کبھی ناسخ کا رنگ نہیں جما۔ ان کا پڑھنے کا انداز، شعر کا رکھ رکھاؤ، ذکر نے کے تیور کسی کو نصیب نہ تھے۔

آتش شاہی دولت کدہ میں داخل ہوئے تو دیکھا معتمد الدولہ بارہ دری کے اندر شہ نشین پر کرسی بچھائے ہوئے غازی الدین حیدر فروکش ہیں۔ ادھر ادھر ارکین سلطنت تھے۔ باادب کھڑے ہیں آنکھیں جھکی ہوئی ہیں۔ بادشاہ کی بغل میں داہنی طرف ناسخ مع اپنے شاگردوں کے بیٹھے ہیں بائیں طرف آتش کے واسطے جگہ ہے۔ بیچ کے درجے میں کسی کو بیٹھنے کی اجازت نہیں ہے۔ مرزا محمد تقی صاحب آتش کو لئے ہوئے پہنچے کہ درمیانی درجے میں جا بیٹھے۔ چوبدار نے عرض کیا حضور یہاں بیٹھنے کی

اجازت نہیں ہے۔ آپ نے ہوش کردیا وہ خاموش ہو رہا۔ آتش نے پہلے فرشی سلام کیا اور سامنے بیٹھ گئے۔ اور پھر دست بستہ عرض کیا حضور ایفائے وعدہ ہو۔

بادشاہ نے اشارہ کیا ایک خواص خاص گڑگڑی لیکر حاضر ہوا۔ پھر عرض کیا۔ اجازت ہے غزل شروع کروں۔ فرمایا "ہوں"

آتش گڑگڑی لیکر مشاعرے کے بستر سے بیٹھے اور اسی ٹھاٹھ سے اپنی غزل پڑھنے لگے جس سے تمام سامعین وجد میں آگئے۔ اور بادشاہ کے دل پر ایک خاص اثر ہوا۔ سننے والے کہتے ہیں آج تک ایسی زوردار غزل خواجہ صاحب نے نہیں پڑھی۔ بعض شعروں میں ناسخ پر کھلی کھلی چوٹ تھی جن کو بادشاہ سنکر مسکرائے ؎

سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا　　　کہتی ہے تجھکو خلق خدا غائبانہ کیا
طبل و علم ہے پاس نہ اپنے نہ ملک و جاہ　　　ہم سے خلاف ہو کے کریگا زمانہ کیا
ہوتا ہے سن کے زرد جو نامرد مدعی　　　رستم کی داستاں ہے ہمارا فسانہ کیا

یوں مدعی حسد سے نہ دے داد تو نہ دے
آتش غزل یہ تو نے کہی عاشقانہ کیا

آتش کے سب شاگرد بائیں طرف بیٹھے تھے۔ استاد کی تعریف کر رہے تھے۔ ناسخ کے شاگردوں پر اس ادائے خاص کا بہت اثر ہوا اور دل کھولکر لوگوں نے تعریف کی۔ شاہی حکم سے دوسرا خلعت مرحمت ہوا۔ مگر اس شاعر درویش سیرت نے عرض کیا میری عزت وہی کافی ہے جو حضور نے خاص گڑگڑی مرحمت فرما کر دی ہے۔ یہ خلعت ناسخ کو مرحمت ہو۔ میں اپنا صلہ پا چکا اور اسی تیور سے سلام کرکے خوشی خوشی گھر واپس آئے۔

تحسین گنج میں میاں تحسین علی خان خواجہ سرا کے یہاں مشاعرہ ہوا چلن بگڑا کفن بگڑا اس میں بھی پلا آتش کے ہاتھ رہا اور ناسخ کی غزل کمزور ہوئی۔

ولی عہدی کے زمانے میں حضرت محمد واجد علی شاہ آخری شاہ اودھ آتش کے شاگرد ہوئے سو روپئے ماہوار دیتے رہے۔ غزل اصلاح کو بھیجا کرتے تھے۔ آتش نابینا تھے غزل سنکر شاگرد سے اصلاح لکھوا دیا کرتے تھے۔ ایک شعر پر بادشاہ کو کچھ شک ہوا۔ رفقا سے بیان کیا۔ سب نے کہا خداوند آپ کا شعر بے مثل ہے۔ آتش نابینا ہیں۔ شاگرد جو چاہتا ہے شعر کاٹ دیتا ہے۔
یہ خبر آتش کو معلوم ہوئی۔ دوبارہ غزل آئی آتش نے کہا۔ یا ماشاءاللہ خوب غزل کہی ہے۔ اس

سہ ماہی میں جتنی غزلیں آئیں سب پر یہی لکھ دیا۔

جب سہ ماہی تنخواہ آئی تو واپس کر دی اور کہا میں حرام کی تنخواہ نہیں لیتا جب غزل بناتا تھا تنخواہ لے لیتا تھا۔ اب اصلاح نہیں ہوتی۔ تنخواہ کس بات کی لوں۔ بادشاہ نے علی نقی خاں وزیر کو بھیجا آتش نے یہی جواب دیا علی نقی خان نے شاگردوں سے ناراضی کا سبب دریافت کرکے بادشاہ سے بیان کیا۔ بادشاہ خود معذرت کے لئے آتش کے مکان پر گئے۔

منشی قمر صاحب کہتے ہیں جب ہم نے دیکھا ہے تو آتش کی بینائی جاتی رہی تھی گورے دبلے پتلے تھے سر پر بال لمبے لمبے تھے۔ جوڑا باندھتے تھے۔ مونچھیں بڑی بڑی ڈاڑھی منڈی ہوئی ایک تہمد آدھی باندھے ہوئے آدھی اوڑھے ہوئے۔ مکان میں بیٹھے رہتے تھے۔ چہرے سے بانکپن ٹپکتا تھا ایسا متوکل آدمی آج تک دیکھنے میں نہیں آیا۔ خواجہ محمد بشیر کہتے ہیں ہم بہت کمسن تھے صفر کا مہینا تھا سنہ ۱۸۴۶ء تھا۔ آتش کی بیماری کی خبر مشہور ہوئی۔ خواجہ رکن الدین کے ساتھ ہم بھی آتش کی عیادت کو گئے۔ اس زمانے میں واجد علی شاہ کا عہد سلطنت تھا۔ اور اسی سال سریر آرائے سلطنت ہوئے تھے۔

آتش کا مکان مادھو لال کی چڑھائی پر تھا۔ جہاں اب جوتے والی گلی ہے۔ کچا مکان تھا اس پر ایک چھپر پڑا ہوا۔ تقریباً اسی بیاسی برس کا ایک آدمی چار روں ابرو کا صفایا رنگ کھلتا ہوا چارپائی پر لیٹا تھا۔ دریافت کرنے سے معلوم ہوا یہی آتش ہیں۔ کچھ منہ سے کہنا چاہتے تھے آواز نہ نکل سکی۔ شاگرد لوگ نرکل کی چٹائیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم لوگ تھوڑی دیر تک کھڑے رہے پھر چلے آئے۔ اس کے آٹھ روز کے بعد سنا کہ آتش کا انتقال ہو گیا۔ اور اپنے مکان میں دفن کئے گئے۔

معتبر لوگوں سے معلوم ہوا ہے کہ سنہ ۱۲۵۴ھ میں ناسخ کا انتقال ہوا اور ناسخ کے نو برس کے بعد سنہ ۱۲۶۳ھ میں آتش نے اس جہان فانی سے کوچ کیا۔ کسی شاعر نے "چراغ جہان" تاریخ وفات نکالی تھی۔

منشی اشرف علی اشرف نے آتش کی تاریخ وفات خوب لکھی تھی جس کا مادہ "مرد شاہ سخن" ہے۔ خواجہ محمد علی جوش کو بزرگ اور نامور باپ کے مرنے کا بہت کچھ صدمہ ہوا۔ اور صحبت مشاعرہ میں جانا موقوف کر دیا۔ ابھی دو برس نہ گذرے تھے کہ یہ ہیضہ میں دفعۃً مبتلا ہوئے۔ اور دو دن میں تمام ہو گئے۔ رشک مرحوم نے ان کے انتقال کی تاریخ لکھی :-

کجائی تو خواجہ محمد علی — زہیضہ گر رفتی افسوس حیف
دلت آتش داغ بابا بسوخت — چہ بیان جگر رفتی افسوس حیف
پے خدمت خواجہ حیدر علی — زدنیا بدر رفتی افسوس حیف
چنین گفت تاریخ فوت تو رشک — نزد پدر رفتی افسوس حیف
۱۲۶۴ ھ

شیخ محمد جان شاد پیرو میر مرحوم فرماتے تھے کہ آتش کو ہم لوگ بمقتضائے محبت "خوجی" کہتے تھے۔ ان کی شاعری میں آمد کا بہت حصہ ہوتا تھا جو کچھ کہتے تھے بے ساختہ کہتے تھے۔ ہر وقت شعر کی دھن میں محو رہتے تھے، امیروں سے بطمع دنیا نہ ملتے تھے۔ غریبوں سے بیرخی نہ کرتے تھے بانکے تھے اور بانکوں سے ملنا پسند کرتے تھے۔ بہادروں کے کارنامے شوق سے سنتے تھے۔

آتش کے برابر کے شاعروں میں اس وقت شیخ امام بخش ناسخ کا نام سب سے زیادہ مشہور ہے لیکن اس وقت کے اور شاعر بھی ان سے برابری کا دعوےٰ رکھتے تھے۔ گو زمانہ نے ان کو شہرت نہ دی۔ ان سب میں زیادہ خصوصیت سے نواب عاشور علی خاں عاشور کا نام لیا جاتا ہے۔ جو شاعر گر مشہور تھے اور مصحفی کے شاگردوں میں ممتاز درجہ رکھتے تھے۔ نواب طالب علی خاں بہادر عیشی تھے۔ جو فارسی اردو دونوں میں قادر الکلام تھے۔ سید حسن عسکری عرف میر کلو عرش خلف میر تقی میر۔ نواب مرزا محمد تقی خاں بہادر ہوس خلف نواب مرزا علی خاں بہادر دہلوی۔ میر تقی ترقی میاں مضطر۔ میاں مسرور۔ میاں دلگیر وغیرہ لیکن آتش کی خوش گوئی اور لطافت زبان کا سب لوہا مانے ہوئے تھے اور ان کے سامنے منہ نہیں کھول سکتے تھے۔

آتش کا دیوان انہیں کی زندگی میں مرتب ہو کر چھپ چکا تھا۔ یہ غلط ہے کہ ان کا کلام تلف ہو گیا۔ ہمارے پاس دوسرا اڈیشن ۱۲۶۸ھ علوی پریس کا موجود ہے جس میں لکھا ہے۔

اگرچہ سابقاً رو بروئے مصنف زیب طبع یافتہ بود حالا بار دیگر بسعی موفور و کوشش مشکور غزلیات بقیہ را در دیوان دوم اضافہ نمود و مع قطعات وفات مصنف ترتیب دادہ بتاریخ پانزدہم جمادی اولیٰ ۱۲۶۸ھ حلیہ اختتام پذیرفت۔

آتش کی شاعری نے زبان میں فصاحت اور سلاست کا عمدہ نمونہ دکھایا ہے۔ سلک نظم میں بحر فصاحت کے موتی پروئے ہیں۔

شاہی زمانے میں بانکوں کی قدر تھی۔ اور بہادری کے کارنامے عزت سے دیکھے جاتے تھے۔ لکھنؤ کے نازک مزاج تنزیب کے کرتوں پر تلوار کھانے میں مشہور تھے مگر بات اٹھانا دشوار تھی ہتھیار

بندی کا عام رواج تھا۔ اچھے تلوار یئے عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ آتش بھی بانکپن اور آزادخیالی کا جوہر ساتھ لائے تھے طبیعت جنگ جو اور شوریدہ سر تھی۔ فصاحت اور بلاغت کا ملکہ فطرتی تھا۔ بظاہر ایک فرمانروا کے محکوم تھے لیکن قانون کی نرم پالیسی نے ہر ایک کو خودمختار اور آزاد بنا رکھا تھا۔

عرب کے شاعروں کی طرح جو حالت پیش آتی تھی اور خیالات پیدا ہوتے تھے۔ ان کو اصلیت اور جوش و خروش کے ساتھ ادا کر دیتے تھے۔ اسی لئے انکی غزلوں میں بانکپن اور آزادی جانبازی اور شجاعت کے مضامین عمدہ پہلو سے ادا ہوئے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ آتش صرف ایک فنی شاعر تھے نہ کسی کی مدح میں کبھی قصیدہ لکھا نہ تخت نشینی کی تاریخ کہی نہ مثنوی نہ رباعی نہ قطعہ نہ سلام نہ مرثیہ۔ مگر غزل گوئی کے بادشاہ تھے پرانی غزل گوئی کا رنگ بدل دیا۔ ادائے مطلب میں نمایاں ترقی کی جو ان کے کلام سے ظاہر ہے :-

حباب آسا میں دم بھرتا ہوں تیری آشنائی کا
نہایت غم ہے اس قطرہ کو دریا کی جدائی کا

حباب آسا (حباب کی طرح) میں دم بھرتا ہوں (بار بار ذکر کرتا ہوں) تیری آشنائی کا (تیری محبت کا) نہایت غم ہے (بہت غم ہے) اس قطرے کو دریا کی جدائی کا۔ (اس قطرے کو دریا سے جدا ہونے کا)

لطف زبان تو یہ ہے کہ "دم بھرتا ہوں" ایک ایسا فصیح اور جامع محاورہ ہے جس کے بہت سے معنی ہیں۔ دم بھرنا کے لغوی معنی سانس اندر کھینچنے کے ہیں۔ حباب کے لئے دم بھرنے کا لفظ بہت پر لطف آیا ہے کہ اس میں بھی جب ہوا بھر جاتی ہے تو پھول جاتا ہے اور دم بھرنے کے معنی دعوئے محبت کرنے کے بھی ہیں جو شاعر کا مقصود ہے۔ آشنائی کے معنی محبت کے ہیں لیکن آشنا پیراک کو کہتے ہیں اس رعایت سے محبت کی جگہ آشنائی کا استعمال اچھا معلوم ہوتا ہے معنوی خوبیاں یہ ہیں کہ "ہمہ اوست" کے مسئلہ کو اس زبردست شاعر نے دو مصرعوں میں ختم کر دیا ہے۔ اپنی ذات کو قطرہ بنایا ہے اور خدا کو دریا قرار دیکر مسئلہ وحدت کو حل کیا۔ آسا کا لفظ غلط تو نہیں ہے لیکن آجکل اس کا استعمال بہت کم ہے۔ اب اردو زبان سے فارسی اور عربی کے دقیق الفاظ نکلتے جاتے ہیں۔ آجکل حباب کی طرح اور حباب کے مانند بولتے ہیں۔ یہ بھی خیال ہوتا ہے کہ شاعر نے ضرورت شعری سے مجبور ہو کر اس کا استعمال کیا ہے۔ طرح اور مانند کا لفظ اس مصرعہ میں فصاحت کے پہلو سے

آ نا مشکل تھا ؎

تعلق روح سے مجھکو جسد کا ناگوارا ہے
زمانے میں چلن ہے چار دن کی آشنائی ہے

اس شعر میں یہ نصیحت کی ہے کہ محبت کرو تو اس کو نبھاؤ ناپائدار دوستی اچھی نہیں ہے جو اگلی وضعداریوں کے خلاف تھی ؎

حسن پری اک جلوۂ مستانہ ہے اُس کا
ہشیار وہی ہے کہ جو دیوانہ ہے اُس کا

حُسن پری ہمارے معشوق (معشوق حقیقی) کا ایک جلوۂ مستانہ ہے جو اس کا دیوانہ ہے وہی ہشیار ہے۔ مصرعہ اولی میں ہمہ اوست کے مسئلے کو حل کیا ہے یعنی حُسن پری بھی اسی کے جلوہ مستانہ میں سے ہے دیوانہ (شیدا) جو اس کا شیدا ہے۔ وہی ہشیار ہے۔ یہاں مراد ہے اہل اللہ سے لفظی خوبیاں تو یہ ہیں کہ حُسن پری اور جلوۂ مستانہ سے کوئی اچھا لفظ نہیں ملسکتا اور ہشیار اور دیوانے کی رعایت ہے معنوی خوبیاں یہ ہیں کہ تصوف کے ایک وسیع مسئلے کو مثال میں سمجھا دیا۔ لیکن عیب یہ ہے کہ اس میں (کہ) زائد اور ضرورت شعر کے لحاظ سے آیا ہے اور چھوٹی سی تعقید بھی ہے یعنی مستانہ اس کا ہے جانا نہ اس کا ہے چاہئے تھا ؎

گل آتے ہیں ہستی میں عدم سے ہمہ تن گوش
بلبل کا یہ نالہ نہیں افسانہ ہے اس کا

گل عدم سے ہستی میں ہمہ تن گوش آتے ہیں۔ نالۂ بلبل نہیں ہے اسی معشوق حقیقی کا فسانہ ہے گل کو گوش سے بہت نفیس اور نازک تشبیہ دی ہے جو استادی کا اظہار کر رہی ہے ؎

شکرانہ ساقی ازل کرتا ہے آتش
لبریز مئے شوق سے پیمانہ ہے اُس کا

آتش ساقی ازل کا شکرانہ کرتا ہے کہ اس کا پیمانہ مئے شوق سے لبریز ہے یعنی مست مئے شوق رہتا ہے مقطع نہایت صاف اور فصیح ہے ؎

آئے بھی لوگ بیٹھے بھی اُٹھ بھی کھڑے ہوئے
میں جا ہی ڈھونڈھتا تری محفل میں رہ گیا

اس شعر کی بے ساختہ آمد قابل دید ہے۔

ہنر سے نیاریوں کے حال یہ ظاہر ہوا ہمکو
مقدر میں جو دولت ہو تو زر ہو خاک سے پیدا

اس شعر میں سب سے زیادہ یہ خوبی ہے کہ اس میں اس زمانے کے تمدن کا حال معلوم ہوگیا نیاریئے ایک پیشہ ور غریب لوگ ہیں جو سُنار کے یہاں کی خاک "گوشہ نشینے والوں کے کارخانے کی خاک اور برسات میں نالے" نہریا کے کنکر پتھر لے کر کونڈے رکھکر پانی میں چھانتے ہیں۔ اس میں سے کچھ چاندی سونا جو اُن کے مقدر میں ہوتا ہے حاصل ہو جاتا ہے۔ یہی ان کا پیشہ ہے ؎

کیا ہے اپنے غنچہ سے دہن میں تونے جو اسکو
شمیم گل ہوئی ہے ریشۂ مسواک سے پیدا

کیا ہے (پھیرا ہے) اپنے غنچہ سے دہن میں تونے جو اسے پھیرا ہے تو ریشۂ مسواک سے شمیم گل پیدا ہوئی ہے۔ یا گل کی خوشبو آنے لگی ہے۔ اول تو اس میں ایک نازک محاورہ ہے کرنا (پھیرنا) کے معنی پر ریشۂ مسواک سے شمیم گل کا پیدا کرنا کتنی نازک بات ہے۔ دوسرے مسواک کرنے کے طریقے کو کس خوبی سے بتایا ہے جیسیں ہندوستان کے طرز معاشرت کا بیان کرنا منظور تھا۔ یہ باتیں سوائے شعرائے عرب کے عجم کے کلام میں بھی نہیں پائی جاتیں۔

زلف کے حلقے میں اُلجھا سبزہ گوشِ یار کا
ہوگیا سنگِ زمرّد خالِ چشمِ مار کا

زُلف کے حلقے میں (خم زلف میں) سبزہ (آویزہ سبز) جو کان کی بالی میں پہنا جاتا ہے یا بُندوں میں پڑا ہوتا ہے۔ سنگ زمرد ایک قیمتی جواہر ہے چشم مار (حلقۂ زُلف) سے مراد ہے۔ گوشِ یار کا سبزہ خمِ زلف میں اُلجھ گیا سنگِ زمرد خالِ چشمِ مار ہوگیا۔ کتنی نازک تشبیہ ہے اور کس قدر بلند پروازی کی ہے ؎

پھول جب ہے اپنے گلشن کا سپر کا پھول ہے
ہر شجر اس باغ میں لاتا ہے پھل تلوار کا

شاعر نے اپنی بہادری اور بانکپن کا کس نفیس پیرائے میں بیان کیا ہے جس سے لوگوں کو اس کی طبیعت کا اندازہ ہوگیا ؎

تواضع دشمنِ جان کی زیادہ قتل کرتی ہے
خمِ شمشیرِ معشوقوں کا سَوندٹا ہے گردن کا

تھوڑا اتنا جھکانا جو جان کے دشمن ہیں ان کی زیادہ تواضع بھی قاتل ہے معشوق کا گردن جھکا لینا شمشیر کا جھکنا ہے جو بغیر قتل کیے نہیں اٹھتی۔ مراد یہ ہے کہ معشوقوں کا ناز بھی آفت ڈھاتا ہے یہ صائب کے اس شعر کا جواب ہے ؎

بر تواضع ہائے دشمن تکیہ کردن ابلہی است
پائے بوس سیل از پا افگند دیوار را

کیا عمدہ مثال ہے۔ پھر اس فصاحت سے ادا کیا ہے جس نے ان کو اپنے معاصرین میں ممتاز بنا دیا ؎

ادب تا چند اے دستِ ہوس قاتل کے دامن کا
سنبھل سکتا نہیں اب دوش سے بوجھ اپنی گردن کا

بندش کی صفائی قابل دید ہے ؎

کرامت آگے مردانِ خدا کے چل نہیں سکتا
کفِ داؤد میں یکساں ہے عالم موم و آہن کا

اسی شاعری نے ان کو صائب بنا رکھا تھا ؎

بڑا شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا

کتنی پاکیزہ بندش ہے ؎

شاہراہِ ہستیِ موہوم میں وہ چال چل
اپنی آنکھوں کو بچھا دیں دوست دشمن زیرِ پا

شاہراہِ ہستیِ موہوم میں (دنیا میں) وہ چال چل (وہ طرز اختیار کر) دوست دشمن اپنی آنکھیں زیرِ پا بچھا دیں (بے انتہا عزت کریں) اس مضمون کو شاعر نے کسی قدر تعقید کے ساتھ نظم کیا ہے لیکن تخیل بہت پاکیزہ ہے۔ اور نصیحت کی نصیحت۔ آتش نے بہ تقلید شعرائے عجم اخلاقی بہت سے شعر لکھے ہیں جن میں عفت، شجاعت، ہمت، استقلال، توکل، استغنا کا بیان نہایت شوخ پیرائے میں ہے ؎

ملک الموت نے پیری میں کرم فرمایا
کشتِ نخچستہ ہوئی آتش کو مسلسل دوڑا

شاہی میں زمینداروں سے سرکاری تحصیل چوتھ لی جاتی تھی جس وقت کھیتی تیار ہوتی تھی۔ عامل کی طرف سے تحصیلدار آتا تھا اور پیداوار کا چہارم حصہ حق سرکار لیا جاتا تھا۔ اسی سبب سے اس زمانہ کے زمیندار خوش حال تھے۔ خواجہ صاحب نے اسی رسم کا بیان اپنے مقطع میں کیا ہے کہ ملک الموت نے پیری میں قدم رنجہ کیا۔ جب کشت پک گئی (ضعیفی آئی) تو محصل (چوتھائی بٹلنے والا) یعنی ملک الموت دوڑا۔ دنیا کی بے ثباتی کا بیان کس اچھے پہلو سے کیا ہے ؎

ہمیشہ شام سے ہمسائے مر رہے آتش
ہمارا نالۂ دل گوش کو فسانہ ہوا

ہمسائے (پڑوسی) مر رہے (سو رہے) ہمیشہ شام سے پڑوسی سو رہتے ہیں۔ ہمارا نالۂ دل اُن کے کانوں کو فسانہ معلوم ہوتا ہے۔ اگلے زمانہ میں امرا، نواب زادے نیند آنے کے لئے داستان گو قصہ خواں نوکر رکھتے تھے۔ رات کو یہ بستر استراحت پر دراز ہوئے اور اس نے دوزانو ادب سے بیٹھکر دل آویز داستان شروع کی۔ رئیس کو اس کے سرور میں نیند آگئی۔ داستان گو رخصت ہوگیا۔ ہر ایک رئیس و امیر کے یہاں ایک داستان گو ضرور نوکر ہوتا تھا۔ آتش نے اسی طرز معاشرت کا بیان کیا ہے ؎

لگے منہ بھی چڑھانے دیتے دیتے گالیاں صاحب
زبان بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجئے دہن بگڑا

منہ چڑھانا (ٹیڑھا منہ کرنا) ایک معشوقانہ ادا ہے۔ صاحب معشوق سے مراد ہے زبان بگڑی تو بگڑی (زبان خراب ہوئی تو ہوئی) خبر لیجئے دہن بگڑا (یعنی منہ ٹیڑھا ہوگیا۔ اس شعر کے محاورے اور زبان قابل دید ہے "لیجئے" ذرا دکھ آیا ہے جواب متروک ہے ؎

ایذا جو ہو اس خال و گیسو سے تعجب ہے
وہ افعی بے دندان ہے نیش یہ عقرب تھا

اللہ وغنی اس جدت تشبیہ کو دیکھئے گیسو کو افعی تو سب نے کہا ہے مگر افعی بے دندان آتش کا حصہ تھا۔ کیسی نازک تشبیہ دی ہے اور خال کو عقرب بے نیش کہنا بھی نئی تشبیہ ہے نازک خیالی کی حد کردی ؎

اللہ رے ہمارا تکلف شب وصال
روغن کے بدلے عطر جلایا گلاب کا

صیاد نے تسلیِ بلبل کے واسطے — کنج قفس میں حوض بھرا ہے گلاب کا

ان شعروں سے طبیعت کی نفاست کا اندازہ ہو سکتا ہے ؎

لالہ رو کہکر لگاتے ہیں گل اندامون کو داغ
روزِ محشر شاعروں کا پوست کھینچا جائیگا

داغ لگانا (عیب لگانا) پوست کھینچنا عہدِ سلف کی ایک سخت سزا۔ بادشاہ نہایت سنگین مجرم کی کھال کھنچوا کر بھس بھروا کر شارعِ عام پر رکھ دیتا تھا کہ اور لوگوں کو عبرت ہو لیکن یہاں شاعر نے مذاقِ طبیعت سے ایک سنگین سزا کا بیان کر کے تمدنِ سلف دکھایا ہے۔

سامنے آئینہ رکھتے تو غش آ جاتا
تم نے انداز نہیں اپنی ادا کا دیکھا

کتنا صاف شعر ہے ؎

گلزارِ لطف و خُلق شگفتہ رہے مُدام
اس باغ کی بہار الہٰی خزاں نہ ہو

یہ بھی اخلاقیہ اشعار کا ایک نمونہ ہے ؎

کیا بادۂ گلگوں سے مسرور کیا دل کو
آباد رکھے داتا ساقی تری محفل کو

داتا رندانِ بادہ نوش کے محاورے میں خدا کو کہتے ہیں اور کبھی سخی کے معنوں میں بھی آتا ہے ؎

گور میں بھاگ اہلِ دنیا سے
خلوت اس انجمن سے بہتر ہے

گور کو خلوت سے اور دنیا کو انجمن سے کیا اچھی نسبت دی ہے ؎

طور جب برقِ تجلا نے کیا خاک سیاہ
تیرے آتش کدۂ حسن کی چنگاری ہے

کس قدر بلند پروازی کی ہے ؎

لاش پر لاش نکلتی ہے ترے کوچے سے
کیا تماشا ہے کہ پھر بھیڑ نہیں چھٹتی ہے

تیری گلی سے لاش پر لاش نکلتی ہے۔ کیا تماشا ہے (کیا طلسمات ہے) کہ پھر بھیڑ نہیں

چھٹتی۔ کوئے یار میں عاشقوں کی کثرت کو کتنے اچھے پیرائے میں دکھایا ہے۔ مگر ردیف ذرا لپٹی ہوئی نہیں ہے ؎

گُل ہر اک ساغر بکف بلبل ہر اک نغمہ طراز
سیرِ باغ آتش مجھے ایمائے ناؤنوش ہے

ہر ایک پھول ساغر بکف ہے (یہ مشابہت ہے شکل گل سے) بلبل گا رہی ہے باغ کی سیر گویا اشارہ ہے بادہ نوشی کا ؎

تری ابروئے پیوستہ کا عالم میں فسانہ ہے
کسی استاد شاعر کی یہ بیتِ عاشقانہ ہے

ابروئے پیوستہ کو بیت عاشقانہ سے تشبیہ دی ہے ؎

پیامبر نہ میسّر ہوا تو خوب ہوا
زبانِ غیر سے کیا شرحِ آرزو کرتے

پیامبر کے استعمال میں حال کے شعرا نے بہت غلطی کی ہے کہ اس کو نامہ بر کے معنی پر بھی باندھ گئے ہیں پیامبر کے معنی زبانی پیام لے جانے والا مطلب یہ ہے کہ اچھا ہوا کہ پیامبر نہ ملا۔ غیر کی زبان سے اظہار مطلب کیا کرتے ؟

نامرد آسماں سے گوارا ہے کس کو جنگ
آتش سپر کو چیریئے تلوار توڑیئے

اس قسم کی مفاخرت عرب کی شاعری میں تو بہت کچھ ہے اردو کی شاعری میں صرف آتش کے کلام میں ملتی ہے جس میں شاعر نے اپنی بہادری کا جوش وخروش سے اقرار کیا ہے۔ یعنی آسمان نامرد ہے اس لئے دور سے ظلم کرتا ہے۔ سامنے نہیں آتا۔ پھر اس سے مقابلہ کرنا کیا بہتر ہے۔ سپر اور تلوار کو توڑ کر پھینک دیجیے اس لئے کہ بانکے۔ بانکوں سے لڑتے ہیں ؎

کوہِ غم ٹوٹنے پر آہ ہے یاں کم ظرفی
ٹھیس سے کاسۂ چینی کو فغاں کرنے دو

کوہِ غم ٹوٹنے پر (غم کا پہاڑ گرنے پر) آہ ہے یاں کم ظرفی (آہ کرنا ہمارے لئے ہلکا پن ہے) ٹھیس (ٹھوکر) سے کاسۂ چینی کو (چینی کے پیالے کو) فغان کرنے دو (چیخنے دو۔) لفظی خوبیاں تو یہ ہیں۔ کوہِ غم فصیح محاورہ ہے (ٹھیس) ایک جامع لفظ ہے جس کے معنی دو چیزوں کا

باہم ٹکراتا ہے، ٹھوکر لگ جانا، چھوجانا معنوی خوبیاں ہیں۔ کہ عاشق اپنے استقلال کا بیان کرتا ہے کہ اگر کوہِ غم بھی ٹوٹ پڑے تو ہم آہ کرنا حرام جانتے ہیں۔ یہ چینی کے پیالے ہیں جو ذرا سی ٹھوکر سے چیخ اُٹھتے ہیں۔ عیب یہ ہے کہ یاں اب متروک ہو گیا ہے۔ اس کی جگہ (یہاں) بولتے ہیں۔ اسی کو فصیح جانتے ہیں۔

غرض آتش کے کلام میں تشبیہات کی لطافت، استعارات کی نزاکت، رنگ رنگ کے خیالات، تصوف کی جھلک، ہمت، توکل، استغنا کے عمدہ مضامین، فلسفہ، معاشرت، اور خانگی زندگی کی خصوصیات، زمانہ کی رفتار، گفتار، نشست، برخاست، وضع قطع، بود و باند کے طریقے، زندگی کی ضرورتیں، جذباتِ انسانی، مناظرِ قدرت، صحرا، جنگل، سبزہ زار، آبِ رواں، شجاعت، جانبازی، کی جیتی جاگتی صورتیں نظر آتی ہیں، جن کا مقابلہ کرنے میں ان کے معاصرین عاجز تھے۔ اس دعوے کے ثبوت میں ہم اُن کے بعض منتخب اشعار پیش کرتے ہیں:-

گستاخ بہت شمع سے پروانہ ہوا ہے ۔۔۔ موت آئی ہے سر چڑھتا ہے دیوانہ ہوا ہے

نظر آتی ہیں ہر سو صورتیں ہی صورتیں مجھکو ۔۔۔ کوئی آئینہ خانہ کارخانہ ہے خدائی کا

محبت کا تری بندا ہر اک کو لے صنم پایا ۔۔۔ برابر گردنِ شاہ و گدا کو ہم نے خم پایا
سوائے رنج کچھ حاصل نہیں ہے اس خرابے میں ۔۔۔ غنیمت جان جو آرام تو نے کوئی دم پایا

شام سے ڈھونڈا کیا زنجیر پھانسی کے لئے ۔۔۔ صبح تک میں نے خیالِ گیسوئے پیچاں کیا

مری آنکھوں کے آگے آئیگا کیا جوش میں دریا ۔۔۔ ہمیشہ صورتِ سائل ہے یاں آغوش میں دریا

جب سے شیطاں کا احوال سنا ہے میں نے ۔۔۔ پاسِ عزت پہ بھی ارادہ ہے جبیں سائی کا

اے فلک کچھ تو اثر حُسنِ عمل میں ہوتا ۔۔۔ شیشہ اک روز تو قاضی کی بغل میں ہوتا
عرش کی سیر ریاضت نے مجھے دکھلائی ۔۔۔ دخل مزدور سے سلطاں کے محل میں ہوتا

نہ سُنی یار نے اک بات سخن سازوں کی ۔۔۔ رہ گئے کھول کے مُنھ مفسدہ پردازاپنا
یاد آتی ہیں ادائیں جو تری اے محبوب ۔۔۔ بھول جاتے ہیں یہ سب نازِ جہان نازاپنا
خبر اول و آخر نہیں مطلق آتش ۔۔۔ شد تو انجام سے معلوم نہ آغاز اپنا

پھول جو ہے اپنے گلشن کا سپر کا پھول ہو
ہر شجر اس باغ میں لاتا ہے پھل تلوار کا

اے صنم عاشق سے رو پوشی نہیں لازم تجھے
پردہ موسیٰ سے نہیں اللہ کو دیدار کا

او بتا چند اے دست ہوس قاتل کے دامن کا
سنبھل سکتا نہیں اب دوش سے بوجھ اپنی گردن کا

دوستوں سے اسقدر صدمے اٹھائے جان پر
دل سے دشمن کی عداوت کا گلا جاتا رہا

عالم منطق مصوّر ہو تری تصویر کا
متن کتابی قطبی ہے خط حاشیہ ہے میر کا

برہنہ آیا تھا یاں عدم سے برہنہ یاں سے چلا عدم کو
نہ بو سے کافور میں نے سونگھی نہ داغ مجھکو لگا کفن کا

خراب مٹی نہ ہو کسی کی کوئی نہ مردودِ دوستاں ہو
جُدا ہوا شاخ سے جو پتّا غبارِ خاطر ہوا چمن کا

شیریں کے شیفتہ ہوئے پرویز و کوہکن
شاعر ہوں میں یہ کہتا ہوں مضمون لڑ گیا

آتش نہ پوچھ حال تو مجھ دردمند کا
سینے میں داغ، داغ میں ناسور پڑ گیا

یہ دل لگانے میں میں نے مزا اٹھایا ہے
ملا نہ دوست تو دشمن سے اتحاد کیا

سبزہ بالائے ذقن دشمن ہے خلق اللہ کا
رہرووں کی موت ہے خس پوش ہونا چاہ کا

نہ رُلا مجھکو تو اے دوریِ کوئے محبوب
راہ میں ظلم مسافر کو ہے باراں ہونا

ماتم دریا دلاں شادی تنک ظرفوں کی ہے
گریۂ مینا ہے باعث خندہ ہائے جام کا

سُنتا ہوں تختہ پھولا ہے نرگس کا باغ میں
آنکھیں لڑائیے جو ارادہ ہے جنگ کا

آدمی کو موت کے آنے کی لازم ہے خوشی
عید ہے جس روز چھٹکارا ہوا محبوس کا

دانت ہلتے ہیں ہوئے ہیں موئے سر سارے سفید
گور ہنستی ہے سمجھکر مجھکو شایان مرگ کا

زعم میں اپنے یہ نافہم جو اُستاد ہیں سب
معترض ہوجئے تو قائل ایراد ہیں سب

قاتل اپنا جو کرے گنج شہیداں آباد | دہن زخم کہیں خانۂ احسان آباد

منکر ہیں ذات صانع عالم کے دہریئے | نافہموں کا مسئلہ ہے فقط لاالٰہ پر

مرے صنم کا کسی کو مکاں نہیں معلوم | خدا کا نام سنا ہے نشاں نہیں معلوم

رفیق حال بُرے وقت میں نہیں کوئی | شریک جنگ میں شمشیر کا نیام نہیں

صحرا کو بھی نہ پایا بغض و حسد سے خالی | ساکھو جلا ہے کیا کیا پھولا جو ڈھاک بن میں

ممکن نہیں ہے دوسرا تجھ سا ہزار میں | ہوتا ہے اک بہشت کا دانہ انار میں

شرف بخشا نگہ کو صرف کرکے تو نے زیور میں | نگیں کو نام سے تیرے بٹھایا خانۂ زر میں

محبت سے بنا لیتے ہیں اپنا دوست دشمن کو | جھکاتی ہے ہماری عاجزی سرکش کی گردن کو

کام ہمت سے جواں مرد اگر لیتا ہے | سانپ کو مار کے گنجینۂ زر لیتا ہے

بے اعتبار نقش و نگار زمانہ ہے | اک رنگ پہ ہوا نہیں رہتی ہے باغ کی

خدا کی یاد جوانی میں غافلو کر لو | وگرنہ وقت فضیلت تمام ہوتا ہے

حُسن وہ شے ہے کہ پتھر میں بھی کرتا ہے اثر | چشم عاشق کی طرح آئینے حیران ہو گئے

تم فاتحہ بھی پڑھ چکے ہم دفن بھی ہوئے | بس خاک میں ملا چکے چلئے سدھاریئے

خوب روئے حال پر اپنے وطن کا سن کے حال | کوئی غربت میں جو آنکلا ہمارے شہر سے

بیوفائی کا اگر عیب نہ ہوتا تم میں | اے بتو سجدہ خدا کو نہ مسلمان کرتے

باغ جہاں میں گل کی قناعت ہے جائے رشک
عمر دو روزہ ایک قبا میں تمام کی

اسیرِ مغفور

"بعض خود نوشت حالات"

حقیقت میں دیکھو تو دنیا میں کیا نہیں ہے سب کو فنا ہے۔ اجل سر پر کھڑی ہے وقفہ کم ہے اول بھی عدم ہے آخر بھی عدم ہے۔ یہ بزم آراستہ کیا پسند آئے۔ ہمارا دل دنیا سے برخاستہ ہے زیادہ رہنے سے کیا۔ دنیا دل لگانے کے قابل نہیں ہے۔ کیسے کیسے عزیز قریب اٹھ کر گوشۂ لحد میں سو رہے ہیں جن سے دل بہلتا تھا وہ تابندہ کوکب خاک میں مل گئے۔ دورِ فلک میں جو لوگ منتظم تھے وہ پردۂ خاک میں نہاں ہو گئے۔ جو زیست میں ہمدم و ہم نوالہ تھے انہیں کا ماتم کرنا پڑا جن کے لئے پوشاکیں قطع کیں انہیں اپنے ہاتھ سے کفن پہنایا۔ شب و روز جن کے ہاتھ میں ہاتھ رہتا تھا۔ انکے تابوت کے ساتھ جانا پڑا۔ جو آٹھوں پہر پہلو میں رہتے تھے۔ ان کو تختۂ غسل پر لٹایا۔ جو زد میں ہر وقت ہم پنجہ رہتے تھے۔ ان کو گور میں لٹایا۔ سر سبز چمن غارت و پامال ہوا۔ بھرا ہوا گھر عزیزوں سے خالی ہو گیا۔ نہ وہ محفل ہے نہ وہ ساقی۔ زندگی کا مزا جاتا رہا۔ زمانے نے کیا کیا رنگ دکھائے اس سرائے میں کہیں ٹھکانا نہیں۔ جو آیا ہے اُسے ایک دن جانا ضرور ہے۔ نہ کوئی یار نہ غمگسار فقط مرگ کا انتظار ہے۔ ضعیفی میں جوانی کا مزا کہاں ہم تو رہ گئے زندگی کا مزا جاتا رہا۔ اب کچھ اپنا حال بیان کرو۔ جو سننے کے قابل ہے۔ قصبۂ امیٹھی جو آباد ہے۔ وہی میرا وطن وہی میرا مولد ہے چمن ہے لیکن خزان دیدہ رفیقان صاحب چشم رفیقان عالی ہم سب اٹھ گئے۔ جب نو۹ دس برس کا سن ہوا بخت نارسا لکھنؤ میں لایا۔ میرے جنت مقام باپ میر مدد علی تھے مصاحب وعلی شیعہ پاک و صاف اعتقاد عالی وقار بڑے فارسی دان حضرت عباس علمدار کی اولاد میں کبھی کبھی شعر کہتے تھے۔ مائل تخلص تھا میں جب قبلہ گاہی کی خدمت میں حاضر ہوا شفقت سے پڑھانے لگے۔ فارسی میں دوشن سواد ہو گیا استاد بن گیا۔ بہت سے طالب علم آنے لگے آخر فکر روزی سے کہ ہوا اور کتب خانے میں نوکر ہوا۔ وہاں خوشنویسوں کا مجمع تھا مجھکو بھی شوق پیدا ہوا۔ رفتہ رفتہ جب شاعروں سے ملاقات ہوئی شعر کہنے کا ڈھب ہو گیا۔ رنگین شاعری کی ہوس ہوئی مضامین تلاش کرنے لگا۔ دیوان جمع کر کے دیکھے پھولوں کے رنگین کلام

یاد کئے۔ بعض بعض موقع پر عربی زبان کی ضرورت پڑی فکر ہوئی اس کا بھی کچھ علاج کیجئے۔ چچا میر سید علی سے (جو علم خفی و جلی میں بہت دقاق تھے صرف و نحو میں منتخب روزگار تھے حکمت منطق میں بے مثل حدیث قرآن پر شیفتہ آپ نے جلاء العیون نظم کر کے داد سخن دی تھی۔) میرے پڑھانے میں کمال محنت کی۔ چار برس تک ان کے مدرسے میں تعلیم حاصل کی۔ زمانے نے کچھ ایسا انقلاب کیا فکر قوت میں اضطراب ہوا پڑھنے پڑھانے کی صحبت جاتی رہی۔ روزی کی فکر نے پریشان کیا۔ القصہ کچہری میں نوکری کی۔ کچھ انشا گری جانتا تھا عمر کے آٹھ برس اسی شغل میں بسر ہوئے۔

خدا کی شانِ رزاقی وہاں ایک عالم مرزا کاظم علی تھے۔ ان کی خدمت میں مشرف رہا۔ حدیقہ حکیم ثنائی پڑھا علم حاصل کیا۔ وہ کامل تھے مجھکو بھی کامل کر دیا کبھی کبھی میر قاسم علی سے پڑھ لیتا تھا۔ وہ ایک متقی عالم ہیں۔ ترکِ عادت تو بہت مشکل ہے۔ شاعری کا بھی کچھ کچھ خیال رہا۔ جابجا مشاعروں میں گیا۔ شاعروں سے صحبتیں رہیں۔ میں نے کبھی اس بات کا خیال ہی نہیں کیا کہ مجھکو شاعری میں کمال ہے۔ مگر لوگ تو تعریف کرتے ہیں۔ یہ پرچے ہم کو بھی گزرتے ہیں۔ تواریخ کی صبح شام سیر کی۔ لغت کی کتابیں پیش نظر ہیں۔ جب حضرت ثریا جاہ خاقان زماں محمد امجد علی شاہ زیب تخت و کلاہ ہوئے۔ بڑے نیک طینت معین شریعت فرشتہ خصال تھے۔ تو مدار المہام وزیر الممالک امین الدولہ عمدۃ الملک امداد حسین خان بہادر ذوالفقار جنگ وزیر ہوئے۔ خدا نے ایسا بلند قد بنایا کبھی ایک چیونٹی کو بھی نہیں ستایا صبح سے شام تک وزارت کے کام کرتے اور شام سے صبح تک عبادت میں مصروف رہتے۔

ہر گھڑی خاص و عام کی خبر تھی۔ رونق اسلام کی بڑھا یا کئے۔ روز افزوں تائید خدا رہی۔ لیکن خاکساری بدستور قائم رہی۔ ان کے بزرگ بھی بہت صاحب ثروت قوم بنگش سے فرخ آباد کے رئیس تھے۔ جب یہ پہلے پہل لکھنؤ میں آئے تو محلہ تحسین گنج میں قیام کیا۔ مکانات خریدے۔ جب وزارت ملی تو ماہِ نو سے ماہِ کامل ہو گئے۔ خاندان کا خاندان تھا۔ مرزا سکندر شکوہ کے مکانات ان کے بیٹے عباس شکوہ سے مول لئے۔

از سر نو ان سب کی تعمیر کی مکانوں کی تقدیر چمک گئی۔ "امین آباد" نام رکھا۔ اسی جگہ باغ نیداین تھا۔ وہ بھی بادشاہ نے مرحمت فرمایا۔ اس کو خوب تیار کیا اور "امداد باغ" نام رکھا عجب عشرت آباد بن گیا۔ دوکانوں سے بازار شق القمر بن گیا۔ لوگ نواب کو دعا دیتے ہیں۔ وہاں رہنے والوں کو آرام ہے۔ طبیعت میں حق پرستی کا مذاق ہے۔ بجز رونق دین اور کچھ حرص نہیں۔ ایک مجتہد ملازم ہیں

صبح و شام نمازیں ہوتی ہیں ہمیشہ للّٰہ تقسیم زر ہوتی ہے۔ مرزا حاجی کا باغ مول لیا ہے اس کے قریب درگاہ حضرت عباسؑ علمبردار بنائی ہے۔ جہاں صبح و شام مجلسیں ہوتی ہیں۔ زیارت کو خاص و عام آتے ہیں۔

میں بھی اُن کے بندوں میں ایک صاحب نیاز بندہ تھا۔ کچھ ایسا حق نہ تھا جس پر ناز کرتا۔ مجھکو محض عنایت سے میر منشی کا حکم دیا۔ بہت مسرت سے تین برس کٹے۔ کچھ حسب حال مقدرت حاصل ہوئی۔ جو عزیز قریب میرے ساتھ تھے۔ اُن کے بخت و نصیب موافق رہے۔ خدا کا شکر و سپاس ہے۔ یہ بھی قیاس و وہم سے باہر تھا۔ یہاں نہ تو حسن صورت ہے۔ نہ حسن خط ہے۔ املا بھی غلط۔ انشا بھی غلط۔ شکر کا دم مل کیوں نہ بھرے۔ خدا ہمارے محسن پر احسان کرے۔

بعد ازاں گردشِ روزگار ہوئی۔ زمانہ کا تو کچھ اعتبار نہیں ہے۔ آسمان و زمین دوسرے ہوگئے فلک نے ہمیں خانہ نشیں کر دیا۔ کیا کہوں جو دور زمانہ ہوئے تمام اقارب عدم کو روانہ ہوئے۔ میری زوجہ نے بھی انتقال کیا۔ دل کو نہایت ملال ہوا میرے سر پر اس قدر بلا پڑی کہ دنیا سے دل اٹھ گیا۔ زمانے کی سیر بہت کی الٰہی اب انجام بخیر ہو۔

میں یہاں ننگ نام رہا۔ اب آئی کی محبت میں تمام ہوں بحق مختصر دنیا سے دل بہت برخاستہ تھا۔ کسی بزم آراستہ سے کچھ کام نہ تھا۔ ناگاہ ایک شاہی خواص آیا اور مجھے دیوان خاص میں لے گیا۔ وہاں حضرت سلطانِ عالم محمد واجد علی شاہ اختر صاحب سریر رونق افروز تھے۔ یہ بادشاہ رعایا کا بہت محبوب ہے۔ خدا کو اس کی خوشی منظور ہے۔ اور ایام میں ایسے بادشاہ کہاں پایہ تخت بلند رہے چشم بد سے گزند نہ پہنچے مجھ جیسے ناچیز شخص سے خلق کیا۔ امتیازی درجے سے پاس بٹھایا۔ ایک ایسی کتاب عنایت فرمائی جو درحقیقت گلِ انتخاب تھی۔ میں نے حسب حکم اُسے نظم کیا۔ سُن کے بہت خوش ہوئے۔ مجھے بھی اُن کی خوشی سے مطلب تھا۔ فقط یہاں تک اسیر مغفور کے خود نوشت حالات تھے۔

اسیر کے دادا کا نام سید محمد علی تھا ابن مولوی سید معین الدین ابن محمد صالح کروری۔ نانا ان کے لکھنؤ کے شیخ زادے تھے۔ تدبیر الدولہ مدبر الملک مظفر علی خان بہادر بہادر جنگ دربار اختری سے خطاب ملا۔

جس زمانے میں نواب محمد سعید خاں والی رام پور لکھنؤ میں رونق افروز تھے۔ اسیر صاحب زادگان عالی شان کی تعلیم کے لئے مقرر ہوئے۔ پھر نواب یوسف علی خان بہادر فردوس مکاں

کے عہد میں گھر بیٹھے وظیفہ خوار رہے۔ پھر زمانہ سلیمان سریر آصف نشیں حاجی حرمین شریفین ہلال رکاب نواب محمد کلب علی خان بہادر میں دربار سخن فہموں سے سجایا گیا۔ اور قدر دانی کا بازار گرم ہوا۔ اسیر بھی بیش بہا تنخواہ پر بلائے گئے۔

شیخ غلام ہمدانی مصحفی کے شاگردوں میں بعد آتش کے انہیں کا مرتبہ تھا۔ ہزارہا مستفید ہوئے۔ ایک دیوان فارسی گلشن عشق اور چھ دیوان اردو میں ہیں۔ ریاض مصنف گلستان سخن دیوان اسیر عاشقانہ دیوان میں ایک دیوان غیر مطبوعہ ہے۔ ایک دیوان منقبت موسوم بہ گلدستہ امانت ہے۔ ایک کلیات قصاید اردو ایک مثنوی درۃ التاج ہے۔ جو بادشاہ کی فرمائش سے نظم کی تھی۔ ایک مثنوی میں نواب امین الدولہ وزیر لکھنؤ کے زخمی ہونے کی کیفیت لکھی ہے۔ ایک مثنوی معارج الفضایل معجزات ائمہ میں ہے ایک کتاب بازر کامل عیار شرح معیار الاشعار اور بہت سے رسائل علم عروض و قوافی کے فارسی اور اردو میں ہیں۔ رسالہ بیان اضافت رسالہ تشریح الحروف فارسی میں ہے۔ فواید منظفریہ علم نحو عربی میں ہے۔ ان میں سے بعض کتب طبع ہو چکی ہیں۔

مدت دراز تک مرثیہ اور سلام کہا کئے۔ مگر وہ دفتر غدر میں تلف ہو گیا۔ ۱۲۲۹ھ میں غازی الدین حیدر بادشاہ تخت نشین اودھ ہوئے اسی سال اسیر پیدا ہوئے۔ واجد علی شاہ کے عہد میں علی نقی خان وزیر کے ہاتھوں امین الدولہ کی دوستی میں اسیر بھی کچھ دن اسیر رہے۔

اسیر نے قدرتاً شاعرانہ طبیعت پائی تھی۔ بہت پُر گو تھے۔ ساٹھ ساٹھ ستر ستر شعر کی غزل کہا کرتے تھے۔ مصحفی اکثر کہا کرتے تھے "ایک روز یہ آخری شاگرد استادوں کی صف اوّل میں جگہ لے گا"۔

اسیر جب واجد علی شاہ کے دربار میں رفقا کے معزز عہدے پر ممتاز ہوئے خطاب حاصل کیا تنخواہ مقرر ہوئی۔ تو ہمچشموں میں اعزاز بڑھ گیا۔ شاعری چمک گئی۔ بہت سے شاگرد ہوئے۔ اسیر کی غزل گوئی کا رنگ سب سے الگ تھا۔ بہت پُر گو تھے۔ مضامین عالی نظم کرتے تھے۔ اصلاح بہت جلد دیتے تھے۔ جب انتزاع سلطنت ہوا اور بادشاہ کلکتہ تشریف لے گئے۔ تو اسیر لکھنؤ چھوڑ کے یہاں ان کے قدر دان بہت تھے۔ اکثر روسا امرا شاگرد ہوئے۔ ایک محلہ منشی گنج کے نام سے آباد کیا تھا۔ اس میں رہتے تھے۔ کشیدہ قامت۔ گورے۔ کتابی رو۔ متوسط الجثہ تھے۔ اکثر ٹخنوں تک کا کرتا پہنتے تھے۔ رشک اور اسیر میں معاصرانہ چوٹیں چلا کرتی تھیں۔ باوجود کمال کے اسیر میں خود نمائی نہ تھی۔ شاعر کی طبیعت کی افتاد کا اندازہ ان کے کلام سے ہو سکتا ہے۔ ایک شعر میں اپنی

عادت کو نظم کرتے ہیں ؎

مثل ہلال بدر ہے کب طالب خطر
وہ خود نما نہیں ہے جو صاحب کمال ہے

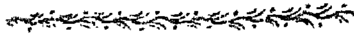
مزاج میں انکسار بہت تھا۔ اور اسی کو پسند کرتے تھے۔ ایک موقع پر نظم میں اس کا اظہار بھی کیا ہے ؎

جو افتادہ ہیں اُن کی ہر جگہ تعظیم ہوتی ہے
ہجوم خلق ہو ہر چند پر جائے سایہ خالی ہے

درحقیقت اسیر کے مزاج کی افتاد ایسی ہی واقع ہوئی تھی۔ اس میں کچھ تکلف نہ تھا۔ ہر کہہ و مہ سے بہ تواضع پیش آتے تھے علم و فضل کا غرور نہ تھا۔ آخر یہ آفتاب شاعری ۱۲۹۹ھ میں غروب ہو گیا۔ اُن کے انتقال کی ایک تاریخ خواجہ محمد یوسف صاحب یوسف نے کہی تھی جس کا مصرعہ تاریخی یہ ہے ع

ہاں مصحفی کی باقی تھی ایک یہ نشانی

غرض وہ زمانہ شاعری کے لئے بہت اچھا تھا جس میں اسیر، آتش، ناسخ وغیرہ اہل کمال پیدا ہوئے اور اپنے کمال کی قدر کے ساتھ دنیا سے اُٹھ گئے۔ اب نہ صاحب کمال ہیں نہ قدردان سخن، اہل کمال ہیں بھی۔ تو اُن کے جوہری کہاں ہیں۔ بہت سے ہیرے اب پتھروں کے ساتھ تُل رہے ہیں۔ فقط



میر برشتہ دہلوی

شعرا مر گئے مٹ گئے ان میں کوئی ملک الشعرا تھا اور کوئی خدائے سخن۔ مگر ظالم فلک کو ان کی خاک پر بھی رحم نہ آیا۔ نشان قبر کو کس بے دردی سے پامال کر رہا ہے۔ لکھنؤ میں "پیر جلیاوں" کے نام سے عنایت باغ کی پشت پر ایک محلہ مشہور ہے۔ اس میں "پیر جلیل" کوئی بزرگ سید تھے۔ جو ابتدائے اسلام میں یہاں آ گئے تھے۔ ان کا مزار ایک بلند ٹیلہ پر ہے۔ اس کے آس پاس بہت سی قبریں ہیں۔ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس پورے محلہ میں قبریں ہی قبریں تھیں اور یہ ایک پرانا تکیہ ہے۔ لوگوں نے قبروں کو مٹا کر اپنے اپنے مکان بنا لئے۔ اور بہت سی ٹوٹی پھوٹی قبریں اب بھی موجود ہیں۔ جو قبر مکان کی چار دیواری کے اندر لے لی جاتی ہے پھر اس کا نشان تک معدوم ہو جاتا ہے۔ اب بھی جو قبریں اس دستبرد سے بچ رہی ہیں ان کی حالت یہ ہے کہ محلہ کے اہیر ان پر اپلے تھاپتے ہیں۔ بہت سی غلاظت پڑی رہتی ہے۔ بعض آدھی بعض قطعاً معدوم ہو گئی ہیں۔ اس تکیہ پر میں کئی مرتبہ گیا اور نہایت افسوس کے ساتھ واپس آیا۔ قبروں کی حالت زار اور ان کی نجاست مجھ سے دیکھی نہ گئی۔ میں نے بہت چاہا کہ ان خفتگان خاک کے کچھ تاریخی حالات بھی معلوم ہوں۔ مگر کسی پر سنگ تربت نہ ملا۔

پھر میں نے خیال کیا کہ جس طرح "ناوان محل" کے مقبرے کو میونسپلٹی نے اپنی حفاظت میں لے لیا ہے اسی طرح اس قبرستان کے آثار قدیمہ کو بھی اپنی حفاظت میں لے لے تو کم سے کم مسلمانوں کے دل نہ دکھیں گے۔ اور مرحومین کی ہڈیاں نجاست میں آلودہ نہ ہونگی۔ مجھے ازحد تلاش تھی کہ اس قبرستان میں کسی مشہور آدمی یا کسی شاعر کی قبر کا پتہ ملے۔ مگر قرب و جوار کے رہنے والے جاہل لوگ کچھ نہ بتا سکے۔

ایک روز ایک بہت سن رسیدہ ضعیف الجثہ مرزا صاحب سے راہ میں نیاز حاصل ہوا۔ میں نے اس قبرستان کی بابت دریافت کیا۔ فرمانے لگے مجھے اس تکیہ کا کچھ حال معلوم نہیں ہے اتنا جانتا ہوں کہ شاہی میں میرے والد یہاں ایک قبر پر فاتحہ پڑھنے آتے تھے اور کہتے تھے کہ ہمارے بزرگ استاد میر برشتہ دہلوی کا مزار پاک ہے۔ اکثر پھول وغیرہ بھی چڑھاتے تھے۔ اور اب تو یہاں وہ بے ادبی ہوتی ہے کہ معاذ اللہ یہ جاہل لوگ بہت غلیظ پھیلاتے ہیں۔ میں نے پوچھا آپ کو میر صاحب

کی قبر بھی یاد ہے، کہنے لگے اب تو ٹکیے کی وہ صورت نہیں رہی۔ مگر میں چلکر دیکھتا ہوں شاید سمجھ میں آجائے۔ "پیر جلیل" کے مزار کے قریب ایک شکستہ قبر تھی کہنے لگے گمان غالب اسی پر ہے۔ اس ٹیلے پر چڑھنا اُترنا ان کے لئے ایک منزل سے کم نہ تھا نیچے اُتر کر قبر کی حالت پر بہت افسوس کیا۔ اور غمزدہ ہو کے پوچھا "آپ کو معلوم ہے ان کا نام کیا تھا؟" کہنے لگے، ہم نے نام تو نہیں سُنا لوگ "میر صاحب" کہتے تھے۔ پوچھا شاگرد کس کے تھے، کہنے لگے "میر تقی میر" کے شاگرد تھے۔ پوچھا آپ کو کلام یاد ہے۔ فرمایا دو ایک شعر سُنے تھے ؎

دیکھا جو اپنے در پہ پرشتہ کو یہ کہا
کیا خانماں خراب کہیں تیرا گھر نہیں

اور اسی غزل کا مطلع بھی یاد آیا ہے ؎

ہنگامہ میری آہ سے کیا چرخ پر نہیں
وہ کونسی زمیں ہے جو اشکوں سے تر نہیں

دوسری غزل کا مطلع بھی کیا خوب ہے ؎

سلگا کے دل کو عشق میں پہنچی جگر کو آگ
اے چشم تر بجھا کہ لگی سارے گھر کو آگ

ہم نے سُنا ہے کہ شاہی میں ایک بڑا مشاعرہ ہوا تھا جس میں مصحفی اور میاں مخمور بھی شریک تھے۔ میر پرشتہ کا ایک شعر بہت پہلا تھا طرح تھی "لگا کے بلبل" "آ کے بلبل" میر صاحب کا شعر ہے ؎

گوشِ گُل کے ترے نالوں نے نہ پردے کھولے
اب تو تالو سے زباں اپنی لگا لے بلبل

میاں مخمور کا بھی ایک شعر اسی طرح میں بہت مشہور ہے ؎

پھر وہی کنج قفس پھر وہی صیاد کا گھر
چار دن اور ہوا باغ کی کھا لے بلبل

پرشتہ کا صرف ایک مطلع مجھے اور یاد ہے وہ سُنائے دیتا ہوں ؎

عشق میں جی کا سہتا ضرر دیکھیا
میں اسی سوچ میں ہوں سر دیکھیا

میں نے کہا کہ میر صاحب کی کوئی اولاد تھی، کہنے لگے مجھے نہیں معلوم اتنا سنا ہے کہ "مفتی گنج" میں رہتے تھے۔ زمانہ ناموافق تھا۔ میر صاحب نازک مزاج تھے، اور باوضع تھے پوچھا، کچھ صورت شکل آپ بتا سکتے ہیں، کہا میں نے دیکھا نہیں تھا جو کچھ حال سنا تھا آپ سے کہہ دیا اور کچھ مجھے نہیں معلوم، میر برشتہ کا دیوان بعد چندے مجھے دستیاب ہوا وہ اشعار بھی موجود تھے۔ ایک غزل مطبوعہ "مجمع الاشعار" میں ملی جس کا مطلع یہ ہے ؎

جو مدرسۂ عشق میں مجنوں کا سبق تھا
سو اپنے وہ دیوان کا بر آورد ورق تھا

اور چند اشعار دیوان سے انتخاب کر کے لکھے جاتے ہیں ؎

ماجرائے چشمِ تر ہرگز نہ کچھ افشا ہوا اس قدر رویا قلم کاغذ کفِ دریا ہوا
جس قدر بدنام ہو عاشق وہ ہے نام آوری پارسائے عشق وہ ہے جو کہیں رسوا ہوا

کیا دہانِ تنگ سے کچھ غنچہ تنگ آتا رہا برگِ گل تک اس لبِ نازک سے پٹتا رہا
شکر اکر اس نے مارا ہاتھ پر میرے جو ہاتھ کیوں نہ ہاتھ اپنے ملوں دل ہاتھ سے جاتا رہا
رشتۂ تقدیر الجھا جا کے زلفِ یار سے پیچ پڑتے ہی گئے جو جو میں سلجھاتا رہا
پھر نہ کوئی کاروانِ رفتہ سے یاں آیا پھر ہر نفس مثلِ جرس میں گو کہ چلاتا رہا
اے برشتہ کس قدر تھا تیرے دل کو اضطراب
جان نکلی تن سے باہر تو بھی گھبراتا رہا

جان سے تنگ تھا دل کھو کے رونے نہ دیا دامنِ وحشت بھی یاروں نے مجھکو نہ دیا

میرے لب سے جو ہوا نالۂ بلند حلقۂ گوشِ ثریا ہو گیا

خضر سے سن کے اس کے لب کی بات منہ میں بھر لایا پانی آبِ حیات
آنے جانے پہ اس کے ہے موقوف عاشقِ خستہ کی حیات و ممات
شعر کے فن میں اسے برشتہ سمجھے نہیں معلوم کیا ہے معلومات

اتنا تو رحم کرتا مرے حال زار پر　　آتا کبھی تو فاتحہ پڑھنے مزار پر
اب اتنا تو پاس محبت ادا کر
کبھی دور سے دیکھ جایا کر

ہائے لکھنؤ کی خاک میں دہلی کے کیسے کیسے زبردست شاعر غربت نصیب ہو کر سو رہے ہیں جن کا کوئی نہ پانی دینے والا ہے نہ رونے والا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ ان مزارات کو محفوظ رکھا جاتا۔ اور ان کے کلام کو شایع کیا جاتا مگر اردو کے دلدادہ اس طرف متوجہ نہیں ہوتے اور ان گرانمایہ موتیوں کو ضایع کر رہے ہیں بعد چندے ان لوگوں کا کلام بھی میسر نہ آئیگا میر صاحب کا دیوان بہت مختصر ہے اور کوئی غزل گیارہ بارہ شعر سے زیادہ نہیں ہے لیکن کل کلام منتخب ہے اور بالکل تیر و نشتر ہے۔ افسوس ہے مجھے ان کے اور حالات نہیں ملے اور نہ کوئی دہلی میں ان لوگوں کے حالات بتا سکتا ہے۔

کم سے کم ہم گورنمنٹ سے اتنی درخواست تو ضرور کریں گے کہ "پیر جلیل" کے ٹیلے پر جو قبریں پس ماندہ ہیں ان کو اپنی حفاظت میں لے لے اور ان آثار قدیمہ کو قایم رکھے۔ قبروں کی یہ حالت دیکھ کر کہ ان پر اُپلے تھاپے جاتے ہیں، ہر مسلمان کا کلیجہ منہ کو آتا ہے ہم تو مجوسی کی قبر کے ساتھ بھی ایسا سلوک کرنا نہیں چاہتے۔ کچھ قبریں ایسی ہیں جنکو لوگوں نے اپنے مکان میں لے لیا ہے۔ لیکن غریب برشتہ کی قبر پر فلک ناہنجار کا سلوک دیکھ کر ہر آدمی کا بے اختیار رونے کو جی چاہتا ہے، تعجب نہیں کہ اس تکیے میں اور بھی شعرا کے مزار ہوں، مگر کون بتائے اور کس سے پوچھا جائے۔ کسی قبر پر تاریخ کا پتھر نہیں اور ہوگا بھی تو لوگ نکال لے گئے ہونگے، بہرحال جس قدر مستند شعرا کی قبروں کا پتہ چلتا ہے سب کا یہی حال ہے کہ نہ کہیں سنگ تاریخ ہے نہ مزار مسلم ہے شکستہ و ریختہ، ہاں صرف بیکسی اور غربت ان کی ماتم دار ہے۔

جلال مرحوم

حکیم میر ضامن علی جلالؔ لکھنؤ کے مشاہیر شعرا میں سے تھے۔ آپ کے والد حکیم سید اصغر علی خاں عہدِ نواب یوسف علی خاں والیِ ریاستِ رام پور کے یہاں داستان گوئی کے عہدے پر ممتاز تھے۔ دادا حکیم سید حسن علی خاں حکیم شفائی خاں مرحوم کے ممتاز شاگردوں میں سے تھے۔ اور شفاخانہ شاہی لکھنؤ میں بزمرۂ اطبا ملازم تھے۔ بعد وفات حکیم سید علی خاں اُن کے فرزند حکیم سید اصغر علی خاں کو شفاخانہ شاہی لکھنؤ سے تیس روپئے ماہوار پنشن ملتی تھی۔ ان کا موروثی مکان "پار"[۱] میں تھا۔

حکیم ضامن علی جلالؔ نے مدرسۂ شاہی میں تعلیم پائی عربی "میبذی" تک پڑھی اور فارسی کی کتابیں بجائے خود مطالعہ کیں۔

حکیم صاحب کو ابتدائے سِن شعور سے شاعری کا شوق تھا۔ پہلے امیر علی خاں ہلالؔ کے شاگرد ہوئے۔ جو رشکؔ مرحوم کے تلامذہ میں سے تھے۔ بعد چندے امیر علی خاں ہلالؔ نے آپ کو ہونہار دیکھ کر اپنے استاد رشکؔ مرحوم کے حوالے کیا۔ رشکؔ بھی اس وقت "پار" میں رہتے تھے۔ اور محقق شاعر تھے۔ جلالؔ ایک مدت تک اصلاح لیتے رہے۔ اس کے بعد رشکؔ بغرضِ زیارت کربلائے معلیٰ تشریف لے گئے اور وہیں قیام کیا۔ اب جلالؔ اپنا کلام بخشی الملک فتح الدولہ برقؔ کو دکھانے لگے۔

حکیم صاحب کی ولادت ۱۲۵۰ھ ہجری میں ہوئی۔ ابھی حکیم صاحب کی عمر بائیس ۲۲ برس کی تھی کہ ۱۲۷۲ھ میں غدر ہو گیا اور تمام شرفائے شہر تباہ ہو گئے حکیم صاحب اپنے والد کے پاس ریاست رام پور میں چلے گئے اور نواب یوسف علی خاں کی سرکار میں ملازم ہو گئے تھوڑے دنوں کے بعد نواب یوسف علی خاں نے انتقال فرمایا اور یہ دونوں باپ بیٹے نواب کلب علی خاں بہادر کی سرکار میں ملازم ہو گئے۔ نواب کلب علی خاں بہادر بہت عقلمند رئیس تھے اور ان کو اپنی ملکی زبان کی خدمت ملحوظ خاطر تھی۔ ان کے دربار میں اُردو کے اچھے اچھے ثقات

---

[۱] لکھنؤ میں دریائے گومتی کے پاس مشہور محلہ ہے۔ مولف

شعرا جمع ہو گئے تھے اور اس میں کچھ شک نہیں کہ اگر نواب کلب علی خاں بہادر دس برس اور زندہ رہتے تو زبان کا مرکز بجائے لکھنؤ کے رامپور قرار پاتا۔ غالب اسی دربار کے متوسل تھے۔ امیر مرحوم اسی دربار کے وظیفہ خوار تھے۔ شیخ امداد علی بحر۔ آفتاب الدولہ قلق۔ منشی محمد اسمٰعیل منیر۔ شہزادہ حیا دہلوی۔ میر یار علی "جان صاحب" آغا محمد مہدی لکھنوی۔ منشی امیر احمد امیر مینائی۔ منشی امیر اللہ تسلیم لکھنوی۔ نواب مرزا خاں داغ دہلوی۔ یہ سب لوگ اسی سرکار میں ملازم تھے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اس زمانے کی شاعری ریاست رامپور کی فیاضیوں کی توقع پر ہوتی تھی۔

رام پور میں حکیم صاحب کی بہت قدر دانی کی گئی۔ حکیم صاحب نازک مزاج بہت تھے اور ان کو اپنی شاعری پر ناز بھی تھا۔ محاورات کی حفاظت کرتے تھے۔ اور روزمرہ کے پابند تھے۔ اس وجہ سے وہ کسی کو اپنا مدِ مقابل نہ سمجھتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک مشہور شاعر سے کہنے لگے آج کل دو چار لونڈوں نے شاعری کی مٹی پلید کر رکھی ہے۔ شاعر نے پوچھا وہ کون لوگ ہیں۔ آپ نے دو چار نام گنوانے کے بعد کہا۔ اور ایک اللہ رکھے آپ ہیں۔ شاعر صاحب صورت دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ اور ادب سے کچھ نہ بولے۔

ایک مرتبہ حکیم صاحب کے اس شعر پر مولوی عبد الحق صاحب خیر آبادی کو وجد آگیا ہے ؎

حشر میں چھپ نہ سکا حسرتِ دیدار کا حال
آنکھ کمبخت سے پہچان گئے تم مجھ کو

چند مرتبہ ریاست رامپور سے مستعفی ہو کر چلے آئے مگر قدر دان نواب نے ایام معزولی کی تنخواہ بھی ادا کی اور ان کو پھر بلوا بھیجا۔ جلال مرحوم کو سو روپئے ماہوار ریاست رام پور سے ملتا تھا۔ اس کے علاوہ ہر قصیدے پر دو سو روپیہ ملتا تھا۔ عید اور بقر عید میں تو قصیدہ ضرور ہی لکھا جاتا تھا۔ اور یوں بھی کسی تقریب پر قصیدہ لکھ کر پیش کرتے تھے۔

منگرول کے نواب حسین میاں بہادر شعرا کے بہت قدر دان تھے۔ جلال کو پچیس ۲۵ روپئے ماہوار مستقل بھیجتے تھے۔ اور ہر قصیدے پر سو روپئے دیتے تھے۔ اس کے علاوہ سال میں ایک مرتبہ اپنے یہاں مشاعرہ کرتے تھے۔ اس میں جلال کو بھی طلب کرتے تھے۔ اور سو روپیہ رخصتی کا دیتے تھے۔

شاہ مرشد علی صاحب بغدادی جلال کے شاگرد تھے۔ یہ بھی ان کی مستقل خدمت کرتے تھے۔ مدراس کے نواب تجمل حسین خان ایمان بھی جلال کے شاگرد تھے اور کچھ تنخواہ بھی دیتے تھے۔ بشیر احمد خان تعلقدار شیخ آباد حکیم صاحب کے شاگرد تھے کچھ ماہوار خدمت کرتے تھے۔ حکیم صاحب کسی شاگرد کو بغیر منفعت مالی اصلاح نہیں دیتے تھے، اور کسی خط کا جواب نہیں لکھتے تھے جس میں جواب کے لئے ٹکٹ نہ رکھا ہو۔

غدر کے بعد جب حکیم صاحب لکھنؤ واپس آئے تو "یار" والا مکان مسمار ہوگیا تھا۔ اُس کا نشان تک باقی نہ تھا۔ آپ نے "منصور نگر" ۵ میں ایک مکان خرید کیا اور اس میں اپنے بیٹھنے کے واسطے ایک کمرہ بنوایا۔ اُس کمرے میں بیٹھ کر لوگوں کو اصلاح دیا کرتے تھے۔ ان کے دو فرزند تھے اور ایک لڑکی۔ بڑے فرزند "منے صاحب" تھے یہ بالکل اُمّی تھے دوسرے صاحبزادے حکیم سید محمد مہدی تھے۔ یہ شاعری میں کمال تخلص کرتے تھے اور اچھا کہتے تھے۔ اپنے باپ کے صحیح جانشین تھے۔ لیکن افسوس ہے ان کی عمر نے وفا نہ کی اور باپ کے انتقال کے چند سال بعد خود بھی راہیِ ملکِ بقا ہوئے۔ حکیم صاحب کی نازک مزاجی سے چند دربار رامپور کے شاگرد ان سے ناخوش تھے۔ اور ان کا غرور توڑنے کے واسطے ایک پوربی طالب علم "ظہیر احسن شوق نیموی" کو تیار کرکے ان کا مدِ مقابل بنایا اور حکیم صاحب کی کتابوں پر اسی سے اعتراض لکھوائے لیکن حکیم صاحب کے کمال میں کچھ فرق نہ آیا۔ اور لوگوں کی نظروں میں اُن کی وہی وقعت رہی جو ایک باکمال شخص کی ہونا چاہیے۔ حکیم صاحب سے ہم سے ملاقات تھی وہ ایک متمنع شخص ضرور تھے لیکن اس کے ساتھ ہی باکمال آدمی بھی تھے اور انصاف پسند تھے۔ اہلِ کمال سے تواضع سے پیش آتے تھے۔ اور اپنی فروگذاشت کا اقرار بھی بہت جلد کر لیتے تھے۔ اور سخن فہم کی قدر کرتے تھے۔ اُن کو اس بات پر ناز تھا کہ وہ محاورے کو صحیح نظم کرتے ہیں۔ اور وہ اس بارے میں اپنا مدِ مقابل کسی کو نہ سمجھتے تھے۔ عروض دانی میں ان کو اچھی دستگاہ حاصل تھی۔ حکیم صاحب فرماتے تھے کہ آفتاب الدولہ قلق مرحوم کے مکان پر ایک صحبت مخصوص شعرا کی ہر اتوار کو ہوا کرتی تھی۔ اُس میں ہم بھی شریک ہوتے تھے۔ سب یارانِ یکدل تھے اور ایک دوسرے کی غلطی کو بے دریغ بتا دیتا تھا۔ اور سب لوگ خوشی سے اعتراض کو قبول کرتے تھے۔ حکیم صاحب کہتے تھے۔ اس وقت شہر میں کچھ رکیک دن کی زبان مستند

۵ یہ لکھنؤ کا مشہور محلہ ہے شاہی دور میں جنت آباد تھا۔ مولف

اور معتبر ہے۔ ان میں سے ایک نواب باقر علی خان عروج اور نواب جعفر علی خان سالم رئیس "شیش محل" بھی ہیں۔ اور فرماتے تھے۔ آج کل کے شاعر معلومات زبان اردو سے خالی ہیں۔ آپ نے زبان اردو کی خدمت بہت کی ہے۔ چار دیوان تصنیف کئے۔ پہلا دیوان "شاہد شوخ طبع" دوسرا دیوان "کرشمہ گاہ سخن معروف بہ زبان حال" تیسرا دیوان "مضمون ہائے دلکش خیالات بے مثال" چوتھا دیوان "نظم نگارین جشن مقال"۔

ایک لغت تصنیف فرمایا جس کا نام "سرمایہ زبان اردو" ہے یہ لغت مبسوط محاورات اور کنایات اور امثال زبان اردو کا ہے اور الفاظ کے اصطلاحی معنی بھی لکھے ہیں۔

"قواعد المنتخب" یہ ایک مختصر رسالہ زبان ہندی الاصل کے بعض مفرد اور مرکب الفاظ کی تحقیق اور تصریف کے بیان میں بہت مفید ہے۔

"مفید الشعرا" یہ تذکیر و تانیث کا ایک مشہور رسالہ ہے۔

اس میں شک نہیں کہ حکیم صاحب کی تصنیف سے ملک کو بہت فائدہ پہنچ رہا ہے رامپور سے واپس آکر بھی جناب جلال اکثر لکھنؤ کے مشاعروں میں شریک ہوتے۔ نواب سید اصغر حسین فاخر کے یہاں ہر مہینے میں ایک مشاعرہ ہوا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ طرح تھی ؎

"فاخر جا سے گھر پہ وہ آکر پلٹ گئے"

حکیم صاحب کے ایک شعر نے مشاعرہ لوٹ لیا تھا ؎

لو امتحان تم مرے نالوں کا شوق سے
کیوں ڈر کے آسمان کے نیچے سے ہٹ گئے

"دمے" کا دورہ آپ کو سرما میں اکثر اٹھا کرتا تھا اور بہت طوالت پکڑتا تھا جس سے آپ کو بہت تکلیف ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ دورے کی شدت تھی منگل کے دن ان کے فرزند "اکبر حسین صاحب" نے پوچھا کچھ خط ڈاک میں ڈالنے کے ہوں تو مجھے دے دیجئے میں ڈال آؤں وہ اکثر خط لیکر ڈاک میں ڈال آتے تھے۔ آپ نے کچھ ایسے لفظوں میں جواب دیا جو ان کی سمجھ میں نہ آیا۔ سمجھے شاید خط دینگے۔ کچھ دیر تک ٹھہرے رہے پھر کہا خط دیدیجئے۔ کچھ جواب نہ ملا۔ پاس جاکر دیکھا حکیم صاحب کا نزع کا عالم تھا۔ سانس زور زور سے چل رہی تھی۔ یہ ان کو پکڑ کر کمرے سے گھر کے اندر لے گئے اور اپنی بہن کو خبر بھجوا دی۔

۱۹۔ اکتوبر سنہ ۱۹۰۹ء بروز سہ شنبہ بوقت ۱۲ بجے شب ستتر (۷۷) برس کی عمر میں حکیم صاحب

نے انتقال فرمایا۔ اور کربلائے "تال کٹورہ" لکھنؤ میں دفن ہوئے۔

انتخاب کلام

جس نے کچھ احساں کیا اک بوجھ ہم پر رکھ دیا
سر سے تنکا کیا اتارا سر پہ چھپر رکھ دیا

مٹا دو خود اگر تقدیر کا لکھا مٹانا ہے
مجھے شرمندہ کیوں کرتے ہو میری جبہ سائی کا

بت ہی بت کعبے میں ہم کو پہلے آتے تھے نظر
اب نہیں کوئی رہے نام اے جلال اللہ کا

دل بیتاب کے پہلو سے جاتے ہی گیا سب کچھ
نہ پائیں سینے میں آہیں نہ آنسوں میں اثر پایا
اچھالا رات کو یوں اضطراب دل نے سوتے میں
کہ بستر پیٹھ کے نیچے نہ تکیہ زیر سر پایا
حبیب اپنا اگر دیکھا تو داغ عشق کو دیکھا
طبیب اپنا اگر پایا تو اک درد جگر پایا

ساتھ کس کا کوئی دیتا ہے پریشانی میں
رنگ گلشن میں کبھی ہمسفر بو نہ ہوا

خدا کے سامنے ہم سے بتوں نے کیں نہ چار آنکھیں
وہیں شرما گئے آخر جہاں بیباک ہونا تھا

وہ کافر بھی مرے تابوت کے ہمراہ ہو لیتا
کوئی کہدے کہ جاتا ہے جنازہ اک مسلماں کا
کسی کی انجمن میں ہم کو جانا بھی چھپانا بھی
ادھر تو داغ سودا کا ادھر چاک گریباں کا

فرقت میں درد ایک مرا ہمنشیں رہا
اٹھا بھی کھڑا ہوا تو یہیں کا یہیں رہا
اٹھ کے جو بزم یار سے تنہا ہم آئے گھر
طاقت کہیں، حواس کہیں، دل کہیں رہا

مشغلہ ہے یہی اک شہر دل سودائی کا
ڈھونڈھنا سینے میں پہلو مری رسوائی کا

کل تو دل پس پس گیا اتنا ہجوم غم ہوا
یاد ہے زیر فلک ایسا بھی مجمع کم ہوا

سمجھ کے عشق میں لو امتحان بخت جلال
تم اور حوصلہ تقدیر آزمائی کا

وہ پھر کے آپ تو آتا اگر جواب نہ تھا
پیامبر تھا الٰہی مرا شباب نہ تھا

پڑ گئے آبلے ہم پھوٹ پھوٹ کر رو دیئے
کسی کا چھیڑ کے کچھ پوچھنا بھی نشتر تھا

نہ آنکھ دیکھ سکی جب وہ بے نقاب ہوا
تحیرِ نگہِ شوق خود حجاب ہوا

اسیر کر کے ہمیں کیوں رہا کیا صیاد
وہ ہم صفیر بھی چھوٹے وہ باغ بھی نہ ملا

عدو کو رنج نہ تم سے نہ آسماں سے بلا
تمہیں کہو یہ مقدر اسے کہاں سے ملا

جانِ عاشق کی کسی نے کوئی رسوا ہو گیا
تم نے مارا نام بیچارے قضا کا ہو گیا

اٹھا دیا جو خراباتیوں نے محفل سے
خدا گواہ ہے اس تہ میں تارکِ شراب نہ تھا

طلب کرتی ہے اس کی ہر ادا دل
کہاں سے لاؤں اتنے یا خدا دل

بانکپن تیرا کسی اور ستمگر میں نہیں
تجھ میں جو لوچ ہے قاتل ترے خنجر میں نہیں

نہ آہ مجھ سے نہ نالے ہی ساز کرتے ہیں
وہ تنگِ عشق ہوں سب احتراز کرتے ہیں

حجاب حسن دل کی شکایت تھی کہ قابو میں نہیں
اب تنہا پاہوں اکیلا وہ بھی پہلو میں نہیں

عشق کی چوٹ کا کچھ دل میں اثر ہو تو سہی
درد کم ہو کہ زیادہ ہو مگر ہو تو سہی
یا ہمیں کھینچ بلائیں گے انہیں یا وہ ہمیں
کششِ عشق ادھر خواہ ادھر ہو تو سہی
کیوں نہ کاٹ وصل کی شب بھی انہیں یاد رہیں
شام سے صبح یہی دیکھئے کہ سحر ہو تو سہی
آتے ہیں دیکھ کر لاکر ہیں چھپیں مرے آنسو
آنکھ تجھ سے اگر خشک ہے تر ہو تو سہی

ایک ہی شوخی خدا نے دی ہے حسن و عشق کو
فرق بس اتنا کہ وہ آنکھوں میں ہے یہ دل میں ہے

لو بلائیں لیتے ہیں ہم دیدۂ مشتاق
اب دیکھیں تو آ جاتے ہو تم دل میں کدھر سے

ایسی کچھ پیارے تصور نے دکھا دی ہے خیال
خود لپٹے آغوش ہیں کھینچ یا تری تصویر نے

کرشمے تم نے خدائی کے سب دکھا دئیے بت
بس ایک بندہ نوازی کی شان باقی ہے

محبت دیتی ہے جو درد عاشق کو وہ روز افزوں | جگر میں پھانس چبھتی ہے تو بڑھکر تیر ہوتی ہے

دوائی وصل کے خواہاں نہیں ہم تجھ سے فلک | چار دن وہ بھی بہت جلد گذرنے والے

ملو نہ تم تو یہی لطف گاہ گاہ ملے | کہ ہم سے آنکھ ملے دل ملے نگاہ ملے

پکارا اٹھنے سے دعوے عشق کا ثابت نہیں ہوتا | مری اک چپ ہے بڑھکر سو گواہوں کی گواہی سے

مری آنکھیں تری صورت کو ترسیں | نگاہ ہے مجھکو صورت آفریں سے
مرا خط دے کے کہنا اُن سے قاصد | کہ پڑھ لو اس کو تم کچھ تو کہیں سے

دل سے اُلفت میں بہت حسرت و ارماں نکلے | اور جو رہ گئے وہ جان کے خواہاں نکلے

تڑپنے دو مجھے یا امتحانِ صبر ہی لو | کہ ایک شخص سے بس ایک کام ہوتا ہے

وہ توبہ جس کے ہاتھوں سیکڑوں جام و سبو ٹوٹے | ابھی تو ٹوٹ جاتی ہے کہیں مے کی جو بو چھوٹے

شروع عشق ہی ہیں ہیں دل و جگر بیتاب | ابھی سے حال یہ ہے اپنے ساتھ والوں کا

ہم تھوڑے سے جرم پہ بھی شرمائے ہیں کیا کیا | اک جرعہ مے پی کے عرق آئے ہیں کیا کیا

نالے دلیل درد ہیں حاصل بیاں سے کیا | دل تو پکارتا ہے کہوں میں زباں سے کیا

نشانِ بخت سے پوچھا جو خوش نصیبوں کا | تو اس نے نام بتایا مجھے رقیبوں کا

جلال عہد جوانی ہے دو گئے دل سو بار | ابھی کی توبہ نہیں اعتبار کے قابل

کس سے درد اپنا کہیں کون ہے غمخوار نہیں | ایک دل وہ بھی اُنہیں کے ہے طرفدار نہیں

تم سے خوش چشم تو دیکھے نہیں انسانوں میں | پتلیاں ہیں کہ پری زاد پری خانوں میں

بزم مے میں تماشے ہوتے ہیں | جام ہنستے ہیں شیشے روتے ہیں

میلا ہے بیکسی دفن جلال اپنی لحد پہ ۔ تابوت کے ساتھ آئے ہیں ارمان ہزار دل

کوئی یہ پوچھ دے دردِ نہاں سے ۔ تجھے دل ڈھونڈھ لایا ہے کہاں سے

دیر میں بھی مثلِ مسجد رائیگاں اوقات کی ۔ کچھ خدا نے ہم کو پوچھا کچھ بتوں نے بات کی

شمع ہے ہر استخواں پوچھو نہ حالِ سوزِ غم ۔ سو زبانیں ہیں مگر فرصت نہیں اک آہ کی

نجات ہوگئی ناصح سے عمر بھر کے لئے ۔ اسی کو بھیجیے یار کی خبر کے لئے

ہمیں وہ نامہ بر لا جواب لاتا ہے ۔ تجھے وہاں سے جو تیرِ خطا ملتا ہے

جب سینہ چاک چاک ہو دل بھی تپاں رہے ۔ پھر آرزو کسی کی الٰہی کہاں رہے

دل کی کیا کیا شبِ فرقت میں مدارات نہ کی ۔ تا سحر رونے کو مانا مگر اک بات نہ کی
شاد ہو ہو کے کہا تا ہوں کلیجہ اپنا ۔ غم بھی کیا یاد کرے گا کہ مدارات نہ کی
کوچۂ یار میں دل جا کے ہمیں بھول گیا ۔ پھر مدت سے کبھی آ کے ملاقات نہ کی
سننے میں آئی تھی مستانہ گھٹا بستی پر ۔ خبر اس کی ہمیں یارانِ خرابات نہ کی

کاش خود ہی اُسے منظور رُلانا ہو جائے ۔ دل بھر آتا ہے رونے کے بہانا ہو جائے
دل تمہیں دینگے جب آئیں یہ صفت ہوئیگی ۔ کبھی آئینہ بنا لو کبھی شانا ہو جائے

واہ رے تاثیر میری بے اثر فریاد کی ۔ ہو گئے فولاد تیرے کے زمیں فولاد کی

تیوری جو اُس کی چڑھ گئی عاشق پہ آبنی ۔ ہنسکر ادا بنی تو بگڑ کر غضب بنی

اک رات دل جلوں کو یہ عیشِ وصال دے ۔ پھر چاہے آسمان جہنم میں ڈال دے
قاتل سے ہم جو روٹھ چلے یہ نہ ہو سکا ۔ شمشیر ہاتھ دو دے کے گردن میں ڈال دے

دل کو دیتے ہیں دعا روتے ہیں گردوں اے ۔ جس مصیبت میں ہمیں چاہے یہ دشمن ڈالے

کیا کیا وفائیں کسا کی ہیں ذرا یاد کیجیے ۔ کچھ سوچ کر غلام کو آزاد کیجیے

غیر کرتا ہے جبیں سائی قدم پر یار کے
دیکھ لینا آج ماتھے جا لگی دو چار کے

غم و اندوہ جب آتا ہے دل خوش ہو کے کہتا ہے
مرا سرمایۂ عیش و نشاط زندگی آیا

کہتی ہے قضا کشتہ ہیں اس کی ادا کا
کیا سیر ہے لیتی ہے ادا نام قضا کا

اس شوخ نے خلوت میں طلب ہم کو کیا ہے
ٹل جائے جو دم بھر کو تو احسان حیا کا

دیکھو اچھا نہیں نظروں سے گرانا دل کا
دونوں عالم میں رہیگا نہ ٹھکانا دل کا

بیخودی ہے وصل میں بہتر کہ خلوتخانہ ہے
ہوش کو کیا دخل کیوں آتا ہے کچھ دیوانہ ہے

لاکھ یہ آسمان جھگڑے جلال
چھوٹتا کب ہے لکھنؤ مجھ سے

جب اسے لکھتے ہیں خط دیکھیے قسمت کا بگاڑ
آپ ہی آپ وہ تحریر بگڑ جاتی ہے

غیر کو شانہ کش گیسوئے جاناں دیکھا
رات کو ہم نے عجب خواب پریشاں دیکھا

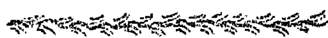
پیش آئیے کبھی تو محبت کی راہ سے
شکوے کرے نگاہ ہی ملکر نگاہ سے

یونہیں تقدیر نکالے کبھی حسرت دل کی
آپ سنتے ہوں میں کرتا ہوں شکایت دل کی

وصل کے سب لطف شکوے کھو چکے
ہم پشیماں آپ نادم ہو چکے

شب وصال یہ اندھیر کیا کیا میں نے
کہ اس کو دیکھتے تھے آسماں نکل آیا

جلال داغ بھی اس نے اگر دیئے ہم کو
فلک چلا یہ سمجھ کر کہ مہر و ماہ دئیے



مرزا بہادر جگر

مرزا محمد عباس علی خاں نام جگر تخلص خلف مرزا محمد آغا علی خاں ناظم صوبہ اودھ مرحوم رئیس لکھنؤ آپ کی ولادت سنہ ۱۸۵۰ء میں ہوئی ۱۸۷۵ء میں آپ ذاتی قابلیت اور اپنے موروثی حقوق کے سبب سے "سول سروس" کا امتحان پاس کرکے فیض آباد کے اسسٹنٹ کمشنر مقرر ہوئے مرزا صاحب کی عمر اس وقت پچیس برس کی تھی۔ پانچ برس کے بعد آپ کا تبادلہ ضلع ہردوئی کو ہوگیا۔ اور بضرورت انتظام خانگی تھوڑے سال کے بعد آپ نے سرکاری عہدے سے سبکدوشی حاصل کرکے لکھنؤ کی سکونت اختیار کی۔ مرزا صاحب نہایت نیک مزاج خیر آدمی تھے۔ سرکاری ملازمت کے زمانے میں بھی آپ نے ہندوستانی وضع رکھی۔ انگریزی، فارسی، عربی بقدر ضرورت جانتے تھے۔ اور سیاق وسباق میں ماہر تھے۔ شاعری کا شوق طبیعت میں ابتدائے سن شعور سے تھا باوجود اس کے شاعری کا دعویٰ نہ تھا۔ حافظہ ایسا صحیح تھا کہ سیکڑوں شعر اردو فارسی کے یاد تھے اشعر کے حسن وقبح پر بہت جلد نظر دوڑ جاتی تھی۔ انہماک کتب بینی سے آخر عمر میں آپ کی بصارت کم ہوگئی تھی۔ مگر مذاق شاعری عروج پر تھا۔ دیوان مکمل ہوگیا تھا۔ مرض سلس البول میں مبتلا تھے۔ ایک مرتبہ ایسے سخت بیمار ہوئے اور مرض نے ایسی طوالت کھینچی کہ کسی طرح افاقہ نہ ہوا۔ چار برس تک اشتداد مرض میں مبتلا رہے۔ دو مرتبہ نشتر لگایا گیا۔ آخر ۱۷ مئی سنہ ۱۹۱۱ء کی نصف شب کو انتقال فرمایا۔ اور موافق وصیت کے لاش کربلائے معلی بھیجی گئی۔ اس میں شک نہیں کہ مرزا صاحب کی ذات سے سارے لکھنؤ میں بہت مغتنم تھی۔ آپ کی فیاضیاں زبان زد خاص و عام ہیں اور آپ کے خاندان میں فیاضیاں موجود ہیں۔

انتخاب کلام

نہ مسرت ہمیں اچھی نہ ملال اچھا ہے — آپ راضی رہیں جس میں وہی حال اچھا ہو
ہمنشیں وہ اگر آتے ہیں تو آنے دینا — یہ نہ کہنا کہیں للہ کہ حال اچھا ہو

---

۵ یہ موروثی خطاب ہے — مولف

آپ کو حضرتِ زاہد ہے عبث رنجِ شباب
آپ کے حق میں جوانی کا زوال اچھا ہو
غیر کے کہنے پہ اچھا نہ سمجھنا مجھ کو
تم چلے آؤ تو بیشک مرا حال اچھا ہو

مانگ جو مانگنا ہے خالقِ اکبر سے جگر
سارے عالم میں اسی سے تو سوال اچھا ہو

نتیجہ زندگانی کا ہے کچھ دنیا میں کر جانا
خیالِ موت بیجا ہے وہ جب آئے تو مر جانا
کریں ہم آہ کس دل سے نزاکت منع کرتی ہے
کہیں آنکھوں سے بہہ کر دیکھیں ہی کا شانہ اتر جانا
عیادت کو وہ کیا آتے ہیں گویا دل جلاتے ہیں
نہ کچھ کہنا نہ کچھ سننا ادھر آنا ادھر جانا
مہِ کامل کو اب کی ماہ میں ہم کو چھپانا ہے
ضرورت تو نہیں لیکن ذرا تم بھی سنور جانا
بڑی مشکل سے اتنا قرب تجھ سے آج حاصل ہے
ہمارے نزع میں ظالم کہیں جلدی نہ کر جانا

کہیں کیونکر بتاؤ تو دکھائیں حالِ دل کس کو
وہ اتنی دور ہیں ہم سے کہ مشکل ہے نظر جانا

یاد آتا ہے مجھے جب تو ہنسی آتی ہے
دیکھ کر آئینہ اُس شوخ کا حیراں ہونا

لپٹی جاتی ہے مری روح لحد سے میری
ہاتھ کا ان کے جو مرقد پہ نشاں دیکھا ہے
چشمِ حیرت سے تو اک دیکھ رہا ہے تم کو
یہ نیا طرزِ ستم اُس نے کہاں دیکھا ہے

کہدو تمہیں کہ لائقِ تیرِ نظر ہے کون
مدت سے یہ پیوست ہے قلب و جگر میں ہے
سب جانتا ہوں میں مجھے غافل نہ جانئے
ہر ایک بات آپ کی میری نظر میں ہے
احباب یاد ہیں... نہ تو یہ رہا ہمارا ساتھ
اپنا بھی کوچ اب یہی شام و سحر میں ہے
کہتے ہیں اپنے ہاتھ سے کاٹو تم اپنا سر
گویا کہ اُن کی تیغ ہماری کمر میں ہے

کیونکر اٹھائیں آپ کی نازک مزاجیاں
طاقت نہ دل میں ہے نہ ہمارے جگر میں ہے

تمام حالت پہ پیری کی زندگی تو نے تو کیا — کچھ تو کر ایسا کہ عالم بھر میں افسانہ رہے
اب رنگ نہ پلٹنے نے وہ بدلا ہے کہ بس ہیں — سائل کے لئے دستِ توانگر نہ اٹھے

زمانہ دولتِ دنیا انہیں کو دیتا ہے — کہ جن کا نام بھی وقتِ سحر نہیں لیتے

ساری دنیا ہے تری سارا زمانہ تیرا — جس کو سنتا ہوں وہ کہتا ہے فسانہ تیرا
جس ستم کی تھی نہ امید وہی تو نے کیا — نزع کا حال مرا اور نہ آنا تیرا

دل توڑ توڑ کر مرے کہتے ہیں بار بار — جیسا تھا اس سے ہم اسے بہتر بنائیں گے
اغیار کیا سنیں گے ترے حال پہ جگر — جو خود بنے ہیں وہ تجھے کیوں کر بنائیں گے

لو خدا حافظ وہاں جاتے ہیں اب — جس جگہ جا کر کوئی آتا نہیں

سحر بھی ہو گئی دل بھی ٹھہر آیا — جگر اٹھے نہیں یہ بات کیا ہے

دامن بچا کے خون سے کر قتل بے وفا — دھبا اگر لگا تو چھڑایا نہ جائے گا
بالیں پہ ہے وہ رشکِ قمر دیکھ لے جگر — پھر آئے گا وہ وقت کہ دیکھا نہ جائے گا

وصل پر اس کے کمال جو اشارا ہو جائے — تیرے بیمار کو جینے کا سہارا ہو جائے

ان کا ملنا اک خیالِ خام ہے — کیوں تڑپتا ہے دلِ ناکام ہے
[illegible] ستم ہے — ان کی الفت موت کا پیغام ہے

جناب رشید لکھنوی

سید محمد مصطفٰے مرزا عرف پیارے صاحب رشید مرثیہ گو سید احمد مرزا صاحب صابر مرحوم کے صاحبزادے ہیں بچپن سے لوگ آپ کو پیارے صاحب پیارے صاحب کہتے تھے۔ آخر وہی نام ہو گیا

صابر مرحوم کی شاعری نے تو اس قدر شہرت نہیں حاصل کی لیکن رشید کے عم بزرگ سید حسین مرزا صاحب عشق نامی مرثیہ گو تھے۔ وقعت فن کے لحاظ سے ابتدائی تعلیم کے بعد رشید صاحب نے انہیں کی شاگردی اختیار کی۔ آپ کے دوسرے چچا سید مرزا صاحب تعشق بھی اچھے شاعر تھے اور تغزل کا رنگ ان کے کلام میں اچھا تھا۔ رشید صاحب نے دو استادوں کی نگرانی میں فن شاعری حاصل کیا۔

ان کے والد سید احمد مرزا صاحب صابر میر ببر علی صاحب انیس مرحوم کے نواسے تھے اس لحاظ سے جناب رشید کو اپنے نانا کے رنگ شاعری پر ناز تھا۔ مگر تعلیم کا اثر زیادہ ہوتا ہے اس لئے کہہ سکتے ہیں۔ کہ جناب رشید کی مرثیہ گوئی نے آخر عشق کی شاعری کا رنگ اختیار کیا۔ عشق اور انیس کی شاعری میں وہی فرق ہے جو انیس و دبیر کی شاعری میں ہے عشق مرحوم کی شاعری میں تحقیق الفاظ اور صحت روایات کا بہت خیال ہے۔ لیکن کسی قدر روکھا پھیکا ہو اسی وجہ سے ان کے کلام نے اتنی شہرت نہیں حاصل کی۔ جناب رشید تعلیم فارسی سے فارغ ہوتے ہی شاعری کے زمرے میں داخل ہو گئے۔ ان کا رنگ تغزل بہت اچھا تھا۔ اکثر رؤسا اور امرا کے مشاعروں میں بھی آپ شریک ہوا کئے ہیں۔

عشق و تعشق کے بعد رشید کی شاعری نے شہرت حاصل کی۔ غزل کی مشق بہت بڑھی ہوئی تھی۔ اس لئے جب آپ نے مرثیہ گوئی میں قدم رکھا تو اس میں بھی غزل کا رنگ غالب رہا۔ رفتہ رفتہ آپ مرثیے میں بہاریہ مضمون لکھنے لگے اور یہ روش آپ کی سب کو پسند آئی۔

جناب رشید کے مرثیے میں ساقی نامے کا رنگ بہت چوکھا رہتا ہے جس میں آپ نے ظہوری کا رنگ اختیار کیا ہے۔ ابتدا میں آپ مرثیے بہت شگفتہ کہتے تھے۔ رفتہ رفتہ

حیدرآباد میں نواب بہرام الدولہ بہادر کے کانوں تک آپ کی مرثیہ گوئی کی خبر پہنچی تو انھوں نے اپنی مجلس کے لیے انھیں کو تجویز کیا۔ نواب بہرام الدولہ کے یہاں اکیس محرم سے تیس محرم تک مجلسیں بہت عظیم الشان ہوتی ہیں جن میں اکثر حضور نظام حیدرآباد بھی رونق افروز ہوتے ہیں نواب بہرام الدولہ جناب رشید کی بہت عزت کرتے ہیں اور بعد اختتام مجلس ایک ہزار پانچسو روپے بھی نذر کرتے ہیں۔

پہلی ربیع الاول سے آٹھویں ربیع الاول تک آپ کلکتے میں سفیر ایران کے یہاں مجلسیں پڑھتے ہیں۔

لکھنؤ میں آنوجی کی مسجد میں ایک مرثیہ پڑھتے ہیں جس میں کثرت سے لوگ شریک ہوتے ہیں اور لطف شاعری آتا ہے تخمیناً دس بارہ برس سے آپ مجلس خوانی کرتے ہیں۔

مرثیے کی بعض ٹیپیں اور بعض بند آپ نے ایسے لکھے ہیں جو لوگوں کی زبانوں پر رہ گئے ہیں۔ سلام کے بعض شعر، رباعیاں پیری کی حالت پر ایسی لکھی ہیں جن کی اساتذہ حال نے داد دی ہے۔

ایک سلام کا شعر جس میں پیری کی حالت کو نئے عنوان سے دکھایا ہے ؎

غرور اب کیا بڑھے گا خم ہوئے اس درجہ پیری سے
ہم اپنے سر کو اپنے پاؤں سے ٹھوکر لگاتے ہیں

ایک غزل پر سلام لکھا ہے ؎

کیا ہے کہ خاک تربت سرور بنائیں گے — دل اور ایک دل کے برابر بنائیں گے
کرتے ہیں جمع اشک کے پارے یہ لاکھ ہم — حوروں کے کان کیلئے گوہر بنائیں گے
حداد روتے جاتے ہیں لوہا کیا ہے نرم — قتل حسینؑ کے لئے خنجر بنائیں گے
شہ دامن ردا سے بنا کر یہ دیں گے ڈھال — اپنا کفن مزار کی چادر بنائیں گے
ٹوٹے ہیں دل غریبوں کے پانی نہیں ملا — یہ جام بیٹھ کر لب کوثر بنائیں گے
[illegible] کے حسن کو خلق پہ [illegible] کرو نگار — اک قصر خاندان پیمبر بنائیں گے
[illegible] اشک بہا لیں گے — شبیر اپنے سر کو لشکر بنائیں گے
کہتی تھی ذوالفقار [illegible] یہ شعر — شبیر تجھ سے [illegible] بنائیں گے
مضمون [illegible] ہزار دل ہم ایسے رشید — [illegible] بنائیں گے

شاہی میں رشید کی عمر دس برس کی ہوگی اور اس وقت آپ کا سن پینسٹھ برس کا ہے۔ آپ بدن کے دبلے اور نہایت ضعیف الجثہ ہیں۔ فرماتے ہیں "اس قدر ضعیف ہوں اکثر چلتے میں گر گر پڑتا ہوں"

تواضع اور انکساری میں آپ کا نمبر سب سے بڑھا ہوا ہے۔ مگر وہی شاعرانہ لطافت کا پہلو لئے ہوئے۔ آپ کی بات بات سے شاعری ٹپکتی ہے۔

یہ تو آپ اکثر کہا کرتے ہیں کہ "سب اچھے ہیں میں بُرا ہوں" لیکن اس کو کوئی یقین نہیں کر سکتا۔ اسی طرح آپ کے انکسار کا ایک خاص رنگ ہے جس میں شاعری کا ایک جزو ملا ہوا ہے۔

بہرحال لکھنؤ کا رنگ تصنع ابھی تک زندہ ہے اور مشرقی تہذیب کے لوگ اس کو برتنے پر مجبور ہیں۔ لباس اور پوشاک میں بھی خاص امتیاز رہتا ہے۔ بات چیت میں تکلف۔

سچ بات تو یہ ہے کہ اس مٹنے پر بھی لکھنؤ کی لطافت غنیمت ہے۔

انتخاب کلام

رُباعیات

پیری میں خمیدہ کر دیا ہے تو نے — ظالم کیا ستم کیا ہے تو نے
سیدھا ہونے دے ابتو اے پیر فلک — اپنا سا مجھے بنا لیا ہے تو نے

کیا بات ہے کس خوف سے تھراتا ہوں — کچھ قوت و طاقت میں کمی پاتا ہوں
پیری تو جوانی سے گرانقدر نہیں — کیا بوجھ پڑا ہے کہ جھکا جاتا ہوں

پیری نے جھکایا ہے سفر کرتا ہوں — سب اہل زمیں کو یہ خبر کرتا ہوں
عالم کو جو خوب دیکھنا ہے منظور — ذرّے ذرّے پہ میں نظر کرتا ہوں

ہے ضعف کہ دشوار تکلم ہے اب — جیسا اک برق کا تبسم ہے اب

پیہم دیتی ہے فوجِ پیری شکست   دانتوں کی صفوں میں بھی تلاطم ہے اب

دوں گا میں دعائیں اگر پاؤں گا   کچھ دن ابھی دنیا کی ہوا کھاؤں گا
اتنا نہ جھکا کہ گر پڑوں اے پیری   اب چھوڑ مجھے خاک میں ملجاؤں گا

وہ تیز زبانی وہ خوش بیانی نہ رہی   کیفیتِ باغِ زندگانی نہ رہی
دیکھا بھی نہ ہم نے خوابِ غفلت میں تھے   اب آنکھ کھلی کہ جب جوانی نہ رہی

افسوس امیدِ زندگانی بھی نہیں   طفلی نہیں، پیری و جوانی بھی نہیں
رخصت ہوئی روح ساتھ چھوڑا سب نے   وہ وقت آیا کہ ناتوانی بھی نہیں

طفلی میں جو تھا وہ دل ہمارا نہ رہا   بعد اس کے شباب کا سہارا نہ رہا
فصلِ پیری میں دانت سب ٹوٹ گئے   آئی جو سحر تو کوئی تارا نہ رہا

سن لیجیے شباب کی کہانی مجھ سے   کچھ اس کی ہوئی نہ قدردانی مجھ سے
میں پیر ہوا سخن ہوا میرا جوان   لی میرے کمال نے جوانی مجھ سے

اب تو ہے تلاشِ یارِ جانی مجھ کو   ہے یاد اب تک وہ مہربانی مجھ کو
میں تو طفلی سے کھیلتا پھرتا تھا   اور ڈھونڈتی پھرتی تھی جوانی مجھ کو

ہیں یاد وہ دن نظر میں وہ راتیں ہیں   کچھ ان کا مرے پاس بھی سوغاتیں ہیں
ترجیح ہیں کہنہ سارے بیاں کرکے رشید   کہدوں کا جوانی کی یہ سب باتیں ہیں

بالوں کی سیاہی، آہ، سیہ رات گئی   کہتے ہیں جوانی جسے وہ رات گئی
پیری نے زباں کی فصاحت کھو دی   لو صبح ہوئی، رات گئی، بات گئی

مدّت سے جدائی کا الم باقی ہے
اک عمر سے یہ نشانِ غم باقی ہے
یوں جھک سا گئے جوانی سے ملاوقتِ وداع
جب سے اب تک کمر میں خم باقی ہے

سو رنج میں روز کم سے کم کھاتا ہوں
جو کوئی نہ کھا سکے، وہ غم کھاتا ہوں
پیری کی طرف دیکھ کے آتی ہے شرم
جب اپنی جوانی کی قسم کھاتا ہوں

کیوں کنجِ لحد کے متصل جاؤں گا
کہنے کے لئے مطلبِ دل جاؤں گا
پیری سے بنوں گا منکسر اور رشید
جھکتے جھکتے زمیں سے مل جاؤں گا

پیری سے رہا نہ کوئی چارا ہم کو
قوت کا قوا کے تھا سہارا ہم کو
تنہا موت آ کے کیا بنا لیتی رشید
پیری نے شریک ہو کے مارا ہم کو

پیری سے ہوئے ہیں سفری کی صورت
اٹھتے ہیں تو دردِ جگری کی صورت
ہم بیٹھتے ہیں غبارِ خاطر کی طرح
چلتے ہیں نسیمِ سحری کی صورت

کب کوئی بلا نگاہ بانی سے رکی
اک لحظہ نہ موت زندگانی سے رکی
پیری کا نام گو ضعیفی ہے رشید
پر ایسی قوی ہے نہ جوانی سے رکی

اس دہر سے سب برے بھلے جائینگے
کیا خلق سے جز گناہ لے جائینگے
پیری سے ہیں خم حشر میں دیکھیگا کون
جنت میں جھکے جھکے چلے جائینگے

ہر چند بہت ملول و دلگیر ہوں میں
کیا فائدہ کیوں بیاں کروں پیر ہوں میں
دیکھو مجھے، پوچھنے سے حاصل کیا ہے
پیری وہ ہے جس کی تصویر ہوں میں

پیری سے ہیں خم راہ چناں کیونکر لیں
اک عمر پھرے ہیں دم ذرا، دم بھر لیں

سوتے ہیں لحد میں لیے فرشتو نہ اٹھاؤ
چلتے ہیں ذرا کمر تو سیدھی کر لیں

افسوس جوانی کی نہ کچھ قدر ہوئی
ہوتی تھی جو کیفیت بہر طور ہوئی
دانتوں نے کیا قصد جدا ہونے کا
آنکھوں کی بھی مجھ سے نظر اور ہوئی

دل کو طرفِ عجز موصوف کیا
ایسا سوئے انکسار مصروف کیا
اپنا بھی مقابلہ نہیں کرتا میں
اب آئینہ دیکھنا بھی موقوف کیا

پیری میں رشید یہ بد آئینی ہے
بالوں میں خضاب طرفہ رنگینی ہے
آئینہ بھی دیکھتے ہو ماشاءاللہ
اب تک تمہیں خیال خود بینی ہے

انتخاب غزلیات

شب ہے جب تم کو کہاں ٹوٹتے تھے تارے راتکو
دم بدم آنسو ٹپکتے تھے ہمارے رات کو
کہیں وہ لب وصل باتیں بڑھ گیا پھر شوق وصل
ہیں وہی ان نکلے تھے جو ارمان سارے رات کو
دل جگر لینے پھر آئے صبح کو کہتے ہوئے
رہ گئے بستر پہ دو موتی ہمارے رات کو
آپ نے پوچھا نہ جان و دل جگر نے لی خبر
درد فرقت میں نہ کس کس کو پکارے رات کو
آپ آرائش بھی کرتے ہیں موافق وقت کے
دن کو منھ دھویا گیا گیسو سنوارے رات کو
ڈھونڈتے پھرتے ہیں دلکو صبح سے آج اے رشید
دلربا تھا ایک پہلو میں ہمارے رات کو

لے لیا کل شب کو چٹکی میں کئی بار آپ نے
ہوش میں ہوتا تو کرتا پیار اس گل گیر کو
دست و پا میں ہے تشنج آتی ہیں انگڑائیاں
آج میں نے کھینچتے دیکھا ہے تری تصویر کو
دیکھنے کو ہے فقط تصویر کی صورت رشید
سچ اگر پوچھو جوانی لے گئی اس پیر کو

مار ڈالے گی مجھے یہ خوش بیانی آپ کی / موت کا پیغام آئے گا زبانی آپ کی
زندگی کہتے ہیں کس کو موت کس کا نام ہے / مہربانی آپ کی نامہربانی آپ کی
آپ سے مل کر گلے راحت سے آجاتی ہے نیند / سبزۂ خوابیدہ ہے پوشاک دھانی آپ کی
بعد مُردن کھینچ لایا جذبِ دل سینے پہ ہاتھ / ایک انگوٹھی میں جو پہنے تھا نشانی آپ کی
بڑھ چکا قد بھی عروجِ حسن کی حد ہو چکی / اب تو قابل دیکھنے کے ہے جوانی آپ کی
مجھ سے دن بھر دل کہا کرتا ہے قصہ آپ کا / رات بھر میں دل سے کہتا ہوں کہانی آپ کی

جب وہ مجھ کو دیکھتا ہے ہنس کے کہتا ہے رشید
کتنی پابندِ وفا ہے زندگانی آپ کی

سزا ہر ایک کو دینے لگی حیا اُن کی / کہ چاک ہو گئی لپٹی جہاں قبا اُن کی
بہت غرور ہے عادت نہیں تواضع کی / جھکا کے دیتی ہے لیکن انہیں حیا اُن کی
نزاکتیں بھی گئیں جب سے زخم پھیل گئے / زیادہ ہو گئی سب سے میرے دل میں جا اُن کی
وہ مستِ ناز تھے دو گام بھی نہ چل سکتے / سنبھالتی ہوئی لاتی انہیں ادا اُن کی
نمو کی فصل جوانی کی آمد آمد ہے / کہ جا بجا سے مسکنے لگی قبا اُن کی

کیوں نہ رنگِ ماہ فق ہو سامنے آتے ہوئے / تیرے آگے مہر کو دیکھا ہے تھراتے ہوئے
اپنی اپنی جا ہر اک مغرور ہے اے شاہِ حسن / لاکھ بل کھاتے ہیں گیسو تا کمر آتے ہوئے
فتنۂ محشر صدا دیتا ہے جب چلتے ہیں آپ / ہم بھی آتے ہیں جلو میں ٹھوکریں کھاتے ہوئے
کھچ کے دم آیا لبوں تک روح گھبرانے لگی / سچ بتاؤ کیا اشارہ کر گئے جاتے ہوئے
زلفِ سنبل نے سنواری ہے یہ کس نے کہہ دیا / آئے غصے میں چمن تک بال سلجھاتے ہوئے

سلسلہ جنبانِ وحشت ہیں نئی تدبیر سے / طوق منت کے بدلتے ہیں مری زنجیر سے
ذبح میں بھی پا گئیں ہم نے بہت سی لذتیں / سیکڑوں طوفاں اٹھے آبِ دمِ شمشیر سے
کشتۂ لاغر کو اپنے دفن کر دیجے فقط / غسلِ میت ہو چکا آبِ دمِ شمشیر سے
آپ سی جائیں انہیں یا دل کے ٹکڑے جوڑ دیں / میری خاطر جمع ہو جائے کسی تدبیر سے

نزع میں ہیں پاؤں میرے کوئے جاناں کی طرف — چاہتا ہوں واں پہنچ جاؤں کسی تدبیر سے

کلمۂ حق اب تو لازم ہے مٹے بت بے پیر ہے — رکھ چکا ہے حلق پر خنجر دمِ تکبیر ہے
آپ کی آنکھوں نے مارا دل کی یہ تقصیر ہے — اُس کے دعوے پر گواہی سرمے کی تحریر ہے
وہ اسیرِ حسن ہیں اور ہم اسیرِ عشق ہیں — واں گلے میں طوق ہے یاں پاؤں میں زنجیر ہے
ایک ظالم نے کسی کو آج زخمی کر دیا — یہ نہیں معلوم کس کا دل ہے کس کا تیر ہے

اثر ہے دل کا ہمراہ اشکِ رواں میں — نشاں یوسف کا ہے سب کارواں میں
غرورِ عشق سے یہ تفرقہ ہے — چمن میں گل ہیں بلبل آشیاں میں
خبر رکھنا ذرا اے ساتھ والو — کہ ہم ہیں پا شکستہ کارواں میں

نزع میں رشکِ مسیحا کا خیال اچھا ہے — گو برا وقت ہے لیکن مرا حال اچھا ہے
تیرے بیمار تک آنے نہیں پاتا کوئی — بیکسی دور سے کہہ دیتی ہے حال اچھا ہے
میں نے کچھ سوچ کے یہ نسخہ ہے لکھا بھیجا — اب مری جان نہ آنا مرا احوال اچھا ہے

اے جنوں خواہش ہے میرے پاؤں کو زنجیر کی — بیڑیاں پڑتی ہیں شاید اُس بت بے پیر کی
پھر جب ہوگا یہ باتیں یاد آئیں گی ہمیں — خون رلوائے گی رنگینی تری تقریر کی
خوب چھپتا ہے دلِ بسمل پہ چھلے ہیں زخم و درد — دل کی بستی میں دُہائی ہے تمہارے تیر کی
جسم بے تاب خط آیا جواب کب تک اے رشید — کیا دیتی ہے طاقت نہیں تحریر کی

جلوہ گر ہم پہ جب مہرِ رخِ یار نہ تھا — کوئی کوچے میں کہیں سایۂ دیوار نہ تھا

پسِ مردن رہائی کا ہے غم دلہائے نالاں پر — وفاداروں کی روحیں روتی ہیں درِ زنداں پر
ہجومِ ناتوانی ہے جنوں کی فصل آ پہنچی — مجھے آتا ہے رونا حسرتِ دست و گریباں پر
ذرا جنبش نہیں ہے منتظر اک خندۂ گل کا — نظر سوئے چمن ہے ہاتھ رکھا ہے گریباں پر

نشاں خوں ریزوں کا دے رہے ہیں حرفِ لب تیرے
شہیدوں کے ہیں لاشے سرحدِ شہرِ خموشاں پر

عقدے اُلفت کے سب اسیروں کے ناخن نے کھول دیئے
سینہ بلبل چاک کیا داغِ جگر کھول دیئے

سب حسینوں نے مرے قتل پہ کمریں باندھیں
ڈورے تلواروں کے اور بندِ سپر کھول دیئے

آگیا ہوش تری چال کے مشتاقوں کو
حشر کی سن کے صدا دیدۂ تر کھول دیئے

جامِ باراں کی طرح سے ہے کرم ساقی کا
آئی برسات کے کہ میخانے کے در کھول دیئے

جا عجب کی نہیں گر اہلِ محبت روئے
میرے ماتم میں حسینوں نے بھی سر کھول دیئے

امتحانِ حسرتِ پرواز کا منظور ہوا
ذبح کرکے مجھے صیاد نے پر کھول دیئے

شرم آئے گی سبھی لوگ سمجھ جائیں گے
تم نے گیسو مرے لاشے پہ اگر کھول دیئے

رشید آغازِ الفت سے کہیں انجام بہتر ہے
کہ بحرِ عشق کے ڈوبے ہوئے لب کو ترستے ہیں

سحر تک روزنِ زنداں کی ہلا کرتی ہیں دیواریں
نہ جانے تیرے وحشی کس طرح فریاد کرتے ہیں

اور بگڑے ہیں مزاج آپ کے دیوانوں کے
آج در بند کئے جاتے ہیں زندانوں کے

وصلتِ شمع کی شب بھر تو رہی سر میں ہوا
صبح کو بزم میں پر اڑتے تھے پروانوں کے

دل جگر پڑھتے ہیں کلمہ ترا ملکِ تن میں
ساری بستی میں یہ دو گھر ہیں مسلمانوں کے

توبہ کی آج چلی تیغ نگاہِ ساقی
چور شیشے ہوئے ٹکڑے ہوئے پیمانوں کے

لختِ دل خونِ جگر نذرِ غم و درد کروں
ماحضر چاہیئے کچھ واسطے مہمانوں کے

ابر اٹھا یہ خبر پائی ہے مے خواروں سے
راستے بند نظر آتے ہیں مے خانوں کے

شاعروں کے لئے توہین کا باعث ہو رشید
تم نہ بیٹھا کرو مجمع میں سخن دانوں کے

ساقیا دورِ رقیبوں کا رہا جام چلے
یاد رکھنا کہ ہم اس بزم سے ناکام چلے

مجھ تک آنے نہیں دیتے انہیں یہ کہکے رقیب
مہندی چھٹ جائے گی پاؤں کی جو دو گام چلے

بامِ گردوں سے گرا مہر اُدھر غرب میں
سیر کرنے کو ادھر تم جو سرِ شام چلے

ضعف ہو لاکھ مگر دشت نوردی نہ چھٹے
حشر تک چاہیئے مجنوں کی طرح نام چلے

بے وفا کہہ کے پکارا دمِ آخر تم نے
وائے تقدیر کہ ہم لے کے یہ الزام چلے

سفرِ ملکِ عدم پر ہیں رشید آمادہ
لیکن اب دیر نہیں صبح چلے شام چلے

حضرتِ ریاض

ہندوستان میں کون ایسا شخص ہے جو حضرتِ ریاضؔ کو نہ جانتا ہو۔ ریاض الاخبار آج عمدہ لٹریچر میں انہیں کے زورِ قلم سے ایک ممتاز اخبار ہے۔ ریاضؔ کی شوخ طبیعت اور علیلی تخیل ابتدائے شاعری سے اپنی چمک دمک دکھا رہی تھی۔ آپ کا نام منشی سید ریاض احمد اور تخلص ریاضؔ ہے۔ آپ کے والد مولوی سید طفیل احمد صاحب بڑے پائے کے عالم تھے۔ مولد کے اعتبار سے آپ خیر آبادی ہیں۔ خیر آباد ممالک متحدہ میں ایک ممتاز قصبہ ہے جس کی خاک سے مشاہیر علما اور فقیہہ پیدا ہوئے۔ لیکن آپ کی شاعری کا وطن لکھنؤ ہے۔ ابھی خیر آباد کے مدرسۂ عربیہ میں تعلیم حاصل کر رہے تھے کہ یکایک طبیعت شعر و سخن کی طرف مائل ہوئی۔ عنفوانِ شباب تھا۔ اُس زمانے میں اسیرؔ مرحوم کی شاعری کا طوطی بول رہا تھا۔ آپ اسیرؔ کے شاگرد ہوئے۔ اور اُستاد سے ملنے کی غرض سے لکھنؤ میں آئے۔ چند روز کے بعد خیر آباد سے ایک ماہوار رسالہ (گلکدۂ ریاض) نکالا۔ اسیرؔ مغفور کی توجہ سے اس ماہوار گلدستے نے بہت ترقی کی۔ اُردو زبان کا یہ پہلا گلدستہ تھا جس کو تمام شاعر پسند کرتے تھے ریاضؔ کی ابتدائی شاعری سب کو پسند آئی۔ اور آپ کو اپنی خداداد طبیعت کی بہت کچھ داد ملی۔

اس کے بعد ریاض الاخبار خیر آباد سے جاری کیا جس کی تاریخِ اشاعت "لمعۂ رخشاں" ۱۲۹۲ھ ہے۔ شاعری کے شوق اور طبیعت کی مناسبت سے آپ خیر آباد سے اپنا دفتر لکھنؤ اُٹھا لائے بہت دنوں ریاض الاخبار لکھنؤ سے جاری رہا۔

ریاضؔ کو ہمیشہ لکھنؤ میں قیام کرنے کا شوق رہا اور وہ اُس وقت اور موقع کی تلاش میں تھے کہ کوئی صورت لکھنؤ میں قیام کی نکل آئے۔ مگر افسوس لکھنؤ میں آپ کے مصارف اخبار سے نہ نکل سکے اور آخر آپ کو اپنا دفتر گورکھپور منتقل کرنا پڑا۔

گورکھپور میں ریاض الاخبار نے (حکام اور رؤسا کی علمی قدردانی سے) بہت ترقی کی۔ ادھر گورنمنٹی ملازمت کا سلسلہ نکل آیا۔ اور منشی ریاض احمد صاحب پیشکار سپرنٹنڈنٹ پولیس ہو گئے۔

ریاض الاخبار گورنمنٹ اور ملکی خیر خواہی کی بدولت ترقی کرنے لگا "گلکدۂ ریاض" کی اشاعت کے بعد حضرت خلد آشیاں نواب کلب علی خاں بہادر فرمانروائے ریاست رامپور کو توجہ ہوئی۔

اس زمانہ میں آپ کی قدر افزائیوں کی شہرت عالمگیر تھی اور دربار رام پور میں منیر عروج۔ بحر۔ آغا حجو شرف۔ قلق۔ امیر۔ داغ۔ جلال وغیرہ مشاہیر فن جمع تھے حضور نے محض قدر دانی سے حضرت ریاض کو طلب فرما کر خلعت اور زر نقد سے ممتاز فرمایا۔ مگر افسوس ہے آپ قیام نہ فرما سکے۔

حضرت ریاض کی عمر کا زیادہ حصہ تعلقات کی بنا پر گورکھپور میں گذرا۔

ریاض الاخبار کی شہرت کے زمانے میں آپ نے ایک چھوٹا سا رسالہ نظم و نثر کا "فتنہ اور عطر فتنہ" کے نام سے ہفتہ وار جاری کیا۔

ریاض نے اپنی ذاتی قابلیت اور جوہر شناسوں کی قدر دانی سے نہایت خوش حالی کے ساتھ زندگی بسر کی۔ شرافت کے اعتبار سے بھی ریاض کا پایہ بہت بلند ہے۔ آپ سادات کرمانی سے ہیں۔ آپ کے مورث اعلیٰ شاہ شجاع والی کرمان اپنے وطن سے خیر آباد تشریف لائے۔ آپ کا خاندان ہمیشہ معزز اور موقر رہا۔

ریاض اپنی زندگی کے پچاس سال گورکھپور کی نذر کر چکے تو آپ کے دل میں لکھنؤ کی محبت نے گدگدی کی۔ گورکھپور سے لکھنؤ آنے میں آپ کا بہت کچھ مالی نقصان ہوا لیکن ان سب کو آپ نے گوارا کیا۔ چنانچہ ایک مقطع میں آپ فرماتے ہیں :۔

ریاض تھی جو مقدر میں بازگشت شباب
جوان ہونے کو پیری میں لکھنؤ آئے

ریاض خلیق۔ ملنسار اور متواضع آدمی ہیں۔ آپ کے بہت سے شاگرد اطراف ہند میں موجود ہیں مگر کبھی آپ نے اس بات پر فخر نہیں کیا۔

ریاض کے کلام میں شوخی کے علاوہ شوکت الفاظ اور بلند پروازی اور نازک خیالی بہت ہے اور عموماً کلام شاعری کے سقم سے بہت پاک ہے۔ زبان اور روزمرّہ کے محاورے میں صاف صاف مطلب ادا کرنا جس سے سننے والے کے دل پر اثر ہو۔ ریاض کا خاص حصہ ہے۔

ریاض الاخبار ہمیشہ زبان کی خدمت کے لحاظ سے ممتاز رہا ہے جس زمانے میں منشی

امیر احمد کا پہلا دیوان چھپا ہے اور مولوی غلام محمد خاں تپش مرحوم اڈیٹر اخبار مشیر قیصر نے اعتراض کئے ہیں تو اس کے جواب جو منشی ریاض احمد نے اپنی قابلیت سے لکھے ہیں۔ وہ قابل دید ہیں۔

دوسرا معرکہ ریاض الاخبار میں امیر اللغات کے متعلق ہے۔ مولوی غلام محمد تپش مرحوم کے اعتراضات اور منشی ریاض احمد کے معقول جوابات اور چلبلی چوٹیں بڑے مزے کی ہیں۔ آپ جہاں رہے۔ کچھ نہ کچھ زبان کی خدمت ضرور کرتے رہے۔

ابتدا میں ریاض کو مشاعروں میں شریک ہونے کا بہت شوق تھا اور کوئی مشاعرہ ایسا نہ ہوتا تھا جس میں ریاض نہ ہوں۔ کوئی گلدستہ ایسا نہ تھا جس میں ریاض کی غزل نہ ہو پیام یار کی طرح ہے اور منشی نثار حسین کی فرمائش ہے۔ کہ گلدستہ لکھا ہوا رکھا ہے تمہاری غزل کا انتظار ہے۔ آپ نے قلم اٹھایا اور غزل موجود۔

لیکن اب مشاعروں میں جانا ایک قلم موقوف اور غزل کا یہ حال ہے کہ اگلی دوستوں سے تو مجبور ہیں جن سے بے تکلفی ہے۔ باقی سب کیلئے عذر بارد۔

ریاض کا سن اس وقت پچاس برس کا ہے لیکن طبیعت جوان اور بذلہ سنج۔ لطف یہ ہے کہ آپ کسی صحبت میں بار خاطر نہیں ہوتے جو آپ کے کلام سے ظاہر ہے۔

انتخاب کلام

دور ہی راہ سے کچھ بیٹھ گیا دل میرا　　پاؤں کیا خاک اٹھے اب سوئے منزل میرا
رنگ باندھا ہے چمن میں یہ فغاں نے میری　　چپکے منہ دیکھتے رہتے ہیں عنادل میرا
آستیں رنگ پہ لے آئی لہو دے نکلی　　نہ چھپا لاکھ چھپا حشر میں قاتل میرا
بزم متوالی تھی کیا خم سے اڑا لی میں نے　　ہاتھ تھاما نہ کسی نے سر محفل میرا
کچھ عجب لطف سے مل جل کے رہا ایک ایک　　غم ترا جان مری رنج ترا دل میرا
یہ ہرا ہو کے رہا بعد فنا تربت میں　　جان سے بھی ہے سوا میرے لئے دل میرا

جو کھلا پھول بنا زخم مرے دل کا ریاض
جو کلی رہ گئی کھلنے سے بنی دل میرا

یہ کس کے سایۂ دیوار نے مجھے پیسا
یہ کون ٹوٹ پڑا مجھ پہ آسماں کی طرح

رہِ حیات کٹی اس طرح کہ اُٹھ اُٹھ کر
میں بیٹھ بیٹھ گیا گردِ کارواں کی طرح

ہمیں ہے گھر سے تعلق اب اس قدر باقی
کبھی جو آئے تو دو دن کو مہماں کی طرح

گیا چمن میں تو جھک کر بہت ملیں شاخیں
لیا گلوں نے مجھے میرے آشیاں کی طرح

مجھے شباب نے مارا بلائے جاں بنکر
بہار آئی مرے باغ میں خزاں کی طرح

ریاضؔ موت ہے اس شرط سے ہمیں منظور
زمیں ستائے نہ مرنے پہ آسماں کی طرح

بہار نام کی ہے، کام کی بہار نہیں
کہ دستِ شوق کسی کے گلے کا ہار نہیں

رہیگی یاد اُنہیں بھی مجھے بھی وصل کی رات
کہ اُن سا شوخ نہیں مجھ سا بیقرار نہیں

جنابِ شیخ نے جب پی تو مُنہ بنا کے کہا
مزا بھی تلخ ہے کچھ بو بھی خوشگوار نہیں

یہی چراغِ لحد تھے یہی تھے قبر کے پھول
اب انکے نقشِ قدم بھی سرِ مزار نہیں

حنا لگا کے پہنچتے ہیں گُل رخوں میں ریاضؔ
کچھ اُن کی ریشِ مبارک کا اعتبار نہیں

یہ محشر ہے یہاں اب ہوش میں دیوانہ آتا ہے
خداوندا مرے لب پر مرا افسانہ آتا ہے

سنوارے جائینگے گیسو الٰہی بات بن جائے
دلِ صد چاک میرا ہے جو بنکر شانہ آتا ہے

ہزاروں رنگ ہوتے ہیں ہزاروں حُسن ہوتے ہیں
حنائی ہاتھ میں ساقی کے جب پیمانہ آتا ہے

گلے ملنے جھجکی، جھک کر رکی، رک کر کبھی قاتل
تری شمشیر کو بھی نازِ معشوقانہ آتا ہے

مری تربت پر آکر شمع ہے کھوئی ہوئی کیسی
نہ اب گلگیر آتا ہے نہ اب پروانہ آتا ہے

ریاضؔ خضر صورت جب سوئے میخانہ آتے ہیں
تو فوراً سر پہ بھر اک خُم لئے پیمانہ آتا ہے

پھول ہے لالۂ صحرائی کا
یا کلیجہ ترے سودائی کا

شل گیسو ہیں پریشاں شبِ وصل
تھا جنہیں شوقِ خود آرائی کا

بیٹھ کر دوری سے پنہاں ہیں ہم — راز ہے گوشۂ تنہائی کا
جا سے بھی میرے سیہ خانے سے
منہ ہو کالا شب تنہائی کا

گھر میرے آتے آتے ہی دشمن کے گھر گئے — آنا یہ خوب ہے ادھر آئے اُدھر گئے
لیں اس طرح بلائیں ہماری نگاہ نے — پہلے سے اُنکے اور بھی گیسو سنور گئے
موئے سیہ سفید ہوئے دیر اب نہیں — وقت آگیا ہے شام گئے یا سحر گئے
تا میکدہ ریاضؔ کا جانا محال تھا
کس طرح یہ بزرگ خمیدہ کمر گئے

وہ کچھ غیر سے وعدہ فرما رہے ہیں — مرے سر کی سچی قسم کھا رہے ہیں
نہ اُفتاد کچھ پیش آئے الٰہی — ذرا ہم چمن کی ہوا کھا رہے ہیں
دم وعظ کیسے مزے میں ہیں واعظ — بھرے جام کوثر کے چھلکا رہے ہیں
کمر سیدھی کرنے ذرا میکدے میں
عصا ٹیکتے کیا ریاضؔ آ رہے ہیں

نیند اے شب ہجراں نہیں آتی نہیں آتی — آنکھوں میں جسے رکھتے تھے وہ بھی نہیں آتی
دنیا ہے تو دے راہ خدا جام میں ساقی — صدقے ترے چلو سے تباہی نہیں آتی
روتے ہیں کہیں دیکھ کے دشمن بھی ہمارے — آئی ہے تباہی مگر ایسی نہیں آتی
کس درجہ مری روح کا باقی ہے تعلق
جب جاتی ہے جینے سے تو پیاسی نہیں آتی

کچھ بگولوں سے بھرا خانۂ ویراں نکلا — خاک سمجھے تھے جسے چھوٹا سا بیاباں نکلا
یہ وہ پتھر ہے جگہ سے جو کبھی ہٹ نہ سکا — سنگِ در سے بھی سوا آپکا درباں نکلا
رات بھر گو مرے ماتم میں رہے غیر کے گھر — آستیں آپ کی سوکھی نہ گریباں نکلا

منہ سے ٹپکا کی تھی مینا سے کبھی آئی — شیخ میخانے میں کچھ دیر کا مہماں نکلا
کبھی وسینے کے ندرتے تنگ بقبا سے فتنے
دعسبا تیرا ترے جوبن کا نگہبان نکلا

ڈھل چکی ہے اب جوانی جائے گی — یہ شراب ارغوانی جائے گی
تیغ ہی کیا ہاتھ میں قاتل کے تھی — اے حنا تو بھی تو سانی جائے گی
شوخیاں کہتی ہیں کھل کھیلیں گے وہ — اب حیا کی پاسبانی جائے گی
موت سے بدتر بڑھاپا آئے گا — جان سے اچھی جوانی جائے گی
جان سے بڑھکر اسے رکھتے عزیز — کیا سمجھتے تھے جوانی جائے گی
شیخ نے مانگی ہے اپنی عمر کی — میکدے سے اب پرانی جائے گی
پینے آتے ہیں فرشتے خود ریاض
حور کے دامن میں چھانی جائے گی

تا شاخِ گل ہمارا جب تک قفس نہ آئے — باغوں میں موسم گل لاکھوں برس نہ آئے

گر گیا ہے مری آنکھوں سے مرا قطرۂ اشک — آتے آتے سرِ دامن یہ کہیں ٹوٹ نہ جائے
مئے سرخ ابر سیہ سبزۂ کہسار ریاض
یہ کوئی چیز نہیں توبہ اگر ٹوٹ نہ جائے

ہائے ری دیوانگی کوسا کیا تاثیر کو — ہیں فغاں اپنی ہی سمجھا نالۂ زنجیر کو
مٹ چکی ان کی اداسی آ چکی ان کو ہنسی — میرے گھر آئے ہیں رونے غیر کی تقدیر کو
یادگار اس وقت ہم بھی ہیں زمانہ میں ریاض
مانتے ہیں سب بجا ہیں ہم مانتے ہیں میر کو

ہو جہاں شام مجھے ہے وہیں بستر میرا — ٹھکانا کہیں میرا نہ کہیں گھر میرا

لے چلوں میں طرفِ خلد اُنہیں کھینچ کے ہاتھ		وہ کہیں حشر کے دن یہ بھی مقدر میرا
پھیرتے ہیں بہت آہستہ گلے پر خنجر
ڈر یہ ہے ٹوٹ نہ جائے کہیں خنجر میرا

بات دل کی زبان پہ آئی		آفت اب میری جان پر آئی
روکے رُکتا نہیں ہے سیلِ سرشک		اب تباہی مکان پر آئی
آئی بوتل بھی میکدے سے ریاضؔ
جب گھٹا آسمان پر آئی

میرے سر پہ کبھی چڑھی ہی نہیں		میں نے کچے گھڑے کی پی ہی نہیں
ہائے سبزے میں وہ سیہ بوتل		کبھی ایسی گھٹا اُٹھی ہی نہیں
کس قدر ہے بنا ہوا زاہد		جیسے اس نے "وہ چیز" پی ہی نہیں
صبح کا جھٹ پٹا تھا، شام نہ تھی		وصل کی رات، رات تھی ہی نہیں
کون لیتا بلائیں پیکاں کی		آرزو دل میں کوئی تھی ہی نہیں
کوئی ناخوش ریاضؔ سے کیوں ہو
اس روش کا وہ آدمی ہی نہیں

جنوں کھینچا سوئے محشر جو مجھ کو		مرے ساتھ میرا بیابان جاتا
وہ کافر حرم میں تھا ہم میکدے میں		جو کعبے میں ہوتے تو ایمان جاتا

ہر لختِ دل کی قبر بنے اُن کے نقشِ پا		مدفن جگہ جگہ دلِ مضطر کے ہو گئے
دامن پہ اب نباہ کے وہ داغ مے کہاں		جب بال کچھ سفید مرے سر کے ہو گئے
اتری جگر میں تیر کے ہمراہ وہ نگاہ		دو وار ایک ساتھ برابر کے ہو گئے
ان میکشوں میں سب سے ہم اچھے رہے ریاضؔ
پی کر پیالہ ساقیٔ کوثر کے ہو گئے

بزمِ ساقی ہو، مرا گھر ہو کہ سینا نہ ہو، جب اُڑانے کو ملے پھول تو جنت کیا ہے
آ کے دو آنسو گرائے کوئی امید نہیں اب مری قبر سے لپٹی ہوئی حسرت کیا ہے
اے ریاضؔ آؤ ابھی جاتے ہو کہاں زنداں سے
نہ کھلے گُل، نہ بہار آئی، یہ وحشت کیا ہے

ہم اپنی وضع رندانہ کریں کیوں ترک محشر میں یہی ہونگے وہاں بھی اہلِ دنیا دیکھنے والے
گرے غش کھا کے موسیٰ تو صدا یہ طور سے آئی کھلیں آنکھیں تری کچھ تو نے دیکھا، دیکھنے والے
سنو افسانہ جم جام رکھکر سامنے ان کے ابھی دو چار ہیں جمشید کا زمانہ دیکھنے والے
یہ جتنے پینے والے ہیں ریاضؔ اُن سب کے مرشد ہیں
ہمیشہ جامِ مے میں نورِ حق کا دیکھنے والے

ہم نئے وہ نئے ہر بات نئی رات نئی نئی صحبت میں حسینوں کو حجاب آتا ہے
مستِ بلبل کو جو دیکھا ہے کسی گُل کے قریب باغ میں جاتے ہوئے ان کو حجاب آتا ہے
یاد احباب کو آ جاتے ہیں مرحوم ریاضؔ
میکدے سے جو کوئی مستِ شراب آتا ہے

کیسی ہیبت ناک کیسی تار و تیرہ بے چراغ میری تربت بھی بنی یا رب مرے گھر کا جواب
ہنس رہی ہے طنز سے ساقی کی چینِ آستیں ہلکی موجیں بن رہی ہیں خطِ ساغر کا جواب
اپنے دیوانوں کو سمجھتا ہوں بڑی دولت ریاضؔ
ہے یہ مجموعہ مرا گنجینۂ زر کا جواب

چھری نہ تیز کریں آپ امتحان کے لئے بہت ہے نیم نگہہ مجھ سے نیم جاں کیلئے
کسی کی چینِ جبیں پہ مجھے ہنسی آئی
ذرا سی تیغ چلی میرے امتحاں کے لئے

آنکھ میں سحر نظر میں جادو لب میں اعجاز مسیحائی کا
تھوڑی پیتا ہوں بڑھاپے میں بھی
کہ سبب ہو یہ توانائی کا

نہیں ملتا کوئی مجکو شریکِ روزِ تنہائی یہ آفت ہے مرا سایہ بھی مجھسے دور رہتا ہے
ادب سے وعظ کی صحبت میں ہم وہ شے نہیں پیتے ہمارے جام میں افشردہ انگور رہتا ہے
لحد پر شمع سے بڑھکر ہے وہ دشمع کا جوبن وہ بنکر حور تو یہ بن کے زلفِ حور رہتا ہے
اثر بجلی کا ہے صیاد کیا تیری نگاہوں میں کہ ہر مرغِ چمن پروانے سے مجبور رہتا ہے
خمار آلودہ آنکھوں پر ہزاروں میکدے صدقے وہ کافر بے پیئے رات دن مخمور رہتا ہے
حسینوں کے حنا آلودہ ہاتھ ایسے کہیں اچھے کہ مرقع پا کے بھی دستِ ادب سے دور رہتا ہے
ترے صدقے ترے ہاتھوں سے اتنی پی ہے ساقی کہ اب تو بے پیئے منہ پر ہمارے نور رہتا ہے
فرشتے پر سے مس کرتے ہیں شاید اے ریاضؔ اسکو
کہ اب ریشِ مبارک پر بہت ہی نور رہتا ہے

ہے ریاضؔ ایک مردِ مست خرام نہ پیئے اور جھومتا جائے

پیرو میر

شیخ محمد جان نام تخلص شاد مشہور بہ شاد پیرو میر باپ کا نام شیخ وارث علی۔ دادا شیخ فضل علی لکھنؤ کے قدیم شیخ زادے حضرت محمد بن حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالےٰ کی نسل سے۔

اجداد مذہب حنفی سُنی رکھتے تھے مگر عہد شاہی میں شیعہ مذہب اختیار کر لیا تھا۔ پیدائش کا سنہ صحیح تو نہیں ملا لیکن تخمیناً سنہ ۱۲۲۰ھ آپ کی ولادت کا سنہ ہے زمانہ نصیر الدین حیدر شاہ اودھ میں ایک چوبدار نے اپنے لڑکے کی شادی بہت دھوم سے کی تھی۔ مرزا نصیر الدین حیدر شاہ اودھ بلحاظ ذرّہ نوازی اس تقریب میں رونق افروز ہوئے اور تمام ارکان دولت شریک محفل تھے۔ پیرو میر نے اس کی تاریخ نظم کی ؎

نقیب بانگ نقابت زند پیش نگاہ

اس مصرع سے سنہ ۱۲۴۷ھ نکلتے ہیں اور تاریخ فارسی میں ہے اس وقت یہ جوان تھے کم سے کم بیس برس کا سن ہوگا۔ دوسرا واقعہ یہ ہے کہ منشی سید ناہد علی صاحب سہارنپوری بیان کرتے تھے کہ شیخ صاحب فرماتے تھے میں نے دس گیارہ برس کے سن میں میر تقی میر کو دیکھا تھا وہ نہایت ضعیف اور دُبلے پتلے تھے۔

شیخ صاحب کی اولاد کوئی نہ تھی انھوں نے اپنی شادی تک نہیں کی ہمیشہ لیلائے سخن کے دیوانے رہے اکثر فرمایا کرتے تھے کہ عروس سخن سے جس نے عقد کر لیا ہو اس کو دوسرا نکاح جائز نہیں مزاج میں ابتدا سے وارفتگی تھی۔

مولوی تفضل حسین صاحب شیدا لکھتے ہیں کہ میں نے چند بار بکھرے ہوئے موتیوں کو ایک سلک میں جمع کیا لیکن مصنف کی ژولیدگی خاطر نے اُسے برباد کر دیا۔ اکثر جنون ہو جایا کرتے تھے اور دیوان کھو جاتا تھا آخر مولوی محمد یعقوب صاحب مالک مطبع نجم العلوم کی کوشش سے شیخ صاحب نے پھر از سر نو کلام مرتب کیا دو دیوان مرتب ہوئے ایک فارسی قافیوں کا ایک ہندی قافیوں کا ایک کا تاریخی نام "سخن بے مثل" دوسرے کا تاریخی نام "سخن بے مثال" رکھا۔

پہلا دیوان ہزار مشکل سے چھپنے پایا تھا کہ دوسرا دیوان کھو گیا۔ اسی غم غلط کرنے کو کہتے ہیں؎

کھو گیا جو دوسرا دیوان کیا تھا کچھ نہ تھا

مگر حقیقت میں شیخ صاحب کو دوسرے دیوان کے کھونے کا سخت صدمہ ہوا۔ میر تقی میر کے صرف ایک فرزند میر محمد عسکری عرف میر کلو عرش تھے جو اپنے موروثی مکان واقع محلہ مفتی گنج میں رہتے تھے۔

میر کلو بہت سیاہ فام لاغر اندام میانہ قد تھے اور افیون کثرت سے پیتے تھے۔ میر نے تو کسی وقت میں شاید عیش بھی کیا ہو۔ لیکن عرش غریب کی تمام زندگی افلاس اور مصیبت اور پریشانی میں کٹی۔ ان کی نازک مزاجیوں نے عروج حاصل نہ ہونے دیا۔ منشی باقر علی منتہر مرحوم کہتے تھے کہ میر کلو عرش کی صرف ایک لڑکی تھی اور ایک نواسا زندہ موجود ہے جو غریب یکہ ہانکتا ہے۔ دال کی منڈی میں رہتا ہے۔ شیخ صاحب کو میر عرش سے شاگردی کا فخر حاصل تھا۔

عرش مرحوم کے شاگرد گنتی کے تھے۔ شیخ فدا علی عیش۔ منشی سرفراز علی قمر۔ شاد۔ فلک مگر یہ سب عروضی تھے۔

عرش کے افلاس نے سب سے بدتر ان کے ساتھ یہ سلوک کیا کہ ان کے بعد خاندان ناسخ نے یہ الزام ان کے سر رکھا کہ ناسخ سے ان کو تلمذ تھا۔ حالانکہ یہ امر قرین قیاس نہ تھا۔ عرش کی نازک مزاجی ایسی باتوں کو کب قبول کرنے والی تھی۔ دوسرے وہ ان لوگوں میں تھے جن کو ناسخ استاد کہا کرتے تھے اور ان کے صلاح و مشورے سے زبان میں ترمیم و تنسیخ کرتے تھے۔ فلک کے انداز طبع سے عرش بہت ناخوش تھے اور کہا کرتے تھے۔ اس کو شاعری کا فن شریف ہرگز نہ آئیگا ہاں کچھ تک بندی کرے گا۔

شاد پیر و میر بالکل میر کے رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اور وہی زبان کہتے تھے۔ اس لئے عرش ان کو پیر و میر کہا کرتے تھے۔

شیخ صاحب کی شاعری میں یہ بڑا کمال تھا کہ ہر غزل میں ایک مثل محاورے اور اصطلاح میں نظم ہے۔ اپنے عہد کے تمام محاورے جو غزل کے رنگ میں آسکتے تھے نظم کر دیئے اصطلاحات کا جس قدر مسالہ شیخ صاحب کے دیوان سے ملتا ہے وہ دوسروں کے کلام میں سوائے میر تقی میر کے نصیب نہیں۔ حقیقت میں یہ اپنے رنگ کے بادشاہ تھے۔ ہندی قافیوں کا جو دیوان کھو گیا تھا اس کا شیخ صاحب کو بہت رنج تھا آخر رفتہ رفتہ ہندی قافیوں میں دوسرا دیوان جمع

کیا جو اُن کے انتقال کے بعد چھپا ایک مثنوی چار درویش تکلم کی تھی جس کا نفس قصہ باغ و بہار کے علاوہ ایک بادشاہ ایک وزیر ایک جوہری ایک سوداگر کی عبرت افزا داستان تھی طبع ہو چکی ہے۔

ایک کتاب میں "صرف ونحو" چار زبانوں کی لکھی تھی۔ اردو، فارسی، سنسکرت، اور عربی قصیدے بہت سے لکھے۔

سر راجہ امیر حسن خاں بہادر کے۔سی۔آئی۔ای مرحوم والیٔ ریاست محمود آباد سے "بیس" روپیہ ماہوار مقرر تھا اسی میں اوقات بسر کرتے تھے۔ مرد قانع اور وضعدار تھے۔ فارسی شاعری میں آغا شیرازی کے شاگرد تھے۔

شیخ صاحب کی تصویر یا فوٹو یا حلیہ لکھنے کی کوئی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ صرف اس قدر کہہ دینا کافی ہے کہ غالب کو چھپاؤ اور ان کو نکالو۔

اس قدر صورت بہت کم ملتے کسی نے دیکھی ہوگی۔ وہی لمبا قد وہی دُبلا جسم وہی لمبوترا چہرہ وہی گندمی رنگ۔

شیخ صاحب کہتے تھے کہ مرزا اسد اللہ خاں غالب نے ہم سے لکھنؤ میں ملاقات کی تھی۔ ناسخ اور آتش کے معرکہ آرا مشاعروں میں شیخ صاحب اکثر شریک ہوتے تھے۔ آتش کو خوجی کہتے تھے اور ان کے بہت معترف تھے۔

علم موسیقی میں بھی بہت کچھ دخل تھا۔ اور اپنے کمرے میں اکثر گنگنایا کرتے تھے۔ اپنے بھائی کے ساتھ پاٹے نالے پر رہتے تھے۔ اور اکثر ناراض ہو کر نواب صادق علی خاں کے مکان پر اٹھ آتے تھے۔ آخر زمانے میں بیس برس سے شاعری ترک کر دی تھی۔ غزل نہیں کہتے تھے لیکن رؤسا کے اصرار سے اکثر مشاعروں میں شریک ہوتے اور غیر طرح کلام پڑھتے تھے۔ پڑھنے کا انداز بہت اچھا تھا اور بہت بلند آواز سے پڑھتے تھے جس سے تمام محفل مستفید ہوتی تھی۔ پانی کا گلاس سامنے رکھا رہتا تھا۔ جب غزل پڑھنے میں حلق خشک ہونے لگتا تو دو ایک گھونٹ پی لیتے تھے۔

اکثر ان سے زیادہ سن رسیدہ لوگ ان سے اصلاح لینے آتے تھے۔ جیسے کاکوری کے شیخ عظمت علی صاحب عظمت جو بہت اچھا کہتے تھے اور نہایت ضعیف تھے۔ ان کے شاگردوں میں مولوی سید محمد صاحب واثق خواجہ بادشاہ علی صاحب صفیر۔ جناب ننھے آغا صاحب آبر بیلنشی سید عاشق حسین صاحب وصل تھے۔

آخر وقت میں اصلاح دینا ترک کر دیا تھا۔ مجھکو بھی شیخ صاحب کی شاگردی کا فخر حاصل ہے

میں جس وقت اصلاح کے لئے شیخ صاحب کی خدمت میں گیا تو فرمانے لگے "بھائی میں تو اب اصلاح نہیں دیتا۔ بیس برس سے غزل کہنا ترک ہے۔ اللہ اللہ کیا کرتا ہوں ہر ایک دم کو دمِ واپسیں جانتا ہوں۔ دوسرے شاعری میں اب کیا رکھا ہے۔ قدردانی کا زمانہ نہیں ہے۔ اس سے تو کوئی اور کمال حاصل کرو۔ آج کل لوگوں نے شاعری کو دل لگی سمجھ لیا ہے۔ دو چار شعر اُلٹے سیدھے کہہ لئے اور شاعر بن بیٹھے۔ اگر ایسی ہی شاعری کرنا ہے تو بہت سے شاعر ہیں۔ اُن سے اصلاح لے لیا کرو۔ اور اگر کچھ فن حاصل کرنا ہے تو میں کچھ عروض و قافیہ پڑھا دوں گا۔ متروکات سے واقف کرو دوں گا محنت کرو گے تو کچھ ہو جاؤ گے۔ ایک شرط ہے جب تک کتاب العروض و رسالہ قافیہ ملا نا اسم گنا بادی مجھ سے حرف بحرف پڑھ نہ لو اس وقت تک ایک مصرعہ بھی نظم نہ کرنا" یہ سب شرطیں منظور کرنا پڑیں اور تین برس تک پاپڑ بیلنا پڑے۔ شوق کہتا تھا کہ غزل کہئے اور مشاعروں میں شریک ہو جیئے لیکن شیخ صاحب کا خوف غالب تھا۔ اس لئے دلی جذبات کا خون ہوتا تھا۔ کیونکہ مزاج میں غصہ بہت تھا۔ اگر انکار کر دیتے تو پھر عمر بھر اصلاح نہ دیتے۔ اور ایسا ہی کئی شاگردوں سے کر چکے تھے۔

ایک سب رجسٹرار لکھنؤ میں منشی محمد نصیر صاحب کاظم تھے جو طبیعت دار تھے اور غزل بہت اچھی کہتے تھے۔ انہوں نے ایک مثنوی نظم کی تھی۔ اس پر شیخ صاحب سے اصلاح لینا چاہتے تھے۔ اُن کے پاس شاگرد ہونے آئے تو آپ نے اُن سے بھی اقرار لیا یہ سمجھے مضائقہ کیا ہے دو چار مہینے عروض قافیہ بھی دیکھ لیں گے اور درمیان میں اپنی مثنوی پر اصلاح بھی لے لیا کریں گے۔ شرطیں منظور کر لیں اور سبق پڑھنے لگے۔ ہفتے عشرے کے بعد اثنائے سبق میں اپنی مثنوی پیش کی۔ اور کہا میری خوشی یہ ہے کہ اس کے دو چار صفحوں پر آپ اصلاح فرما دیں۔

انہوں نے فرمایا شاید تم کو اپنا وعدہ یاد نہیں رہا۔ خیر اس مرتبہ تو سنا دو مگر آج سے نہ لانا مثنوی سن کر اس پر اصلاح دی اور کہا اگر فن جانتے ہوتے تو شاید اس قدر اصلاح کی ضرورت نہ ہوتی شامتِ اعمال سے انہوں نے بیس روز کے بعد ایک دفعہ پھر مثنوی پیش کی اور کہا چند صفحہ ملاحظہ فرما لیجئے۔ شیخ صاحب آگ ہو گئے۔ سارے بدن سے تھر تھر کانپنے لگے۔ اور فرمانے لگے بس اب جائیے آج سے ہمارے آپ کے قطع تعلق۔ پھر لاکھ لاکھ عذر کئے ایک نہ سُنی اور ان کو اصلاح نہ دی نہ عروض پڑھایا۔

شاگرد کو بیٹے سے زیادہ سمجھتے تھے۔ ہم نے دوسرا دیوان اُن کا بہت کچھ لکھا ہے۔ کیونکہ

ہمارے زمانے میں شیخ صاحب کی آنکھوں پر نزلہ کا بہت زور تھا۔ یہاں تک کہ پتلیاں پتھرا گئیں تھیں اور ہاتھ میں شدید رعشہ تھا۔ کہنے کو تو کہا کرتے تھے کہ "میں غزل نہیں کہتا" مگر شاعری اُن کی طبیعت ثانی ہو گئی تھی۔ اور ہر وقت فکر سخن میں رہتے تھے۔ سوائے شاعری کے کسی بات کی فکر نہ تھی۔ عروض و قافیہ اور متروکات کی تحصیل کے بعد ہم نے غزل کہی۔ اور بہت جانچ کر کہی۔ جس وقت ہم اپنی غزل سُنا رہے تھے۔ مولوی غلام حسین قدر بھی شیخ صاحب کے پاس بیٹھے تھے۔ یہ سُن کر کہ یہ پہلی غزل ہے۔ بہت تعریف کی۔ شیخ صاحبؒ نے فرمایا۔ تین برس میں نے اس کے ساتھ مشقت کی ہے۔ تم میری تعریف نہیں کرتے اس کے مداح ہو۔

دو برس کے بعد راجہ صاحب محمود آباد کربلائے معلیٰ جانے لگے۔ شیخ صاحب نے بھی اُن کے ہمراہ جانے کا قصد کیا۔ لوگوں نے کہا کہ آپ کا سن اس قابل نہیں کہ راہ کے مصائب برداشت کر سکئے۔ کہنے لگے یہی تو خواہش ہے کہ کربلا پہنچتے پہنچتے دم نکل جائے۔ اور وہیں کی مٹی میں مٹی ملجائے۔ جانے کے دو چار مہینے کے بعد خبر آئی کہ شیخ صاحب نے کربلائے معلیٰ میں انتقال کیا سب کو بہت صدمہ ہوا۔ دوست احباب نے اُن کے مرنے کی تاریخیں موزوں کیں لیکن پھر راجہ صاحب کے ہمراہ صحیح وسلامت تشریف لائے۔

شیخ صاحب کو اچار کا بہت شوق تھا۔ ایک دفعہ دیکھتا ہوں تو ایک بڑی سی مٹکی میں اچار ہے۔ ایک چمچہ سے آپ نکال رہے ہیں۔ میں نے جب غور سے دیکھا تو برابر سے کیڑے گجگجا رہے تھے۔ میں نے کہا کہ یہ کیا آپ نکالتے ہیں۔ اس میں تو کیڑے پڑ گئے ہیں ہنس کر کہنے لگے تو کیا مضائقہ ہے۔ اسی کے تو کیڑے ہیں۔ یہ کہکر کہنے لگے تم نے میرا نقصان کیا۔ مجھکو تو سوجھتا نہیں ہے اگر تم مجھ سے نہ کہتے تو اسی طرح برابر کھایا کرتا اور کچھ خبر نہ ہوتی۔

جب کربلائے معلیٰ سے واپس آئے تو کچھ دنوں کے بعد نواب صادق علی خاں کے مکان پر اُٹھ آئے تھے اور وہیں رہا کرتے تھے۔ نواب صاحب کا دولت خانہ میرے مکان سے قریب تھا۔ میں اکثر وہاں جایا کرتا تھا اور اُستاد کے پاس بیٹھتا تھا۔ شیخ فدا علی عیش بھی آتے تھے۔ ایک روز میں نے کہا اب آپ کو چاہیئے ہے کہ نماز پابندی سے پڑھا کیجئے کیونکہ آپ زیارت کر آئے ہیں۔ کہنے لگے تو زیارت کرنے سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ میں نماز کا پابند ہوں اور آخر تم لوگ نماز پڑھتے ہو کچھ مجھکو بھی ثواب ملتا ہوگا۔ میں نے کہا میری نماز آپ کے کس کام کی۔ اس لئے کہ میں ہاتھ باندھ کر نماز پڑھتا ہوں اور آپ کی بخشش کے لئے ہاتھ کھول کر نماز پڑھنا

لازم ہے۔ کہنے لگے کہ اچھا تو اب نماز بھی گئے پڑی۔

ہر ایک ملنے والے کو کہا کرتے تھے کہ یہ ہمارا آشنا ہے۔ میں نے کہا اُستاد "آشنا" ایک کریہہ لفظ ہے۔ آپ دوست کہا کیجئے۔ کہنے لگے تم بچے ہو۔ دوست اس زمانے میں کہاں ہیں۔ آج کل کے ارباب پس پردہ دشمنی کرتے ہیں۔ ان کو دوست کہنا کفر ہے۔ وضع کی پابندی یہ تھی کہ کبھی کبھی خواجہ عزیز الدین عزیز لکھنوی کے یہاں ملاقات کو جاتے تھے، گرمی ہو یا سردی لیکن اُن کا معمول بہت کم ترک ہوتا تھا۔

اتوار کو جب پوچھا بھی کہا کہ سبزی منڈی جاتا ہوں۔ کوٹھی تک ایک آشنا سے ملنا ہے۔ روز سہ پہر کو ہوا کھانے شاہ مینا تک جاتے تھے۔

مکان پر چوگوشیہ ٹوپی دیئے ایک لنگی باندھے ہوئے حقہ پیا کرتے تھے۔ جب دیکھئے "فکر سخن" دیوان کھلا ہوا ہے۔ بار بار ترمیم و تنسیخ ہو رہی ہے۔

نازک مزاجی روسا سے ملنے کی اجازت نہ دیتی تھی۔ منشی سجاد حسین ایڈیٹر اخبار اودھ پنچ شیخ صاحب کے عقیدت مند شاگرد تھے۔ اور ان کو چچا کہا کرتے تھے۔

آخر زمانے میں شیخ صاحب نے اپنی تمام تصنیف مجلدات اڈیٹر اودھ پنچ کے حوالے کیں اور کہا تم سے ممکن ہو تو بجائے ہماری تمام تصنیف چھپوا دینا۔ ایک روز دفتر اودھ پنچ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ دفعتہً ہاتھ پاؤں میں تشنج ہونے لگا۔ اور یہ کرسی پر سے گر پڑے معلوم ہوا کہ فالج گرا ہے۔ آخر ڈولی میں سوار کر کے گھر پہنچوا دئے گئے۔ یہاں آتے آتے شام کو روز یکشنبہ ربیع الثانی کی چھٹی تاریخ ۱۳۱۱ھ کو ستانوے برس کے سن میں انتقال فرمایا۔

پہلے دیوان میں ایک تقریظ مولف نے لکھی ہے جس میں یہ دکھایا ہے کہ سابق کے ریختہ گو شاعر اپنے کلام میں غیر مانوس الفاظ خلاف تلفظ اردو سے معانی نظم کرتے تھے اور الفاظ ثقیل ٹھیٹھ ہندی کے اور الفاظ غیر فصیح کیا کا کے جو عوام کی زبان پر تھے کہہ جاتے تھے۔ عالمگیر کے عہد میں میر حاتم دہلوی نے کلام کے عیوب ظاہر کر کے متروکات کی بنا قائم کی اور موجد اس طرز کے حاتم دہلوی ہیں۔ انہیں کی تقلید میں شیخ صاحب نے اپنے دیوان کی لوح پر اپنے متروکات لکھ دیئے۔ جو سنہ ۱۲۵۰ھ میں نصیر الدین حیدر بادشاہ اودھ کے زمانہ میں اُستاد عرش کی صلاح سے مقرر کئے تھے۔

شیخ صاحب کا کلام اس قدر مقبول ہوا کہ اس کے اکثر شعر اردو قصص کی کتابوں میں

پائے جاتے ہیں اور اکثر شعر لوگوں کی زبان پر ہیں۔

نکہتِ برباد تھا غنچہ کا حسن — مسکراتے ہی نہ وہ عالم رہا
صدف کی طرح توکل تو کر ذرا اے شاد — پھر احتیاج جو قطرے کی ہو گہر لینا
قریب ہے یارو روزِ محشر چھپیگا احوالِ قتل کیونکر — جو چپ رہیگی زبانِ خنجر لہو پکاریگا آستیں کا
کیا کیا قتل تو نے قاتل ہوا ہوا خون مجھ حزیں کا — ارے گریباں نہ کوئی پکڑے لہو تو دھو جیب و آستیں کا
مجھے شاد بخش دیتا نہ وہ کیوں بغیر پوچھے — میں کسی شمار میں تھا جو مرا حساب ہوتا
ہر حال میں شکستہ دلِ ناصبور تھا — شیشہ بھی تھا تو سنگِ حوادث سے چور تھا
ذہن میں رازِ محبت بہ مشکل آیا — دل گیا ہاتھ سے لوگوں نے کہا دل آیا
تیر مارا نہ نشتر مارا — غیر سے آنکھ مار کر مارا
ہمیشہ سے ہے تہ و بالا زمانہ — سدا ڈولہ دورۂ افلاک نکلا
عجب حسن و جمال آدمی ہے — کہ محبوبِ خدائے پاک نکلا

چلتی ہے سانس جب تک قائم ہے بزمِ اعضا
اے دم ہے تیرے دم تک جلسہ اس انجمن کا
اے شاد گبر و مومن دونوں سے میل رکھئے
تسبیح میں ہو ڈورا زنارِ برہمن کا

تیر مجھ زار کی طرف مارا — آپ نے تو بڑا ہدف مارا
جو میری چوٹ پہ غیروں کا اُس نے نام لیا — لگا جگر میں وہ گھونسا کہ دل کو تھام لیا
مشکل میں کب کسی کا کوئی آشنا ہوا — تلوار جب گلے سے ملی سر جدا ہوا
کی پرستش بہت اب کام دعا سے ہوگا — اے بتو تم سے جو ہوگا وہ خدا سے ہوگا
دل سلگتا ہے تو شعلہ ہے جگر سے اٹھا — یہ دھواں دیدۂ تر دیکھ کدھر سے اٹھا
شبِ وصل ہے صبح ہونے کا ڈر تھا — نہ پوچھی پھٹی تھی کہ ٹکڑے جگر تھا
یہ دنیا ہے صدا سنگ آسیا کا — خدا رزاق ہے بے دست و پا کا
ہاتھ چھوٹا پڑ گیا مجھ پر جو اس خونخوار کا — پیتے ہی خونِ جگر منہ آ گیا تلوار کا
روح بولی پھینک کر پشتارہ جسمِ زار کا — اک اکیلے سے نہیں اُٹھتا ہے بوجھا چار کا
ظالموں کی ہے کمی کیا ستم ایجاد بہت — سر سلامت ہے تو مل جائینگے جلاد بہت

ثمر توڑ اس چمن میں یا شجر کاٹ — کسی کا حق نہ لیکن اے بشر کاٹ
زلفوں کے اسیر ہیں جو در بند — آنکھوں کے فقیر ہیں نظر بند

پاؤں رکھیں نہ فرشِ دیبا پر — لات ماری ہے ہم نے دنیا پر
جیسے گرا رہا ہے کوہِ الم جہاں پر — ٹوٹیں فلک الٰہی یونہیں اس آسماں پر
اٹھ ابرِ کرم جا سے اے دامنِ تر — آنچ آئے نہ جہنم سے گنہگاروں پر
اب ہے نیرنگِ سخن سب کا بیاں ہی کچھ اور — پیر و دبیر ہوں میں میری زباں ہی کچھ اور
چھپاتا ہے صیاد کیوں مرگِ بلبل — پڑے تو ہیں خنجر سے کچھ پر سے باہر
یہ نرمی سخت گیروں میں کبھی رطب اللساں ہو کر — بسر کی عمر بھر بتیس دانتوں میں زباں ہو کر
میں وہ سرکش ہوں جو ہیں پہنچا درِ گلزار پر — تاکتے انگور کی بیلیں چڑھیں دیوار پر
زشت روئی نہ حسنِ صورت شرط — آدمی کو ہے آدمیت شرط
گئے تھے بھول کر رستہ حرم تک — خدا لایا ہمیں بیت الصنم تک
کیا دوں نشانِ قاتل ہوں ناتواں یہاں تک — پھرتا ہے نام دل میں آتا نہیں زباں تک
نہ تو گوہر ہے نہ زر ہے دلِ بے حال کا مول — نگہِ لطف خریدار ہے اس مال کا مول
مرنے پہ باندھے کمر سرگرم بازاروں میں ہوں — جان کا گاہک جو ہے اُسکے خریداروں میں ہوں
جس شخص میں ہو نہ آدمیت — حیوان ہے وہ جامۂ بشر میں
بلبل کا خونِ ناحق گلچیں چھپے گا کب تک — آخر یہ اک نہ اک دن پھولیگا گل چمن میں
اس درجہ ہیں ملایم اعضا سب اُسکے تن میں — مثلِ زباں سراپا ہڈی نہیں بدن میں
دیرینہ شوقِ مے کا اے شاد پوچھنا کیا — کیفیتیں ہیں تازہ جامِ مئے کہن میں
ٹیڑھے اس سے ہوں دکھائیں جیسے گھونگر گیسو — کچھ نہ بندے کے خدا ہیں نہ پیمبر گیسو
اوج اگر خلق میں چاہے تو نگونساری کر — پاؤں پڑنے سے حسینوں کے چڑھے سر گیسو
اس طرح دینے کو سائل سے ملا ہاتھ سے ہاتھ — کہ نہ آگاہ ہوا اے کانِ سخا ہاتھ سے ہاتھ
آدمی جز غمِ بے بال و پری کیا جانے — لطفِ پرواز کا سُتی کی پری کیا جانے
منہ سے نکلی جو ہیں اللہ نے فوراً سن لی — ہم فقیروں کی دعا بے اثری کیا جانے
ازلی دو جہاں کی ہستی ہے — نئی دنیا پرانی بستی ہے
مرنے پہ جو چاہیں سب گماں ہے — نیچے بھی زمیں کے آسماں ہے

خدا گرائے نہ نظروں سے نکتہ چینوں کی چڑھے ہوئے ہیں نگاہوں پہ عیب بینوں کی
روئے جب سامنے تربت آئی مر گئے ہم تو محبت آئی
قسمت میں اگر اولاد نہیں اشعار سے اپنا کام چلے دنیا سے اٹھیں جب مہر صفت تا حشر ہمارا نام چلے
جو ناوک مژہ ہے اک تیر بے اماں ہے جتنی بھوؤں پہ قرباں دو ٹانگ کی کماں ہے
سایہ کرے جو سر پہ کٹتا شجر وہی ہے باغ جہاں میں سچ ہے نیکی کا پھل بدی ہے
یہ شور کرتی ہے ہر موج دیدۂ تر کی کہ میری دھار پہ ہے آبرو سمندر کی
عشق انساں میں خدا بھی رشک سے خالی نہیں گم کیا سایہ نبی کا بدگمانی کے لیے
جوانی جاتی ہے خطِ رخِ جاناں آتا ہے بڑھاپا راہ داڑھی کا لئے پروانہ آتا ہے
خوشبو کی عطا گل کو جب اس شوخ نے زر بھی منہ پھوڑ کے غنچے نے کہا کچھ تو ادھر بھی
وہ مرغ گرفتہ ہوں کہ باندھے گئے بازو پرواز کے قابل نہ ہوئے تھے ابھی پر بھی
کسی کا پردۂ عزت جنوں کتاں نہ کرے خدا برہنہ کرے ننگِ خانداں نہ کرے
گوش کر منقلب زمانہ ہے آج کا ذکر کل فسانہ ہے
قتل کرتا ہے قاتلِ عالم ملک الموت کا بہانہ ہے
فاقہ کش ہوں پہ فکر صحت ہے تندرستی ہزار نعمت ہے
ناتوانی سے یہ حالت ہے دلِ ناکام کی مہر تک بھی اٹھ نہیں سکتی ہمارے نام کی
ہوں وہ خرمن جو بچوں برق کی شتابی سے بجلیاں مجھ پہ گریں خود مری بیتابی سے
گر پڑے آنسو تو چلا کر شمع نے فریاد کی یہ مثل سچ ہے بری ہوتی ہے آنچ اولاد کی
آنکھیں سینکیں غیر اس بت سے دل مضطر جلے وائے بیدردی کوئی تاپے کسی کا گھر جلے
دامن آدم نہ نوح کا تر ہے رو چکے سب نچوڑ ہم پر ہے
فرشِ زمیں پہ نہ نازاں ہوں یہاں زر والے خاک پر سوتے ہیں کمخواب کے بستر والے
داغِ دل اس بت کی نظر پر چڑھے پھول وہی ہے جو مہیسر چڑھے
لب تک آ سکتی نہیں جو جی کی حسرت دل میں ہے آرزو ہم ناتوانوں کی بڑی مشکل میں ہے
جز نکیرین اور کچھ کھٹکا نہیں ہے تا عدم ایک ڈر ان دو ٹھگوں کا گور کی منزل میں ہے
اے زہے بخشش کہ قالب یار کی منزل میں ہو رتبہ دیکھو میرے کینے کا کہ اسکے دل میں ہے
دیدنی حشر کی اے محشر تو سیر تو ہے پر یہ ہنگامہ شر کیا ہے آہ و خیر تو ہے

جوانی سے زیادہ وقت پیری جوش ہوتا ہے
بھڑکتا ہے چراغ صبح جب خاموش ہوتا ہے

خجل پیش خدا جاتے ہیں انساں تم عصیاں سے
کفن سے منہ چھپا کر ہر بشر روپوش ہوتا ہے

زبان حال سے کہتی ہے یہ لو آتش غم کی
مرے آگے ہیں ٹھنڈی گرمیاں نار جہنم کی

مرے مضموں ہیں غیروں کے سخن میں
مری دولت نصیب دشمناں ہے

مجھی تک نام روشن ہے مرا شاد
مرے پر گل چراغ دودماں ہے

نہ تڑپنے کی اجازت ہے نہ فریاد کی ہے
گھٹ کے مر جاؤں یہ مرضی مرے صیاد کی ہے

چار ہی پارچے خلعت میں شہادت کے ہیں
کرے چو رنگ جو نیت مرے جلاد کی ہے

سخت باتوں کا پہنچتا ہے جو صدمہ دل کو
وہ کڑی چوٹ نہ پتھر کی نہ فولاد کی ہے

ہم فقیروں کے تجرد پہ نہ جا اے شہ حسن
دل گرفتار ہیں صورت الف آزاد کی ہے

سیپ تک سے ہے جگر چاک پئے در یتیم
مامتا کونسی ماں کو نہیں اولاد کی ہے

حسن بینی سے نظر کی تو یہ معلوم ہوا
سامنے کے جبیں ہیں تصویر پریزاد کی ہے

فغاں نکلے دل پر آرزو سے نالہ یا نکلے
وہ ارمانوں کو لے نکلے دہن سے جو صدا نکلے

میں وہ ہوں کلمہ گو اے شاد سنتے ہی سخن جس کا
دہن سے منکر دین کے بھی صل علیٰ نکلے

آ کے تربت پہ بہت روئے کیا یاد مجھے
خاک اڑانے لگے جب کر چکے برباد مجھے

گھر کو چھوڑے ہوئے مدت ہوئی صیاد مجھے
کس چمن میں ہے نشیمن یہ نہیں یاد مجھے

دل لگاتے ہی گرا آنکھ سے آنسو کی طرح
یہ نہ معلوم تھی اس عشق کی افتاد مجھے

خوش نہیں کوئی جہان گذراں میں سفری
نظر آتا ہے جرس تک دل ناشاد مجھے

کوئی خالی نہ اثر سے ہو مرا طفل سرشک
ناخلف دے مرے اللہ نہ اولاد مجھے

گھٹ کے مر جاؤں یونہی تا دہن کے نہ فغاں
کھولنے دے نہ خموشی لب فریاد مجھے

عشق میں آل محمد کے جنوں ہو اے شاد
پابہ زنجیر کرے الفت سجاد مجھے

خدا رکھے کہ ندے مصحف داور تو نہیں ہو
کچھ قاصد محبوب پیمبر تو نہیں ہے

کیوں سنگ حوادث سے نہ ٹوٹے دل نازک
آئینہ ہے کچھ سد سکندر تو نہیں ہے

ہے وحیِ الٰہی کا خطِ یار یہ دھوکا   جبریل کے جامے میں کبوتر تو نہیں ہے
کج ابروِ قاتل ہے تو ہو غم نہیں اس کا
منہ حلق سے پھیرے ہوئے خنجر تو نہیں ہے

تعالی اللہ ترش کر یہ ہوئی توقیر پتھر کی   خدا نے کعبہ بن بیٹھی ہر اک تصویر پتھر کی
نگاہِ غور کر حسنِ بتاں پر چشمِ خود بیں سے
خدا کی شان دکھلاتی ہے ہر تصویر پتھر کی

مسطورۂ بالا اشعار دیوانِ اوّل سخنِ بے مثل سے کہے ہیں جو ۱۲۹۲ھ میں چھپا تھا اور اب کمیاب ہے سچ تو یہ ہے کہ ملک الشعرا میر تقی میر کے یہاں بہتر نشتر تھے اور پیر و میر کے پاس ہزاروں تیر ایسے ہیں جو جگر میں پیوست ہو جاتے ہیں۔ اس پر طرّہ یہ ہے کہ بازاری زبان سے پرہیز کیا ہے۔

عرش کی نسبت یہ کہا جاتا ہے کہ ان کے شاگردوں کی تعداد بہت کم ہے مگر یہ بات ہے کہ اس وقت میں لوگ بہت سے شاگرد کر لینا عیب سمجھتے تھے۔ خود میر کے شاگرد بہت کم تھے ہاں جس کو شاگرد کرتے تھے۔ پہلے اس کی طبیعت کا اندازہ، دلی شوق، دریافت کرتے تھے اور اس بات کو پرکھنے کی کوشش کرتے تھے کہ یہ خلقی شاعر ہے کہ نہیں پھر اس کو اپنی طرح نامور اور مستند بنانے کی کوشش کرتے تھے۔ اور اولاد سے کم نہ سمجھتے تھے۔ شاگرد بھی اُستاد کی خدمت کرنا اپنا فخر سمجھتے تھے۔

آج کل لوگ بے فن حاصل کئے شاعر بن بیٹھتے ہیں اور عیوبِ شاعری سے پرہیز نہیں کرتے وہ اہلِ فن کی نظر میں ہمیشہ ذلیل رہتے ہیں۔ بعض بد اصل اپنے استاد سے منحرف ہو کر خود استاد بن بیٹھتے ہیں اور دعوے بے دلیل کرتے ہیں اور فنِ شعر میں غلط ترمیم و تنسیخ کر کے شہرت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اُن کا کلام مقبول نہیں ہوتا اور احسان فراموشی چند روزہ نمود کے بعد ذلیل کرتی ہے۔

اس لئے اگلے شعرا کا قول تھا کہ شریف آدمی کو یہ فن سیکھنا چاہیئے۔

شیخ صاحب نے ابتدا سے عرش سے اصلاح لی اور مرتے مرتے استاد کا دم بھرتے رہے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا ہر شعر دل میں اثر کرتا ہے اور یہی نہیں کہ صرف غزل گو شاعر ہوں بلکہ شاعری کے جملہ اصناف پر قادر تھے۔ غزل کے بعد نظم اور صنعتِ سخن بھی پیش کرتے ہیں۔

رباعی

غرقاب ہے فرط غم سے چشم گرداب ماتم کی بچھائے صف ہیں موجیں بر آب
یہ ڈوب موا ہے کون بیکس یا رب دریا میں جو پھوٹ پھوٹ کے روتے ہیں حباب

جس روز کہ رخصت شہ والا تھی بیمار مدینہ پہ عجب ایذا تھی
بچپن میں بچھڑنا پدر و مادر سے صغرا کے لئے قیامت کبرا تھی

دنیا میں خوشی جو کوئی دم ہوتی ہے افزائش رنج و غم بہم ہوتی ہے
ہے شاد ترقی و تنزل توام بڑھتا ہے جو سن تو عمر کم ہوتی ہے

قطعات

ظاہر از زہد پہ دیتے دم ہیں مے کشی کرتے نہاں بے غم ہیں
کھل گیا پیتے ہیں پوشیدہ شراب شیخ و زاہد بھی چھپے رستم ہیں

آبلوں کو ہوئی خار دشت سے جو یاس بولی ... کہ نہیں کیا ہے ہراس
تو ہی منصف ہو یہ کانٹوں نے کہا اوس چاٹے نہیں بجھتی ہے پیاس

تاریخ عقد مرزا نصیر الدین حیدر شاہ اودھ

حیدر اعظم شہنشاہ اودھ کد خدا شد چو بعد زینت دیں
مصرع سال ہمایوں گوید شد قران قمر و سعدین
۱۲ ۵ ۴۹

تاریخ ختنہ

بنو نواب اسد علی خاں ختنوں ہوا نور دیدہ
گلچین بہار بہر تاریخ گلچین از شاخ گل بریدہ
۱۲ ۵ ۲

خمسہ بر غزل عرش مرحوم

سنبلیں دو چشم سیہ نرگس بکھر کے لالہ رخسار بت عہد شکن تیرے کے
گلبدن رو کش نسرین و سمن تیرے کے سرو قد غیرت صد غنچہ دہن تیرے کے
تیرے میں نظر آتے ہیں چمن تیرے کے

یہ برومندی روزی ہے بے عالم خرسند — سیر ہوتے ہیں شب و روز چرند و پرند
سنگدل کا بھی آذوقہ کبھی ہوتا نہیں بند — آسیا کہتی ہے ہر صبح یہ آواز بلند

رزق سے بھرتا ہے رزاق دہن پتھر کے

مال و دولت پہ نہ مغرور جہاں میں ہو کوئی — ہو گیا خاک جو قاروں نے امارت کی لی
بے ثباتی میں ہر انسان ہے تصویر گلی — سو مٹی میں مل جائے گی آخر مٹی

قصر سنگیں سے نہیں خانۂ تن پتھر کے

شاد کو یاد جو آتا ہے شباب اپنا عرش — وہ ضعیفی میں ہے ہر بار یہی کہتا عرش
نوجوانی میں تو کل زور کئے کیا کیا عرش — پھول اب رعشۂ پیری سے نہیں اٹھتا عرش

تولتے تھے کبھی ان ہاتھوں سے من پتھر کے

قصاید

قصیدہ در مدح شہزادہ برجیس قدر بہادر

ہوئی جو برہم بیما شکن کو خواہش زر — اودھ کے شاہ کا عیسائیوں نے لوٹا گھر
لٹا یہ مال کہ خاک اڑ گئی خزانے میں — بجائے درہم و دینار رہ گئے پتھر
گرے پڑے ہوئے ڈھیر جہاں جواہر تھے — وہاں نہ پوت کا چھلا رہا کہاں زیور
اک اہلکار جواری کی بد قماشی سے — تمام گنجینۂ شاہی کا ہو گیا ابتر

ٹپک رہی در و دیوار سے اداسی ہے
برس رہی ہے خرابی ہر اک عمارت پہ

شیخ صاحب کی شاعری کا اتنا مختصر نمونہ مشتے از خروارے سمجھنا چاہئے۔ ہر غزل میں یہی لطف ہے ہر شعر میں یہی مزا ہے حقیقت میں یہ شاعری نہ تھی سحر حلال کہیئے۔

صفیر بلگرامی

زبان کی خدمت کرنے والوں کے نام دنیا کے صفحات سے بہت جلد مٹ رہے ہیں۔ انہیں میں ایک سید فرزند احمد صفیر بلگرامی ہیں، جن کی خدمات کو بھلا دینا بڑا ستم ہے۔ میر صاحب نے ابتدائی سن سے اردو زبان کی خدمت کی۔ اور بہت سی کتابیں تصنیف کر کے خود چھپوائیں اور یورپ میں زبان کی خدمت کا شوق پیدا کیا۔ ان کی ولادت ۱۲۴۹ھ میں ہوئی۔ اپنے وطن بلگرام میں بہت تھوڑا قیام کیا۔ یہ بہت صغیر سن تھے کہ ان کے آباؤ اجداد وطن چھوڑ کر غریب الوطن ہوئے۔ اور آرہ ضلع شاہ آباد میں تشریف لائے۔ ناچار ان کا قیام بھی آرہ محلہ بھاٹک سادات میں ہوا۔ صفیر مرحوم کا مذہب اثنا عشری تھا اور بعض کا قول ہے یہ تالی شیعہ تھے۔ جب ذرا سن شعور کو پہنچے لکھنے پڑھنے کا شوق ہوا۔ پندرہ برس کی عمر میں شعر کہنے لگے۔ ان کی تعلیم فارسی کی درسیات تک ہوئی تھی۔ جو کچھ نظم کرتے تھے پوشیدہ رکھتے تھے۔ کسی کو دکھاتے نہ تھے۔ آخر دو تین سال کے بعد سید محمد مہدی خبیر سے اصلاح لینا شروع کی۔ جب کچھ کچھ شعر و سخن کا مزا آنے لگا۔ اور زبان کا لطف حاصل ہوا۔ تو شیخ امان علی سحر لکھنوی شاگرد رشید مرزا فتح الدولہ برق کی خدمت میں شاگردی کی درخواست کی۔ اور غزل اصلاح کے لئے بھیجی۔ شیخ امان علی سحر زبان اور محاورات میں مشہور زمانہ تھے۔ اس وقت تمام شہر میں ان کی شہرت تھی۔ صفیر کی شاگردی کی درخواست کو شرف قبول بخشا۔ بہت دنوں تک اصلاح لیتے رہے۔ آخر مرثیہ گوئی کا شوق پیدا ہوا۔ مرزا دبیر کی خدمت میں ایک مرثیہ بھیجکر اصلاح لی۔ اس کے بعد برابر مراثی لکھتے تھے۔ اتنے میں غدر کا ہنگامہ ہوا۔ لوگوں کے گھر لوٹے گئے۔ شرفا پریشان و تباہ ہوئے۔ امرا محتاج نان ہوئے۔ سحر نے بھی لکھنؤ چھوڑ کر غربت میں قضا کی۔ خدا جانے کس شہر میں انتقال کیا۔ کچھ پتہ نہ معلوم ہوا۔ صفیر نے بہت کچھ تلاش کی کسی نے خبر نہ دی۔ کچھ زمانے کے بعد پٹنہ میں مرزا صاحب مجلس پڑھنے کے لئے بلائے گئے۔ صفیر بھی ملاقات کو گئے۔ اُستاد کے دیدار سے مشرف ہوئے۔ مرزا صاحب نے بہت الطاف کئے۔ نواب الطاف حسین خاں سے ملاقات ہو گئی۔ صورت قیام نکل آئی۔ تو صفیر نے آرہ کا رہنا کم کیا

پٹنہ میں قیام کیا۔ یہاں شعر و سخن کا بہت چرچا تھا۔ اور لوگ قدر دان سخن تھے۔ یہاں رہکر تین مثنویاں اور پانچ قصے اردو میں لکھے۔ ایک کتاب "رشحات صفیر" تذکیر و تانیث میں تالیف کی۔ ایک تذکرہ "صلوۃ خضر" لکھا۔ غالب مرحوم سے بذریعہ خط و کتابت شرف تلمذ حاصل کیا۔ غالب کے بعد میر غلام حسنین قدر بلگرامی سے اصلاح سخن لی۔ پٹنہ میں ان کے بہت سے شاگرد ہوئے یہ مدعی تھے کہ خواجہ فخر الدین حسن مصنف "سروش سخن" بھی میرے شاگرد ہیں۔ وہ منکر تھے کہ میں ان کی صورت سے بھی واقف نہیں۔ میں تو غالب کا شاگرد ہوں۔ ایسی ایسی بہت سی چوٹیں چلا کیں۔

صفیر نے نثاری کی طرف رخ کیا تو سب سے پہلے بوستان خیال کی اٹھارہ جلدوں کو فارسی سے اردو میں لانا چاہا۔ کچھ جلدیں ترجمہ کیں۔ دو جلدیں اپنے ہاتھ سے کاپی لکھکر اپنے مطبع میں چھپوائیں۔ پہلا دیوان بھی اپنے ہاتھ سے لکھ کر چھپوایا۔ دوسرا دیوان "خمخانۂ صفیر" مطبع کارنامہ لکھنؤ میں چھپا۔

پہلا دیوان مطبع گلشن کشمیر خواجہ باقر علی خاں مالک مطبع کی اجازت سے حاجی حسن علی صاحب لکھنوی کے اہتمام سے پٹنہ میں چھپا۔ یہ دیوان سنہ ۱۲۸۰ھ میں طبع ہوا۔ اس کا نام "صفیر بلبل" رکھا۔ اس کے بعد ایک قصہ روح افزا لکھا تھا جو طبع نہ ہوا۔ صفیر بہت پر گو تھے۔ "پیام یار" میں ان کی غزلیں برابر چھپتی رہیں۔ اور آرہ میں اکثر لوگ ان کے شاگرد ہوئے۔ تہر آروی قمر آروی وغیرہ ان کے شاگرد تھے۔ قمر نہایت خوش گو اور زندہ دل آدمی تھے۔ سید شاہ قمر الدین حیدر نام تھا۔ کچھ عرصہ ہوا انتقال کیا۔

منشی محمد اسمعیل صاحب مختار آرہ نہایت طباع آدمی تھے۔ فنکاری کا بہت شوق تھا۔ صاحب دیوان تھے۔ غرضکہ صفیر کے دم سے شعر و شاعری کا چرچا آرہ میں بہت تھا۔ اور پٹنہ میں بھی لوگوں کو ان کی وجہ سے مذاق سخن ہو گیا تھا۔ اور اچھے اچھے کہنے والے پیدا ہو گئے تھے۔ جو صفیر کو سر مشاعرہ ٹوک دیا کرتے تھے۔ صفیر کے فرزند بھی تھے۔ ان کا حال ہم کو معلوم نہ ہوا۔ ان کے انتقال کے بعد آرہ میں مذاق سخن نہ رہا۔ اب صرف ان کے شاگردوں میں سے ایک سید امیر حسن صاحب نبیرۂ مولوی عبد العزیز صاحب عزیز مرحوم آروی کا دم ہے جو ابھی تک شاعری کا دم بھرتے ہیں۔ اور اچھا کہتے ہیں۔ صفیر کے شاگردوں کے علاوہ آرہ میں اور بھی بہت سے شاعر ہیں۔ حکیم محمد ضمیر الحق صاحب قلق تلمیذ مولانا شمشاد لکھنوی وغیرہ وغیرہ لیکن بات یہ ہے کہ اب کوئی قلمیر

جیسا زبان کی خدمت کرنے والا آرہ میں نہیں ہے جن کے دم سے شاعری کا چرچا رہے۔ غازی پور میں مولانا شمشاد کی ذات غنیمت ہے۔ جو اب تک ہر ایک مشاعرے میں شریک ہوتے ہیں۔ یہی ایک ذریعہ زبان کی خدمت کا ہے۔

صفیر مرحوم اگلی وضع کے آدمی تھے۔ چوگوشیہ ٹوپی پہنتے تھے۔ دراز قد تھے۔ کسی قدر ہکلاتے تھے۔ شعر پڑھنے کا بھی انداز اچھا تھا۔ کلام عاشقانہ ہوتا تھا۔ اور بندش چست۔ چند اشعار درج ہیں:-

جو انان مضامین پر ہے سایہ رب سبحاں کا بنا طغرائے بسم اللہ سے تاج اپنے دیواں کا
الٰہی ہو صفیر خستہ کو حسن قبول ارزاں رہے منظور ارباب نظر ہر شعر دیواں کا

جھکا کر سر کیا جب شانہ ان خوبان پری رو کا مربع بن گیا پیش نظر آئینہ زانو کا
گرہ کیوں اپنی ابرو پر چڑھالی آپ نے صاحب ابھی تقیید سے ناآشنا مطلع تھا ابرو کا
اشاروں میں تمہارے لطف نما ہے سخنداں کا
نہیں تو نکتہ مصرع ہے چشم سخن گو کا

اس وقت میں واو معروف اور مجہول کا ایک غزل میں قافیہ کرنا شعرا میں جائز تھا۔ گر اب ابرو کے ساتھ سخن گو نہیں باندھتے کیونکہ سخن گو کو واو مجہول بولتے ہیں۔

دل صد پارہ وابستہ ہوا زلف چلیپا کا رگ لیلیٰ سے شیرازہ بندھا دیوان سودا کا
لب گویا پہ ان کے خط جو نکلا یہ ہوئی تحقیق محشی کا سودا سے ہوا دیوان گویا کا

چھوڑ دو فکر شاعری تو صفیر شکر عالی نہیں خدا دے گا

"چھوڑ دو" حال کے شعرا نے ترک کر دیا ہے۔ اب شعرا چھوڑنا بولتے ہیں۔

اپنی کشتی کو بچا اے نوح جوش پر آج ہے طوفاں میرا

سب اپنی جان کو روتے ہیں دیکھ کر مردہ کوئی کسی کے لئے چشم نم نہیں کرتا

شراب روح پرور سے مزا ہے زندگانی کا اسی پانی سے ہے نشوونما نخل جوانی کا

کچھ عجیب انداز خلوت رات کی محفل میں تھا   تو ہمارے دل میں تھا اور غیر تیرے دل میں تھا

ہمیشہ ساتھ رہا اس کو دامن تر کا   یہ دل ہے یا کوئی قطرہ ہے اشک شبنم کا

تیرے انجام کا قلق ہے صنم   کاش تو مرد پارسا ہوتا

اس در کا رہنما دل بے کینہ ہو گیا   قبلہ نما مرے لیے آئینہ ہو گیا

آتش گل کو جو بھڑکایا بہار باغ نے   دود اُٹھ کر سرمۂ چشم عنادل ہو گیا

عذر کرتے ہیں تو قصور ہوا   کہہ دو منہ سے کہ رنج دور ہوا

ابر قبلہ سے وہ دھواں دھار بشارت آیا   ساقیا دوڑ کہ پھر موسم عشرت آیا

ختم ہے کبر و غرور اے بت ترسا تجھ پر
کہ تصور میں بھی آیا تو بہ منت آیا

جلوہ اس بت کا جو دیکھا تو خدا یاد آیا   ہم نے بتخانے میں سجدہ پئے معبود کیا

خیال یار میں کب تک تصور رہے گا   خدا نہ کردہ کہیں اپنی آنکھ کھو دے گا

شک ہے تیرے دہن کی کیسی   دھوم ہے اپنے سخن کی کیسی

پھر کس کی یاد پڑی بیٹھے بیٹھے حال مجھے   چلا ہے آپ سے اے ہمنشیں خیال مجھے

تم لاکھ طرح سے بندہ کو دو فریب   لیکن تو خدا کی خدائی نہ جائے گی

تمہاری زلف کا دل سے خیال کیا نکلے   پڑا جو آئینہ میں پھر وہ بال کیا نکلے

اس قدر یار نے نظروں سے گرایا صفیر   اپنی چتونوں میں اپنے کو حیا آتی ہے

ہماری طبع اگر شعر کہنے پر آئے   زمیں پہ عرش کا مضمون بھی اتر آئے

کنشت کے گرد ہوں جو پیاسے بیٹھے ہوئے   قائل نہیں ہوں کباب بھی ساقی بھنے ہوئے

طبع بلند اپنی ہے خود انتخاب دھر
مضمون جتنے پاتے ہیں۔ سارے چھنٹے ہوئے

طور اور موسےٰ کی کہانی اور ہے ان بتوں کی لن ترانی اور ہے

ہم ہیں مجبور اور تم مختار اے بتو! یہ خدا کی قدرت ہے

تبسم سے تکلم سے حیا سے مجھے ارا ہی تو کس کس ادا سے

ایسا شخص جس کی تمام عمر اردو کی خدمت میں صرف ہوئی ہو۔ اس کا اکثر کلام غیر مطبوع پڑا رہے نہایت افسوس کی بات ہے۔ امید ہے کہ ان کے تلامذہ توجہ کرینگے۔

شہنشاہ ظفر

جس طرح انگریزی سلطنت کی برکت سے اردو میں انگریزی الفاظ کثرت سے شامل ہوتے گئے اور اس کو ایک نئی اردو بنا دیا۔ اسی طرح سلطنت مغلیہ کے زمانہ میں فارسی اور عربی کے الفاظ کے شمول نے ہندی زبان کی کایا پلٹ کر دی تھی اور اس ملواں ہندی کا نام "اردو" ہو گیا جو دقت انگریزوں کو اردو حاصل کرنے میں ہوتی ہے اور جس کے لئے وہ کچہریوں کے تمام دفتر روز مرہ اردو سے انگریزی میں بدلتے ہیں یہی تکلیف مغلیہ خاندان کے بادشاہوں کو اردو بولنے میں ہوتی تھی جن کی زبان پر "ٹ" "ڑ" "ڈ" کے حرف اچھی طرح نہ آ سکتے تھے۔ مگر مغلوں نے اپنی رعیت سے ارتباط پیدا کرنے کی غرض سے ہندوستان کی زبان حاصل کرنے میں اپنی عمر کا کثیر حصہ صرف کیا۔ یہاں تک کہ دہلی کے آخری تاجور حضرت محمد سراج الدین بہادر ظفر شاہ اچھی خاصی اردو بولنے پر قادر تھے۔

اردو کے علم ادب میں ان کی تصنیف نے ایک تازہ روح پھونک دی۔ بہادر شاہ مرحوم کے چار موٹے موٹے دیوان تو مطبوعہ موجود ہیں اور خدا جانے اُن کی تصنیف کا کس قدر ذخیرہ غدر کے زمانے میں معرض تلف میں آ گیا ہوگا جن کو دیکھ کر کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ ایک مغل کی تصنیف ہے جس کی مادری زبان ترکی اور فارسی تھی۔

اردو زبان کی ایسی مثال ہم کو کسی انگریز کے کلام سے نہیں مل سکتی۔ بہادر شاہ کی شاعری نے یہ قبولیت حاصل کی کہ وہ اردوئے معلیٰ کے نام سے مشہور ہوئی۔ اور جو لفظ قلعہ معلیٰ کی چار دیواری سے نکلا وہ اردو و علم ادب کے لئے سند ہوا۔ بہادر شاہ کی شاعری میں خصوصیت سے وہ بات ہے۔ جو دہلی کے لئے سرمایۂ ناز ہے یعنی جذبات کا اظہار عام زبان میں۔ اسی وجہ سے ظفر کے کلام میں اثر کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ ذوق کی شاعری کو جس خصوصیت نے چار چاند لگا دیئے۔ وہ ظفر کے کلام میں موجود ہے۔

جی تو چاہتا تھا کہ بہادر شاہ مظلوم مرحوم کے واقعات پر اچھی طرح بحث کرتے اور معزول بادشاہ کے مصائب کا ذکر کر کے ایک مختصر سوانح عمری کا کام لیتے لیکن اردو علم ادب کے ایک

وتبع رسالہ کے واسطے ایسے تذکرے ناظرین کی پیش لبند طبیعت منغص کر دیتے۔ اس لئے ہم نے محض ادبی تعلقات کے بیان پر اکتفا کی حق تو یہ ہے کہ باوجود تمام اشغالِ امورِ سلطنت کے بہادر شاہ کا شعر کہنا اور پھر ایسا کہنا جو مطبوع عام ہو یہ ایک تعجب خیز بات ہے۔

ہند کی رعایا اکبر بادشاہ سے اس بات پر خوش ہے کہ اُس نے اپنا مذہب رعایا کی نذر کر دیا تھا۔ اور اس کو بعض علما نے اس بے نفسی پر دہریہ سمجھ رکھا تھا لیکن بہادر شاہ نے اس سے بھی بڑھکر کام کیا۔ وہ یہ کہ اپنی مادری زبان رعایا کی نذر کر دی اور انہیں کی زبان میں اُن سے بات چیت کرنے کا سبق ہم کو سکھا گئے۔ یہ ظفر کا فیض سلطنت ہے کہ آج تمام مسلمان جن کی مادری زبان فارسی، عربی، پشتو، ترکی سب بے تکلف اردو بولتے ہیں۔ اور ان کی مادری زبان بھی اُردو بن گئی ہے۔

یہ سچ ہے کہ اردو کی بنیاد شاہجہان کے وقت سے پڑ چکی تھی لیکن اس کی تکمیل بہادر شاہ ظفر کے عہد میں ہوئی۔ گویا زبان اردو کا آخری قاصد بہادر شاہ مرحوم تھا جس کی شاعری نے اس ضرورت کو پورا کر دیا۔ اور اس کے بعد کسی اوتار کے جنم لینے کی ضرورت نہ رہی۔ گویا دہلی کا پایۂ تخت اردو کی تکمیل کی غرض سے قائم ہوا تھا۔ جس کو بوجوہ احسن اس نے انجام دیا۔

دہلی کی سلطنت نہیں برباد ہوئی۔ دنیا سے اردو کی بادشاہت اٹھ گئی۔ جب تک دنیا میں اردو کا نام ہے دہلی کی سلطنت کا چراغ روشن ہے۔ لکھنؤ نے جس قدر وقعت حاصل کی اسی دہلی سے۔ دہلی کے مایۂ ناز شاعر تباہ ہو کر لکھنؤ میں آئے اور لکھنؤ کو باعتبارِ زبان دانی دہلی بنا دیا۔ بقول غالب ؎

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقولِ ناسخ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میرؔ نہیں

میر مرحوم تک قدردانی کا دائرہ محدود نہ تھا۔ بلکہ دہلی کے تمام شعرا کی قدر و منزلت لکھنؤ کے اہلِ کمال نے اسی طرح کی۔ جب یہ قدردہلی کے سرمایۂ ناز شاعر میرزا سوداؔ۔ ؔانشاء، میر سوزؔ، میر تقی۔ نواب طالب علی خاں عیشی وغیرہ دہلی چھوڑ کر لکھنؤ میں آ بسے اور یہاں سے مرکر بھی نہ نکلے۔

بہادر شاہ کا دائرۂ سلطنت آخر میں گو بہت غیر وسیع رہ گیا تھا۔ مگر اس پر بھی اُن کا اردو

زبان کی پرورش کا خیال زمانۂ ولیعہدی سے تھا۔ دہلی کے موجودہ شعراکو جو کہنہ مشق تھے دربار میں حاضر ہونے کی اجازت ملی۔ حکیم ثناء اللہ خاں فراق۔ عبدالرحمن خاں احسان۔ برہان الدین خاں زار۔ حکیم قدرت اللہ خاں قاسم۔ حکیم عزت اللہ خاں عشق۔ میاں شکیب۔ میرزا عظیم عظیم۔ میر قمر الدین منت وغیرہ درباری شاعر مشہور ہوئے۔ بہادر شاہ اپنا کلام شاہ نصیر کو دکھاتے تھے۔ مگر شاہ صاحب تھوڑے زمانے کے بعد دکن چلے گئے۔ شاہ نصیر کی کافی شہرت ہو چکی تھی۔ ان کے بعد اگر کچھ لوگ مانتے تھے تو ذوق کو مانتے تھے۔ شاہ صاحب کے جانے کے بعد ظفر نے ذوق سے اصلاح لی۔ یہ امر کسی قدر غالب کے خلاف طبع ہوا۔ اور اپنے قصائد میں بعض بعض موقع پر اظہار ناراضی کیا لیکن بات یہ ہے کہ اس زمانے میں بعد نصیر ذوق کا طوطی بول رہا تھا۔ اور غالب بیچارے کو کوئی جانتا بھی نہ تھا۔ ولیعہد بہادر جب سریر آرائے سلطنت ہوئے تو استاد کو ملک الشعراء خاقانی ہند کا خطاب دیا۔

ظفر کے کلام پر اس اعتبار سے نظر کی جائے کہ اس میں محاورے کس طرح ادا کئے ہیں روزمرہ کیسا ہے۔ اثر کتنا ہے۔ زبان کس قدر دستنا ہے۔ تو ان کا مثل و نظیر آپ کو نہ ملے گا۔ اس لحاظ سے کہ زبان اور محاورات کے تو یہ بادشاہ تھے جو لفظ قلعہ معلی سے نکلتا وہ شعرا کے لئے سند ہو جاتا۔ ہاں پُرشکوہ الفاظ۔ مضامین بلند۔ تراکیب فارسی۔ مصادر فارسی۔ حروف روابط فارسی سے ان کا کلام خالی تھا۔ تو اس کی ضرورت بھی اردو کی شاعری میں ایسی نہ تھی۔ اور بعض کے نزدیک تو ایسی شاعری مخل فصاحت ہے۔ ہاں مضامین بلند کی ضرور وقعت قدر کرتی ہے۔ مگر جب تک وہ الفاظ فصیح زبان میں ادا نہ ہوں اچھے نہیں معلوم ہوتے۔

اس پر لطف یہ ہے کہ ظفر نے مشکل زمینوں میں جو غزلیں کہی ہیں ان کو بھی عام محاورے اور سادہ لفظوں سے پانی کر دیا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

اس سے ہے غریبوں کی تسلی کہ اجل نے
مفلس کو جو مارا تو نہ زردار بھی چھوڑا

اس شعر میں یہ بات دیکھنے کے قابل ہے کہ ردیف کتنی محاورے اور زبان میں ڈوبی ہوئی ہے۔

جا سکے گلشن تلک اڑ کر نہ ہم بے بال و پر — ہم نے اے صبا دیکھا پایا رہائی میں مزا
بیٹھا ہے مہندی لگا کر اپنے دست و پا میں تو — آج ہے اے شوخ تجھ سے ہاتھا پائی میں مزا

پہلے شعر میں کتنی نازک بات پوشیدہ ہے یعنی بے بال و پری کا نتیجہ۔

دوسرا شعر شوخی سے لبریز ہے۔ شاعر کی چلبلی طبیعت نے ایک نئی بات پیدا کی ہے۔ کہ جب حاملے ہوا اس وقت دست درازی میں مزا ہے۔ وہ مجبور ہے معذور مختار ہیں۔ ہاتھا پائی ایک فصیح محاورہ ہے جو دست درازی کے معنی پر مستعمل ہے۔

نہیں جاتا کسی سے وہ مرض ہے جو نصیبوں کا
نہ قائل ہوں دوا کا میں نہ قائل ہوں طبیبوں کا

نصیبوں کا مرض یعنی قسمت کی لکھی ہوئی بیماری۔

دیا جو اشک نے شورا پہ سرِ تنک ہیں
تو توشکاں اُسے ہم نے مثالِ دوغ کیا

شکوہِ الفاظ قابلِ دید ہے۔

جواب صاف تو لاتا اگر نہ لاتا خط
لکھا نصیب کا جو نامہ بر سے کچھ نہ ہوا

کتنا صاف اور سادہ مضمون ہے۔

کیوں ڈھونڈتے ہو زخمِ دلِ بیتاب کا پھاہا
بھیگا ہوا چپکے گا نہ بے آب کا پھاہا

وہ زخمی شمشیرِ حوادث ہوں کہ جس کو آئے ہے نظر چرخ بھی زہراب کا پھاہا
پر درد کو تسکین سے غرض کیا کہ سرِ زخم یکساں ہے گزی کا کہ ہو کمخواب کا پھاہا

چھوڑا سا نہ دل چھوٹ بہے کیوں ظفر اسیر
ہے مرہمِ غم خواریِ احباب کا پھاہا

ایسی مشکل ردیف میں ظفر کے بعد دہلی میں کسی نے اس زمین میں قافیہ پیمائی نہیں کی۔ مضمون آفرینی اور شکوہِ الفاظ قابلِ دید ہے۔

کچھ جواب اس نے جو خط کا دیا اُلٹا سیدھا
نامہ بر نے مرے رستہ لیا گھر کا سیدھا

اصل لفظ تو راستہ ہے مگر رستہ اردو میں زیادہ فصیح ہے۔ گھر کا سیدھا رستہ لیا۔ محاورہ ہے جو اس جگہ بہت موقع سے صرف ہوا ہے حقیقت میں کلام الملوک ملوک الکلام ہے ظفر کی

زبانِ فیض ترجمان سے جو کچھ نکلتا ہے۔ وہ زبان کے لئے سند ہے۔

مرا گھر تو نے کیوں چھوڑا اگر گھر تھا تو اس جا تھا
مکاں پردے کا اے پردہ نشیں گر تھا تو اس جا تھا

کتنی مشکل ردیف میں تصوف کے مسئلے کو طے کیا ہے۔

وہ تھا جو مہر و مہ کے لئے آفتابِ نور
سب تیرے ایک جلوہ دکھانے سے اُڑ گیا

یہ بھی ایک اہل اللہ کے مذاق کا شعر ہے۔

تھا میرے اور اُس کے جو پردہ سا اک ظفر
یکبارگی دوئی کے اٹھانے سے اُٹھ گیا

کتنا وحدت میں میں ڈوبا ہوا مقطع ہے۔

بے لکھے خط جو گیا نامہ و پیغام طلب　　　کاہلی لکھنے کو تھی آپ ہیں آرام طلب

سر نامہ میرے نام کا اور خط رقیب کا　　　ظالم ترے ستم کے ہیں عنوان عجب عجب

نفس کی ہے یہ جو آمد و شد لغو کر سیر اسکی غافل
یہ دیکھ طے ہو رہی ہے کیونکر رہِ وجود و عدم عجب

جلا گیا شبِ غم دل کا داغ صبح کے وقت　　　وگرنہ ہوتے ہیں گل سب چراغ صبح کے وقت

دل ہے گلدستان کا صفائی ہو کس طرح　　　بخت اپنے نارسا ہیں رسائی ہو کس طرح

ہے سفر درپیش اس بستان سرائے غنچہ وار　　　باندھ تو رختِ سفر غافل سفر سے پیشتر

کرے ہے نکہتِ گل دمبدم چمن میں سفر　　　ہمیشہ خانہ بدوشوں کو ہے وطن میں سفر

کیونکر نہ خاکسار رہیں اہلِ کیں سے دور　　　دیکھو زمیں فلک سے فلک ہو زمیں سے دور

قیام ارنڈ کی جڑ سے بھی کم ہے دنیا کو　　　کچھ اس کی اصل نہیں ہے گر فنا کی جڑ

واللہ بتوں نے ہم سے یاری کی ترک پر ہم نے نہ اُن کی پاسداری کی ترک

جانِ عالم ہو، کوئی کیونکر جدا رکھے تمہیں زندگی سے ہے اسے تجھ سے جدا رکھتے نہیں

صنم جیسا کہ تو نام خدا ہے دلربائی میں نہ ہوگا دلربا ایسا کوئی ساری خدائی میں

جلایا آپ ہم نے ضبط کرکے آہِ سوزاں کو جگر کو سینے کو پہلو کو دل کو جسم کو جاں کو
ہمیشہ کنجِ تنہائی میں ہم مونس سمجھتے ہیں الم کو درد کو حسرت کو بیتابی کو حرماں کو
بنایا اے ظفر خالق نے کب انساں سے بہتر
ملک کو دیو کو جن کو پری کو حور و غلماں کو

بے پڑھے خط نہ مرا تیوری پہ بل ڈالو بیٹھے پڑھ پڑھ لو اسے پھر پھاڑ کے ڈال ڈالو

دل و جاں دین و ایماں ہے جو لینا ہو صنم لے لو کروں گا عذر دینے میں نہیں مجھ سے قسم لے لو
تم آئے عین گرمی میں نکل کر دل سے اے اشکو کوئی دم نخلِ مژگاں کے ذرا سایہ میں دم لے لو
یہی ہے حضرتِ دل عشق کے بازار میں سودا اگر لیتے ہو اپنے واسطے تم مول غم لے لو
نہیں ہے اعتبار ان کا وہیں کہہ کر مکر جاتے
نوشتے اُن کی باتوں کے ظفر تم کیسے قلم لے لو

یہ قصہ وہ نہیں تم جس کو قصہ خواں سے سنو مرے فسانۂ غم کو مری زباں سے سنو

نہیں معلوم ظفر اُن سے ہوئیں کیا باتیں چپکے بیٹھے ہوئے تم آج خفا سے کچھ ہو

کہتا ہے تم سے کون کہ خنجر بکف نہ ہو پر حق جاں نثارِ محبت تلف نہ ہو
اللہ ہے ہمارا طرفدار اے ظفر کوئی اگر نہیں ہے ہماری طرف نہ ہو

ہے جہاں میں خواہشِ نام و نشاں بے فائدہ سینہ کاوی ہے نگیں کی طرح یاں سب بے فائدہ

واں رسائی نہیں تو پھر کیا ہے یہ جدائی نہیں تو پھر کیا ہے
ہو ملاقات تو صفائی ہے اور صفائی نہیں تو پھر کیا ہے

نرگس قابِ اغتسیا ہونا بے حیائی نہیں تو پھر کیا ہے

اللہ اللہ رے بتوں کا غرور
خدائی نہیں تو پھر کیا ہے

بہکانے والے آپ کے سب یار بن گئے سمجھانے والے مفت گنہگار بن گئے

ہشیار رہنا چاہیئے یاروں سے اے ظفر
ہیں یار اس زمانے کے عیار بن گئے

کس کی ابرو کی وہاں تصویر کھنچکر رہ گئی سنتے ہیں بھوپال میں شمشیر کھنچکر رہ گئی

لوگ اس مطلع کو بہادر شاہ کی کرامات پر محمول کرتے ہیں اور کہتے ہیں اس مطلع کے چند روز بعد خبر آئی تھی کہ بھوپال میں تلوار چل گئی ۔ اور بہت کچھ کشت و خون ہوا۔

کیا خرد بدخواہ کیا تدبیر دشمن بن گئی میرے حق میں تو مری تقدیر دشمن بنگئی

خود ہی پہ تکیہ نہ بالکل کرے خدا پہ بھی انساں توکل کرے

کروں کم نگاہی کا گر میں گلہ
تو پھر اور بھی وہ تغافل کرے

لکھ کے حال اپنا انہیں ہیہات اپنے ہاتھ سے کھوئی ہم نے آپ اپنی بات اپنے ہاتھ سے

جفا کش اور ستم پرور نہ ہم جیسے نہ تم جیسے بلاکش اور غارتگر نہ ہم جیسے نہ تم جیسے

عجب روش سے انہیں ہم گلے لگا کے ہنسے کہ گل تمام گلستاں میں کھلکھلا کے ہنسے

یہ کہہ کے غنچے سے آتی ہے تیرے منہ سے بو
چمن میں سامنے اس گل کے منہ چھپا کے ہنسے

گلشن میں جب ادا سے وہ رنگیں ادا ہنسے غنچے کا منہ ہے کیا کہ جو پھر اسے صبا ہنسے

یہ کیا ستم ہے ہم کہیں رو رو کے حال دل
منہ اپنا پھیر پھیر کے وہ بے وفا ہنسے

ملے نہ خسرو کو شیریں کوہکن ناکام رہ جائے بعید اے عشق ہے یہ بات انصاف و عدالت سے

چھوڑ کر یار ہیں سب ہو گئے چلتے پھرتے — اپنی تنہائی پہ ہم ہاتھ ہیں سلتے پھرتے

بلائیں زلفِ جاناں کی اگر لیتے تو ہم لیتے — بلا یہ کون لیتا جان پر لیتے تو ہم لیتے
اُسے کیا کام تھا وہ بے خبر کیوں پوچھتا پھرتا — دلِ گم گشتہ کی اپنے خبر لیتے تو ہم لیتے
لگایا جام نے ہونٹوں سے اُسکے ہمکو رشک آیا
کہ بوسہ اُس کے لب کا اے ظفر لیتے تو ہم لیتے

کہاں ہیں وہ اگلی ملاقات والے — عنایات والے مدارات والے
خوشا اوقات دل کے خرابات والے — ہمیشہ رہے خوش اس اوقات والے

ظفر جس دم غمِ دوری سے دل مغموم ہوتا ہے — مزا دل کے لگانے کا ہمیں معلوم ہوتا ہے
حباب اتنی نہ باندھا کر ہوا میں تو نمود اپنی — کوئی دم میں نشاں تک بھی ترا معدوم ہوتا ہے

ہم رہیں ساقی رہے اور دورِ پیمانہ رہے — حشر تک یارب یونہی آباد میخانہ رہے

جہاں ویرانہ ہے پہلے کبھی آباد گھر یاں تھے — شغال اب ہیں جہاں رہتے کبھی بستے بشر یاں تھے
ظفر احوالِ عالم کا کبھی کچھ ہے کبھی کچھ ہے
کہ کیا کیا رنگ اب ہیں اور کیا کیا پیشتر یاں تھے

گالیوں کا ہم پہ چلنا اور چھڑا اصاف ہے — کیا زباں ہے آپ کی کیا روزمرّہ صاف ہے

کہوں کیا ماجرائے بے ثباتِ نقشِ ہستی کا — مٹا جاتا ہے یوں گویا کہ یہ پانی پہ لکھا ہے

مقدور کس کو حمدِ خدائے جلیل کا — اسجا پہ بے زباں ہے دہنِ قالِ وقیل کا
پانی پہ اُس نے راہبری کی کلیم کی — آتش میں وہ ہوا چمن آرا خلیل کا

کسی نے اُس کو سمجھایا تو ہوتا   کوئی یاں تک اُسے لایا تو ہوتا

دل کا کچھ کام نہ تجھ سے بتِ پُر فن نکلا   دوست جانا تھا تجھے جان کا دشمن نکلا

یا مجھے افسرِ شاہانہ بنایا ہوتا   یا مرا تاج گدایانہ بنایا ہوتا

کوچے میں ترے تنہا ہر شب مجھے ہو جانا   دو چار گھڑی اپنا دل کھول کے رو جانا

وائے اے بے خبرو تم کو خبر خاک نہیں   کہ سفر سر پہ ہے سامانِ سفر خاک نہیں
برسوں گزرے کہ ہوئی خاک ہماری برباد   اب تو اس کوچے میں اے بادِ سحر خاک نہیں
خاک میں آنسوؤں کو میرے ملاتا کیا ہے   تجھ کو اے دیدۂ تر قدرِ گہر خاک نہیں
ہم سے ظاہر میں ہوئے صاف تو کیا ہوتا ہے
دل تو صاف ان کا ہوا ہم سے ظفر خاک نہیں

پاک شے کچھ اور ہے میں قطرۂ ناپاک ہوں   بولنا کیا جانے کیا ہوں میں تو مشتِ خاک ہوں

بھری ہے دل میں جو حسرت کہوں تو کس سے کہوں   سنے ہے کون مصیبت کہوں تو کس سے کہوں

کسی کو دیکھتا اپنا نہیں حقیقت میں   ظفر میں اپنی حقیقت کہوں تو کس سے کہوں

جو دل کو دل کی خبر واں نہیں تو یاں بھی نہیں   بدل محبت اگر واں نہیں تو یاں بھی نہیں

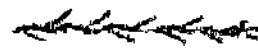
دردِ دل دردآشنا جانے   اور بیدرد کوئی کیا جانے

ابھی چشم و چراغِ دہلی زندگی عیش و عشرت میں بسر کر رہا تھا کہ سیاہ وقت رنگ لائی اور غریب کو قیدِ فرنگ نصیب ہوئی۔ بیٹے قتل ہوئے۔ خاندان تباہ ہوا۔ ایک لاکھ روپیہ ماہوار وظیفہ پر بسر ہوا جس کے اضافے کی تجویز ہو رہی تھی کہ غدر کا ہولناک واقعہ پیش آیا۔ غریب بادشاہ اور بھی زیادہ مصیبت میں مبتلا ہو گئے۔ قید کی حالت میں رنگون بھیج دیئے گئے۔ اور اسی غربت میں سفرِ آخرت اختیار کیا۔ آج بہادر شاہ کی حکومت ہے نہ دولت۔ اولاد ہے تو وہ اپنی مصیبت میں مبتلا ہے۔ بہادر شاہ کو دنیا سے رخصت ہوئے پچاس برس سے زیادہ

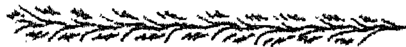
ہو چکے مگر ان کی علم ادب کی خدمت نے ان کو آج تک زندہ رکھا اور ہم ان کا دیوان دیکھ کر اُن سے دل کھول کر باتیں کر لیتے ہیں۔ اور وہ غریب اپنی مصیبت کی کہانی دُہرا دیتے ہیں۔ اسی لئے شعر کو اولاد معنوی کہتے ہیں۔

دنیا میں جب تک زبان اردو کے قدردان موجود رہیں گے۔ جب چاہیں گے ظفر سے وہ دو باتیں کریں گے۔

آہ! اے غم کیش ظفر! آہ! اے دہلی کی آخری یادگار!! دنیا میں جس قدر عیش تو نے اٹھایا تھا۔ اس سے زیادہ تجکو مصیبت جھیلنا پڑی۔ آخر خاک رنگون تجکو کشاں کشاں لے گئی جہاں آج تیری قبر کا نشان تک نہ باقی رہا۔ اب کوئی فاتحہ پڑھے۔ تو کہاں؟ اور دو پھول چڑھائے تو کس جگہ۔ اے پھولوں کی سیج پر کروٹیں بدلنے والے بادشاہ! آج تو ایک ایسے تاریک مکان میں سو رہا ہے۔ جہاں نہ مسہری ہے نہ چھپر کھٹ۔ خاک کا بچھونا۔ خاک کا اوڑھنا۔ خاک کا تکیہ ہے۔ مگر گھبرا نہیں۔ بہت جلد تجھے ان مصیبتوں سے نجات ملنے والی ہے اور دائمی عیش و مسرت کا دروازہ تیرے واسطے کھلنے والا ہے۔ فقط ؛







جناب عارف مرحوم

سید علی محمد صاحب عارف مرحوم ولد سید محمد حیدر صاحب مرحوم لکھنوی غدر کے دو برس کے بعد سنہ ۱۸۵۹ء مطابق سنہ ۱۲۷۵ھ میں چوبداری محلہ سبزی منڈی لکھنو میں پیدا ہوئے۔ اور فارسی کی درسیات کی تحصیل اپنے نانا میر خورشید علی نفیس سے کی۔ میر خورشید علی نفیس میر انیس کے فرزند تھے اور ان کی دو اولادیں تھیں۔ ایک دولھا صاحب عروج اور ایک لڑکی۔ میر صاحب اپنی لڑکی کو بہت چاہتے تھے۔ اس لئے بعد عقد بھی ان کو اپنے ساتھ رکھا۔ اور نواسے کی تربیت بھی خود کی۔ درسیات عربی کی تحصیل جناب عارف نے ملا محمد طاہر مرحوم سے کی اور آغاز شباب میں شاعری کا شوق دامنگیر ہوا۔ پہلے غزل گوئی کی مشق کی۔ مولوی مہدی حسن صاحب ماہر کے مشاعروں میں شریک ہوتے اور سید اصغر حسین صاحب فاخر کے مشاعروں میں تشریف لے جاتے تھے۔ غزل میں شکوہ الفاظ کا بھی خیال رکھتے تھے۔ گفتگو میں بھی فارسی عربی الفاظ کی کثرت تھی۔ میر نفیس مرحوم کی طرح ان کو بھی ورزش کا شوق تھا۔ دوہرا بدن گورا رنگ گول چہرہ ڈاڑھی منڈی ہوئی بازوؤں پر جوشن بندھے ہوئے۔ چہرے پر کچھ سیتلا کے داغ دراز قد۔ صورت اور ڈیل ڈول میں اپنے نانا سے بہت مشابہ تھے بات آہستہ کرتے تھے۔ اور کسی قدر کم گو تھے۔ چوگوشیہ ٹوپی نیچی چولی کا انگرکھا باریک تنزیب کا اور نیچے باریک جالی کا کرتا۔

عارف مرحوم کی تربیت میر نفیس مرحوم کے متعلق تھی۔ اس سبب سے ان میں تمام خوبیاں خاندان انیس کی مجتمع تھیں۔ ان کے والد میر محمد حیدر صاحب ایک شریف غیر معروف آدمی تھے اس سے ان کے حالات نہ معلوم ہو سکے۔ وہ مرثیہ گو اور شاعر نہ تھے۔ اور اتنی بضاعت نہ رکھتے تھے کہ اپنے لڑکوں کی پرورش کریں۔ اس لئے ان کی پرورش میر نفیس کے متعلق تھی۔ اور یہی سبب تھا کہ عارف تمام خوبیوں میں میر نفیس کے نقش ثانی تھے۔ جب مرثیہ کہنے لگے۔ تو اس پر میر نفیس مرحوم نے بہت توجہ سے اصلاح دی۔ ماہ صفر کی ۲۰ تاریخ کی مجلس محلہ نجاری ٹولہ مکان شیخ علی عباس صاحب وکیل میں اپنا تصنیف مرثیہ ہر سال پڑھتے تھے۔ سامعین کا بہت ہجوم ہوتا تھا۔ پڑھنے کا انداز بہت اچھا تھا۔

علمی استعداد نے انکو روسائے شہر کی نظر میں معزز بنا رکھا تھا۔ بعد انتقال میر نفیس جناب راجہ علی محمد خاں بہادر بالقابہ والئی محمود آباد آپکے شاگرد ہوئے اور ایکسو پچاس روپیہ ماہوار تنخواہ مقرر کی سواری کیواسطے بگھی مرحمت ہوئی۔ حاضری اور پابندی اوقات معاف تھی ساتھ ہی جب راجہ صاحب لکھنؤ میں ہوتے تھے تو آپ روزانہ بازوقات کو تشریف لیجاتے تھے۔ حد کے خلیق اور ملنسار تھے جب سے مرثیہ کہنا شروع کیا تھا مشاعروں کی شرکت کم کر دی تھی مگر خاص خاص مشاعروں میں مجبوراً شریک ہوتے تھے۔

چنانچہ جناب حامد علی خاں بیرسٹر نے جو عظیم الشان مشاعرہ کیا تھا اسمیں آپ بھی تشریف لائے تھے اور تا اختتام مشاعرہ میں شریک رہے۔

آپ کی سات اولادیں ماشاء اللہ بقید حیات ہیں۔ سب سے بڑے صاحبزادے سید ظفر حسن صاحب فائق۔ دوسرے سید ہادی حسن صاحب لائق تیسرے سید یوسف حسن صاحب اور چار لڑکیاں ہیں۔

۳۰ ذی الحجہ ۱۳۴۲ھ وقت سحر میر نفیس مرحوم کی مجلس فاتحہ خوانی میں مرثیہ پڑھنے بگھی پر سوار ہو کر سید خورشید حسین عرف دولہا صاحب عروج کے مکان پر جا رہے تھے۔ وکٹوریہ اسٹریٹ (دروازے کے قریب) پہنچکر دفعۃً قلب میں شدید درد اٹھا بگھی روک کر اعزا نے مکان پر واپس لانا چاہا۔ کٹرہ حسید حسن خاں میں پہنچکر حالت زیادہ متغیر ہوئی۔ مجبوراً ایک حکیم صاحب کے مطب میں (جو وہیں واقع تھا) لیجاکر لٹا دیا۔ ابھی فکر علاج میں تھے کہ روح پرواز کر گئی۔ اسکے بعد میت گھر میں لائی گئی۔ ان کی عمر صرف ستاون برس کی تھی۔ نہایت قوی الجثہ تھے آپ کی وفات سے تمام شہر میں تہلکہ پڑ گیا۔ مرحوم میں اخلاقی خوبیاں بہت تھیں۔

انتخاب کلام

رباعیات

بینا ہونا نظر پہ موقوف نہیں
نالہ اپنا اثر پہ موقوف نہیں
ممکن ہے شباب میں بھی غم پیری کا
ٹھنڈی آہیں سحر پہ موقوف نہیں

ایضاً

پیری اسباب زیست سب لوٹ چکی
اک آس جوانی کی جو تھی ٹوٹ چکی
کہتے ہیں زبان حال سے موئے سفید
اب رات کہاں رہی کرن پھوٹ چکی

ایضاً

ہم وہ ہیں نہ وہ شباب کی باتیں ہیں
کچھ ہیں بھی تو انقلاب کی باتیں ہیں
پیری میں جوانی کا بیاں اے عارف
کچھ ہوش میں آؤ خواب کی باتیں ہیں

در شانِ باری

ذرے میں ضیا مہر کی پیدا کر دے
ادنیٰ کو وقار دے کے اعلیٰ کر دے

کچھ وسعتِ رحمت کی نہیں حد یا رب
تو چاہے تو اک قطرے کو دریا کر دے

تفاخرِ شاعرانہ

افضل ہیں جہاں کے سخنور مجھ سے
مخفی نہیں پر کسی کے جوہر مجھ سے

چھپ جائے گا اگر خاک زمانہ پہ ہوں
ذرے آئیں گے ہاتھ گستر مجھ سے

انتخاب سلام

جو دور اندیش ہیں دنیا میں کب وہ گھر بناتے ہیں
مکان مدارج سر در خلد میں جا کر بناتے ہیں

عمارت کس لئے دنیا میں اہلِ زر بناتے ہیں
جو عاقل ہیں سرا میں بھی کہیں وہ گھر بناتے ہیں

رضا بچوں نے جب مانگی تو زینب نے کہا شہ نے
غضب کی اتقوا باتیں یہ مہ انور بناتے ہیں

جنہیں عقلِ سلیم اللہ نے دی ہے زمانے میں
دلِ دشمن میں بھی وہ دوستی سے گھر بناتے ہیں

غمِ شبیر میں کوئی آنسو جو لب تک آ گیا ڈھل کے
کہا تسنیم سے آنکھوں نے یوں کوثر بناتے ہیں

ٹپک پڑتے ہیں آنسو یاد کر کے حال عابد کا
لرز جاتے ہیں جب زنجیر آہنگر بناتے ہیں

نجف کے میکدے کی آرزو ہیں مر کے بھی دیکھیں
ہماری خاک سے کب کاسہ گر ساغر بناتے ہیں

بہت بیتاب تیغِ مرتضیٰ ہے رن میں چلنے کو
مگر شبیر ابھی قبرِ علی اصغر بناتے ہیں

صدا یہ ہاتف آتی ہے مزارِ شاہِ عالی سے
خطا کرتے ہیں راہِ سیل میں جو گھر بناتے ہیں

سرشکِ خونِ غم سرور میں ٹپکاتے ہیں اپنا
ہم ان مہروں سے بخشش کیلئے محضر بناتے ہیں

سخن کے جوہری جو ہیں دیکھا وہ انکو اے عارف
جلا کرتے ہیں اس کو اور یوں گوہر بناتے ہیں

گھوڑے کی تعریف

کیوں قدر کریں اسکی نہ عباس نیک انجام
مثل اس کا نہیں کچھ یونہیں دم سے تا شام

جانثار بھی آفت کا ہے یہ اسپ سبک گام
ہوا رخ کہ لیتی کہیں دم بھر نہیں آرام

شعلے بھی دھواں کرتے ہیں سر اسکی لپک پر
سیماب زمیں پر ہے تو بجلی ہے فلک پر

تلوار کی تعریف

اس تیغ سر افراز پہ پیار آئے نہ کیونکر
ڈوبی ہوئی ہے حسن کے دریا میں سراسر

شفاف چمکتا ہوا آئینہ سا پیکر
یہ جوہر کی الجھی ہوئی زلفیں ہیں کہ جوہر

ہے فرق اگر کچھ تو لقب اس کا ہے
ان کے لئے روغن کی جگہ خونِ عدو ہے

ساقی نامہ

ہاں ساقیٔ مہرو کوئی جام آج پلا پھر
میں بہکا ہوں مشتاق وہ مے شیشے سے لا پھر

دے آئینۂ طبع مصفا کو جلا پھر
ہونٹوں سے چھلکتے ہوئے ساغر کو لگا پھر

تکتا ہوں دعا ساقیٔ کوثر کے خلف کی
جھوٹی بھی اگر مے ہو تو رندانِ نجف کی

انتخاب غزلیات

نہیں ہے سرخ دوپٹا یہ فرق دلبر پر
چڑھا ہے خون کسی بے گناہ کا سر پر

ہوا کی طرح سے لپٹا ہے لیکے اُس سے جواب
نظر نہ پیار سے کیوں کر کروں کبوتر پر

وہ روز وعدے کو دانستہ بھول جاتے ہیں
بدی کی رکھنے کو تہمت مرے مقدر پر

رواں ہوا صفت ماہ صبح وصل وہ مہر
شکن کی طرح پڑا رہ گیا میں بستر پر

خلاف وضع ہے گر غیر کو کروں سجدہ
جبین رکھ کے ترے آستانۂ در پر

ادا سے دیکھتے ہیں جب وہ خاکساروں کو
تو اور ہوتی ہے صیقل نگہ کے خنجر پر

وصال و ہجر کا ساماں بہم رہے لے دل
گلوں کا فرش ہو کانٹوں سمیت بستر پر

نئی خوشی ہے کہ قاتل لقب ہو عالم میں
کبھو تو ہاتھ بھی رکھا نہ جائے خنجر پر

وہ جلد آئینگے یا دیر میں خدا جانے
میں گل بچھاؤں کہ کلیاں بچھاؤں بستر پر

بغیر اذن کسی کو مجالِ دخل نہیں
ہوا بھی جا کے ٹھہر جاتی ہے ترے در پر

سمجھتے ہیں کہ انہیں اب کوئی نہ توڑے گا
بخیل کرتے ہیں مہریں جو کیسۂ زر پر

فروغ نور کا حاصل ترے قدم سے کرے
پڑا ہے سایۂ دیوار اس لئے در پر

جو ناشناس جفا تھے وہ سمجھے خندۂ برق
ہنسی فلک کو جو آئی مرے مقدر پر

زمانہ ٹھوکریں کھا لو اسکے اوج دیتا ہے
اٹھی جو گرد قدم سے تو آئی ہے سر پر

میں زار ہوں مرا دفن و کفن ہے کیا دشوار
ذرا سی خاک کی چٹکی چھڑک دو بستر پر

ہے جان سینے میں یکتا ادا سے دلبر بھی — لگا نہ دے کوئی تہمت کہیں قضا پر بھی
نہ میرے زخموں کو کہیے ذرا دریدہ دہن — حضور تیز زباں آپ کا ہے خنجر بھی
کبھی شکار کیا خود کبھی شکار ہوئی — مری نگاہ ہے شہباز بھی کبوتر بھی
عجب طرح کی کشاکش ہے دل کسے یا رب — ادا بھی دل کی ہے طالب نگاہِ دلبر بھی
مثالِ نکہتِ گل راز ہے محبت کا — کہ میرے دل میں بھی ہے اور دل سے باہر بھی
مرے لہو کے مزے کے رہیں گے مشتاق — زبانِ تیغ کو چاٹا کریں گے پتھر بھی

کھلی ہے آنکھ جو مجھ نیم جاں کی صبحِ فراق
لپٹ کے ہوتا ہے مجھ سے وداع بستر بھی

حسرتِ ہجر نہ ارمانِ وصال اچھا ہے — جس سے بہلا رہے دل کچھ وہ خیال اچھا ہے
کچھ پتا جس کو جہاں میں ہو وہ حال اچھا ہے — جو کبھی جائے نہ سر سے وہ خیال اچھا ہے
طلبِ وصل پہ دیتے جو نہیں کچھ وہ جواب — ہم سمجھتے ہیں کہ انجامِ سوال اچھا ہے
تم نہ صورت مری دیکھو نہ مرا ذکر سنو — نہ میں اچھا ہوں نہ اے جاں مرا حال اچھا ہے
صبحِ رخ نے اُسے کافور کی ٹھنڈک بخشی — اب دلِ سوختۂ برقِ جمال اچھا ہے
ہو ہی جاتی ہے بڑا حسن کے توجہ اُن کو — رشک کی جا ہے کہ مجھ سے مرا حال اچھا ہے

ذکر سودائیوں کا بزم میں آ جاتا ہے جب
کہتے ہیں عارفِ آشفتہ خیال اچھا ہے

منیر مرحوم

سید محمد اسمٰعیل حسین منیر مرحوم ابن سید احمد حسین شاد مرحوم شکوہ آباد کے رہنے والے تھے خود لکھتے ہیں کہ مجھے شاعری کا شوق عنفوان شباب سے تھا لیلیٰ سخن پہ مجنون تھا۔ رات دن اشعار دیکھا کرتا تھا۔ اور خط کے ذریعہ سے استاد ناسخ سے اپنے کلام پر اکثر اصلاح لی۔

پھر ایسا ہوا کہ نواب نظام الدولہ خلف اوسط نواب معتمد الدولہ بہادر کی ملازمت حاصل ہوئی اور زمرہ مصاحبین میں داخل ہو کر کانپور میں آیا۔ اس وقت حضرت مجتہد الشعرا ناسخ کی استادی بھی حاصل ہوئی۔ اس لئے کہ استاد مرحوم کسی تقریب سے نواب امین الدولہ بہادر کے مہمان تھے۔ اور بہت فوائد حاصل ہوئے اور جب ناسخ مرحوم لکھنؤ تشریف لے گئے۔ تو اس دن سے حسب ارشاد نالائق احقر جناب میر علی اوسط رشک کے شاگردوں میں داخل ہوا اور ان کی خوش بیانی کی برکت سے کانپور۔ لکھنؤ۔ مرشد آباد اور دوسرے شہروں کے مشاعروں میں شریک ہوا۔

آخر طرح طرح کے مصائب میں مبتلا ہو کر بیت السلطنت لکھنؤ میں آیا۔ اور برسوں یہاں مصیبت جھیلتا رہا۔ تکلیف اٹھاتا رہا۔ توفیق ایزدی نے دستگیری کی اور ظفر الدولہ نواب علی اصغر خاں بہادر کی خدمت میں پہنچا۔ اس عالی ہمت نے مرہم اطمینان معاش کا دل ریش پر رکھا۔ تھوڑا ہی زمانہ گذرا تھا کہ نواب معین الدولہ سید باقر علی خاں بہادر نصیر جنگ خلف ثالث نواب معتمد الدولہ بہادر کے التفات نے غرق [illegible] سے مجھے [illegible] کر کے کانپور میں بلالیا۔ اور اپنے سایہ عاطفت میں جگہ دی۔ ابھی وہم میں بیٹھا پایا تھا کہ حسد پیشہ دشمنوں کی دشمنی سے مجھے [illegible] دیکھنا نصیب ہوا۔ اور ایک مدت [illegible] ہوا۔ اگر اس وقت [illegible] مولانا احمد حسن خاں بہادر [illegible] تو میرے [illegible] میں پہنچ جاتا۔ اور اسی حال میں امیر [illegible] فیاض [illegible] شاعر [illegible] اسد الدولہ [illegible] الملک سید محمد [illegible] خاں بہادر دلیر جنگ عرف نواب بہادر [illegible] تخلص نے اپنے [illegible] میں داخل کر کے [illegible] کی خدمت [illegible] میں [illegible]

بلایا۔ اور کوئی دقیقہ فروگذاشت اور تدبیر میں باقی نہ رکھا۔ دو برس تک اس خدمت کو انجام دیتا رہا کہ رئیس الامرا امیر الاغنیا گوہر دربار سخنگوئی نواب نصیر الدولہ معین الملک محمد تجمل حسین خاں بہادر ظفر جنگ معروف بہ حشمت جنگ فرمانروائے ریاست فرخ آباد نے میری بیکاری اور بیتابی کا حال معلوم کرکے مجھے طلب کیا۔ اور سفر خرچ بھی بھیجدیا۔

آخر لکھنؤ کی مفارقت کا داغ لیکر فرخ آباد میں قیام کیا۔ نواب کی ملازمت میں (خدا انکی مغفرت کرے) میں بہت مالدار ہوگیا۔ ذرے کو آفتاب بنا دیا۔ آخر نواب ممدوح نے انتقال فرمایا۔ اور کچھ دنوں ان کے مرنے کے بعد میں نے مصیبت جھیلی۔ ہرچند اس وقت بھی مہاراجہ الور فرمانروائے دھولپور نے بہت سے شقے لکھکر مجھے طلب فرمایا۔ اور زر مصارف بھی روانہ فرمایا لیکن دل نہیں چاہتا تھا۔ کہ ایسے غیر معروف دور دراز ملک میں جاکر بقیہ عمر تلف کروں۔ اس کے علاوہ شفیق والاہمم لالہ مادھو رام جوہر (جو میرے شاگرد اور صاحب دیوان ہیں) کی محبت بھی اجازت نہ دیتی تھی۔

ناگہاں دولت بیدار نے منہ دکھایا یعنی امیر الامرا رئیس الرؤسا حضرت علی نقی نواب علی بہادر صدر نشین حکومت "باندا" نے اپنی قدردانی کی کمند سے فرخ آباد سے "باندے" میں کھینچ لیا۔ اور وابستگان دامن دولت میں شامل کرلیا۔ اور اپنے کلام کی اصلاح سے میری عزت افزائی کی۔ ابھی تک یہی بادہ جام میں اور یہی ہما دام میں ہے۔ غرض اس بیان سے یہ ہے کہ اپنے ایسے انقلابات عظمی واقع ہوئے کہ کبھی مشرق میں تھا تو کبھی مغرب میں۔ ایک دم بھی آرام سے بیٹھنا دشوار تھا۔ ایسی حالت میں تحصیل علوم اور فکر شعر جس کے لئے پوری آسودگی درکار ہے کیا ہوسکتی تھی۔ مگر اس پر بھی میں نے بہت کچھ کہا کہ اگر وہ سب کلام جمع ہوتا اور تلف نہ ہوتا تو چھ سات دیوان مکمل ہوجاتے۔ فی الحال دو دیوان جمع ہوئے، پہلے میں استعارات اور کنایات کم ہیں دوسرے میں استعارے نہیں مگر نزاکت معنی سے خالی نہیں ہے۔ اور اگرچہ بعض شعرا کی تندیاں اجازت لب کشودنے کی نہیں دیتی ہیں لیکن جو نالہ لب تک آتا ہے۔ وہ کب رکتا ہے۔ لہذا بے کم وکاست کہتا ہوں کہ آجکل کے اہل زبان خصوصاً شعرا اکثر علم وفضل وکمال سے خالی ہیں یہاں تک کہ رسم الخط سے بھی ناواقف اور عروض وقافیہ کو اسم بےمسمی جانتے ہیں۔ اس سبب سے طبیعت نے استعارہ گوئی ترک کردی۔ اور بعضوں نے چند انشا کی کتابیں طوطے کی طرح پڑھ لی ہیں سو اب انہیں پر ناز کرتے ہیں۔ اور کہیں لسن الملکی بجاتے ہیں۔ یہ لوگ اس زمانے میں طاقت سخن فہمی کی نہیں

رکھتے۔ دوسرے دقائق سخن تو جاننا مشکل ہیں۔ اور سننے والے ایسے اہل فہم ہیں کہ ان لوگوں کے ہاتھ سے ہزار ہا نشتر دل پر لگتے ہیں۔ لہٰذا ان لوگوں کی قابلیت کے خیال سے آسان گوئی اختیار کی۔ منیر مرحوم نے جو حال اپنا آپ لکھا ہے وہ سب غدر کے پیشتر کا معلوم ہوتا ہے۔

غدر کے بعد ہی کسی الزام میں قید ہو کر کالے پانی بھیج دیئے گئے۔ اس کے متعلق لکھتے ہیں۔ کہ فرخ آباد کے احباب گردش تقدیر سے چھٹ گئے۔ ہم قید ہو کر "باندے" میں آئے۔ وزیر خاں ہمارا ایک شاگرد تھا۔ اس نے بہت سعادتمندی کی۔ آخر میری تقدیر سے عاجز ہو گیا۔ اور بھی دوستوں نے رہائی کی تدبیر کی۔ مگر کارگر نہ ہوئی۔ الزام یہ تھا کہ مسماۃ نواب جان قتل کی گئی۔ مصطفےٰ بیگ نے اسے قتل کیا اور تدویر سے مجھ بیگناہ کو بھی پھنسوا دیا۔ باندے کے زنداں میں مجھ پر لاکھوں ستم ہوئے۔ ایک تاریک کوٹھری قبر کے مانند جس میں بول و براز کا ڈھیر تھا۔ پانی کا قطرہ میسر نہ ہوتا تھا۔ افیون میسر نہ آئی۔ اس کی سخت تکلیف ہوئی۔ ہر وقت گالیاں کھاتے تھے۔ روٹیاں گوبر جیسی کھانے کو ملتی تھیں۔ ترکاری کے بدلے سوکھی گھانس بھینس کی سانی سے بدتر دال کرکری کثیف۔ بے نمک۔ ٹاٹ کا بچھونا کمل اوڑھنا۔ محنت مزدوری۔ تکلیف حد بیان سے باہر اس جہنم کے تمام موکل بے مروت بے حیا۔ قاتل اشراف تھے۔ پھر ہم کو الہ آباد میں بھجوا دیا۔ الہ آباد میں جو ستم گزرے وہ بیان سے باہر ہیں پھر وہاں سے کلکتہ پیدل روانہ ہوئے۔ ہاتھ دل میں ہتکڑیاں۔ پاؤں میں بیڑیاں۔ راستے میں اعدا نے بہت ستم کیے۔ کلکتہ میں فوٹو اتارا گیا اور ہم کالے پانی بھیج دیئے گئے۔ یہ واقعہ ۱۲۷۴ھ کا ہے۔ کالے پانی سے شاگردوں کی شکایت اور بے مروتی کی حالت میں لکھتے ہیں۔ جب تک میں ہندوستان میں رہا۔ سب شاگرد میرے ثناخواں تھے۔ وہاں سے قید ہو کر کالے پانی میں آیا تو اکثر شاگردوں کے خطوط آیا کیے۔ عزیزوں کی شکایت کیا کروں ان سے میں خود شرمندہ ہوں۔ اگر میں نے کوئی سلوک کیا ہوتا تو ان سے ہمدردی کی امید رکھتا۔ مگر ان شاگردوں سے شکوہ ہے جنھوں نے یک قلم بھلا دیا۔ نواب باندا کی شکایت بے سود ہے کیونکہ وہ میرے آقا تھے میں ملازم تھا۔ دوسری بات یہ تھی کہ اس فتنے نے ان کو بھی تاراج کر دیا تھا لیکن اگر کوئی شقہ بھیج دیتے تو مجھ کو اتنا رنج نہ ہوتا۔ صرف واجد علی خاں میرے حقوق تربیت کو نہ بھولے اور اس بعد پر بھی مہربانی سے پیش آئے۔ نواب حیدر جنگ نے بھی ان کی سعی سے احسان کیا۔ حمید الدین نے بھی سعادتمندی کی۔

* وزیر بیگ خوشنو باندے سے میری اعانت کی تسلیم نے زاد راہ کا سامان کر دیا تھا۔ ۱۲۸۲ھ

ہیں قید سے رہا ہو کر ہندوستان میں آئے کہتے ہیں۔

جزیرۂ دریائے شور میں ہم قید تھے۔ وہاں کمشنر صاحب کے محکمے میں منشی تھے۔ انعام میں دو برس معاف ہوتے ہی چھُٹکر الہ آباد آئے۔ وہاں سے کانپور پہنچے۔

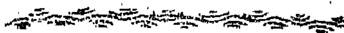
منیر نے مرثیہ پر مرزا دبیر سے اصلاح لی۔ اور نواب کلب علی خاں بہادر کے دربار میں بعد رہائی ملازم ہوئے۔ ان کی سرکار میں بہت سرفرازی پائی۔ نواب رامپور بہت قدردان رئیس تھے اسیر۔ امیر۔ عروج۔ داغ۔ جلال۔ حیا۔ شاغل۔ تعلق۔ بحر۔ جان صاحب۔ بدر۔ شاد۔ آن۔ غنی۔ اور اچھے اچھے شاعران کی فیاضیوں سے جمع ہو گئے تھے۔ منیر بہت پُرگو تھے۔ ان کا کلیات مطبع ثمر ہند لکھنؤ میں چھپا تھا۔ اور نواب کلب علی خاں بہادر نے اپنے خاص مصارف سے چھپوایا تھا۔ اس میں تین دیوان ہیں۔ پہلا منتخب العالم۔ دوسرا تنویر الاشعار۔ تیسرا نظم منیر۔ ایک مثنوی معراج المضامین بھی منیر نے لکھی تھی۔ جو اب طبع ہوئی ہے۔ اس میں معجزات امام لکھے ہیں۔ یہ مجموعہ ۱۲۹۲ھ میں چھپا تھا۔ اس وقت تک منیر زندہ تھے۔

غدر سے پہلے نواب یوسف علی خاں رئیس رامپور کی خدمت میں بھی کچھ قصاید منیر نے بھیجے تھے اس وقت تک نواب یوسف علی خاں بہادر ولیعہد تھے۔ چنانچہ ایک قطعہ میں لکھتے ہیں کہ حضور نے مجھے طلب فرمایا۔ شقہ طلبی بھیجا اور زادراہ بھی عنایت ہوا۔ مگر میں حاضری سے معذور ہوں۔ آج کل ایک سخت حادثہ پیش آیا ہے ناچار عطیہ سرکار واپس کرتا ہوں۔ مجھے بعد محرم یاد فرمایئے اور اسی وقت زادراہ بھی مرحمت ہو۔ مقطع میں لکھتے ہیں ؎

دربار میں منیر غزل خوانیاں کریں

طوطی حضور ہو لیں یہ بولتا ہوا

منیر قادر الکلام تھے۔ اور نظم کے کسی صنف میں عاجز نہ تھے۔ خاصکر قصائد کے بادشاہ تھے۔ قطعہ۔ رباعی۔ فرد۔ مخمس۔ غزل۔ فارسی۔ اردو سب میں اپنا رنگ دکھا جاتے تھے اور ہمیشہ رئیسوں کی صحبت میں رہے علم مجلس سے خوب واقف تھے۔ مگر ایک جگہ قیام کم کرتے تھے۔ اسی وجہ سے بہت سے سفر کیے۔ آخر میں رامپور میں عمر بسر کر دی اور اسی رئیس کی ملازمت کے سلسلہ میں انتقال کیا۔



انتخابِ کلام

سرنامۂ روح نام ہے ربِ کریم کا — چوٹی عروسِ جاں کی ہے دنبالہ میم کا
بندہ ہوں اے منیر خدائے کریم کا — صراف ہوں خزانۂ فیضِ عمیم کا
ہر سر کے واسطے نہیں سودائے عشقِ پاک — جبریل کا دماغ ہے گھر اس شمیم کا

امید ہے خدا سے کہ قبل از اجل منیر
دیکھے مزارِ اقدس رسولِ کریم کا

بے مشقت غفلت کا نشہ تا کوئے جاناں میں نہ تھا — خوابِ غفلت کا گذر چشمِ نگہباں میں نہ تھا
تھے سبھی دنیا میں مشتاقِ عروسانِ بہشت — اسکے سہرا راج فکرِ ساماں میں نہ تھا
ہو گئے محبوب تم کو دیکھ کر خوبانِ دہر — کونسا سر تھا جو آغوشِ گریباں میں نہ تھا
میرے رونے کی خبر کیوں کر نہ پوچھی نوح سے — سات دریا درمیاں وہ عینِ طوفاں میں نہ تھا
ہر گھڑی کے پیچ سے اک بار تو ملتی نجات — زہر بھی میرے لئے تلخیِ دوراں میں نہ تھا
لطف کی صحبت نہ دیکھی زندگی بھر اے اجل — جمع دلچسپ اس خوابِ پریشاں میں نہ تھا
منہ جو پردے سے نکالا ہو گیا بے شرم حسن — شعلۂ عریاں چراغِ زیرِ داماں میں نہ تھا
چشمانِ عشق کو کیوں کر پسند آتا بہشت — اک گلِ داغِ جنوں گلزارِ رضواں میں نہ تھا
معتقد ہی رکھتے نہ اک بت نے یہ موتی اپنے پاس — آنسوؤں کا آب و دانہ شہرِ خوباں میں نہ تھا
ایک رسی عاشق و معشوق کی گردن میں تھی — اے جنوں کس کا گلا طوقِ گریباں میں نہ تھا
فصلِ گل میں عام تھا دربارِ سلطانِ جنوں — راندۂ درگاہ تھا جو اب کی زنداں میں نہ تھا
مدِ فیاضہ وضع تھی حسب کشتگانِ عشق کی — لالۂ خونیں کفن باغِ شہیداں میں نہ تھا
ہم سے کرتا ہے قیامت چال کس امید پر — کونسا فتنہ نیا رفتارِ خوباں میں نہ تھا
بحرِ آفت میں تنِ لاغر بھی تھا نا آشنا — ایک تنکے کا سہارا جوشِ طوفاں میں نہ تھا
بلبلوں کے حق میں اب صیاد کانٹے بوتے ہیں — یاد آیا سیکھ تیا اس گلستاں میں نہ تھا
ہم سے پہلے خلوتِ اہلِ عدم تھے بے فروغ — اک چراغِ مردہ بھی شہرِ خموشاں میں نہ تھا

راہ و رسمِ خانۂ زنجیر کس سے پوچھئے
کوئی اگلے وقت کا دیوانہ زنداں میں نہ تھا

کعبے کے سامنے دلِ خانہ خراب تھا　　یہ چھوٹ پڑا حضورِ محل کا جو اسباب تھا
دنیا و دیں سے جس نے نکالا کھڑے کھڑے　　یا وحشتِ بخیر وہ دل خانہ خراب تھا

اللہ رے تلوّنِ نیسانِ فیضِ دوست
اشکِ یتیم تھا کہیں دُرِّ خوشاب تھا

کچھ جوانی سے ابھی کچھ ہے لڑکپن اُن کا　　دو دغا بازوں کے قبضے میں ہے جوبن اُن کا
کس طرح پائیں پتہ شیخ و برہمن اُن کا　　سارے ہرجائیوں کے دل میں ہے مسکن اُن کا
نہیں دبنے کا جوانی سے لڑکپن اُن کا　　چھاتی پر چڑھ کے دبایا کرے جوبن اُن کا
جب سے چھپے غیر ہوئے مرے خواب میں وہ آئینگے　　راستا روک کے بیٹھے رہیں رہزن اُن کا
جائے انصاف ہے دم کیوں نہ گلے میں اٹکے　　لے اجل گھر ہے قریبِ رگِ گردن اُن کا
کیا ہوا خاک نشینوں نے اگر دیکھ لیا　　اس قدر جامے سے باہر نہ ہو دامن اُن کا
بے حقیقت بھی نہیں فیضِ ازل سے محروم　　نظر آیا دلِ ہر مور میں خرمن اُن کا
ایسے منکر سے کہو ارض و سما میں نہ رہے　　ڈھونڈھ لے اور خدائی کہیں دشمن اُن کا
شمعِ رُخ سے نہ چراغِ حرم و دیر جلائیں　　جلوہ پہچان نہ لیں شیخ و برہمن اُن کا
وصل نے لوٹ لیا دونوں کو تنہا پا کر　　آج میرا ہے گریبان نہ دامن اُن کا
جلوۂ داغِ محبت میں کمی تھی جن کے　　جھلملاتا ہے چراغِ سرِ مدفن اُن کا
سابق و حال کے جلوے کو مطابق کر لیں　　آئینہ بھیج دے اے وادیٔ ایمن اُن کا
کل ہی کی وعدہ خلافی سے وہ محجوب نہیں　　کئی شب کا ہے ہلالِ خمِ گردن اُن کا
آپ سے آپ سرکتی جاتی ہے انگیا کُرتی　　پھٹ پڑا دیکھتے ہی دیکھتے جوبن اُن کا

ناسخ و رشک کا یہ نورِ افادت ہے منیر
تا ابد نام زمانے میں ہے روشن اُن کا

دستِ جفائے یار نہ دل کھول کر ملا　　دامانِ زخم بھی جو ملا ہاتھ بھر ملا
بزمِ جہاں میں گرم فغاں ہر بشر ملا　　خاموش اگر ملا تو چراغِ سحر ملا
غصے کے وقت ان کو کبوتر نے خط دیا　　قاصد بھی قسمتوں سے عجب جانور ملا
دنیا سے لا کے چھوڑ گئی موت قبر میں　　جس گھر میں بیکسی ہے مقید وہ گھر ملا
نقصان کا عوض ہو زمانے میں کس طرح　　جو دن گزر گیا نہ کبھی عمر بھر ملا

دانا بھی مول لے نہیں سکتے ہیں اے منیرؔ
افسوس ہے کہ کیوں ہمیں یکتا گہر ملا

اپنے رتبے سے جو منظور ہے بڑھ کر ہونا
اے قیامت قدمِ یار کی ٹھوکر ہونا

دشمنِ جاں ہے فقیروں کو تونگر ہونا
لے اُڑا سوئے عدم چونٹیوں کو پر ہونا

منعمو خاک نشینوں سے تعلّی کب تک
ایک دن ارض و سما کو ہے برابر ہونا

دیکھنے والوں نے بے پردہ تمہیں دیکھ لیا
پھر بھی غصے میں کبھی جامے سے باہر ہونا

ہر جگہ سختی و نرمی نہیں زیبا اے دل
شیشہ میخانے میں بتخانے میں پتھر ہونا

جی کے مرنے سے تو بہتر تھی بقا بعدِ فنا
خوب تھا ہونے کے ہونے سے نہ ہو کر ہونا

قتل کرنے کے لئے وعدۂ فردا کیا
ابھی ہو جائے اگر ہو کوئی محشر ہونا

ایک تم بچپنے میں سب سے نکیلے نکلے
نہیں آتا ہے کسی پھانس کو نشتر ہونا

بندۂ عاجز نہ ہو تدبیر کے یہ معنی ہیں
اپنی تقدیر سے بھی چاہئے بڑھ کر ہونا

چار دن روح کو تکیہ ہے بدن پر ناحق
صاحبِ خانہ کی قسمت میں ہے بے گھر ہونا

دین و دنیا کے مزے سے رہے محروم لیل
خضر ہونا ہمیں آیا نہ سکندر ہونا

ذبح کر ڈالئے پر سب میں نہ گنئے ہم کو
سر سے درگزرے گوارا نہیں ہمسر ہونا

حسن و خوبی کی ترازو ہے دوپٹہ تیرا
دونوں پلوں کو مناسب ہے برابر ہونا

حضرتِ رشکؔ کے بھی لیں گے قدم چل کے منیرؔ
کربلا میں کئی رتبے ہیں میسر ہونا

عبث کہتے ہو کوئی ہم سا نہ ہوگا
خدا کی خدائی میں کیا کیا نہ ہوگا

مرے ہوں گے سر پھوڑ کر مرنے والے
تمہارا تو ماتھا بھی ٹھنکا نہ ہوگا

کہاں سے لگائیں گے مہندی پری رو
اگر روز خونِ تمنا نہ ہوگا

کدورت اگر دل میں یونہیں رہے گی
کہاں تک یہ آئینہ میلا نہ ہوگا

مرے رشکِ یوسف کو دیکھ لے زلیخا
کبھی خواب میں تو نے دیکھا نہ ہوگا

ڈھلا ہے یہ سانچے میں دورِ فلک کے
زمانہ کسی طرح سیدھا نہ ہوگا

وہ مشقِ ستم کر کے کامل بنیں گے
جو لکھا ہے کس طرح پورا نہ ہوگا

تمہاری گلی سے سوئے کعبہ جاؤں
خدا سے ڈرو مجھ سے ایسا نہ ہوگا

اٹھے گا غرور اس قدر کس سے تو بہ — خدا آپ ہوں گے تو بندہ نہ ہوگا

رہے وصل دن بھر ہمارا تمہارا — جدا ہو جو محشر ہمارا تمہارا
سنے کون لیلی و مجنوں کا قصہ — فسانہ ہے گھر گھر ہمارا تمہارا

منیر اوقات ضائع کی عبث غزلوں کے کہنے میں — ارے ناداں مدح شہ لولاک ہونا تھا

عجز و نخوت نے قدم جب حد سے باہر رکھدیا — پاؤں پر سر میں نے اُس نے پاؤں سر پر رکھدیا

جان لی رحم جو ان کو دم بیداد آیا — یہ خوش اخلاق تو غصے کا بھی استاد آیا

کیا لکھنؤ سے کام جناب منیر کو — زنار بند زلفِ بُتو ہ اسیر ہیں

نہیں جس میں دل دار وہ دل یہی ہے — جدا اپنی لیلے سے محمل یہی ہے
غضب ہے اُسے زندہ در گور دیکھوں — جسے مر کے پالا ہے وہ دل یہی ہے
ادا اُن کی کہتی ہے میں ہوں مسیحا — قضا میری کہتی ہے قاتل یہی ہے
شب وصل بھی ہے اسے بے قراری — نرالا زمانے سے کیا دل یہی ہے
کسے آئینہ جان کر توڑتے ہو — میں پہچانتا ہوں مرا دل یہی ہے
اُلجھتیں جو زلفیں تو سلجھاتے اے بت — گرہ پڑ گئی دل میں مشکل یہی ہے
لہو سے مشابہ ہے مہندی کسی کی
سمجھ لے ترا چور اسے دل یہی ہے

نہایت ہے منیر افسردہ دل طول اسیری سے
مدد کو یا علیؑ پہنچو دم مشکل کشائی ہے

میر مونس مرحوم

میر محمد نواب صاحب مونس میر خلیق کے چھوٹے فرزند اور میر ببر علی انیس کے چھوٹے بھائی تھے۔ شاعری میں ان کا مرتبہ میر انیس سے کم نہ تھا لیکن گوشہ نشینی نے ان کی شہرت کو محدود رکھا۔ وضع کے نہایت پابند تھے۔ چوگوشیہ ٹوپی پہنتے جس پر چکن کا کام بنا ہوتا تھا۔ نیچے شلوکہ اور پر جامدانی کا انگرکھا بے گوٹ کی آستین کا۔ روز پرٹ کر بدلتے تھے۔ ورزش کا نہایت شوق تھا۔ کندھوں تک زلفیں پڑی رہتی تھیں۔

پڑھنے کا انداز ایسا تھا کہ واقعے کی تصویر پیش نظر ہو جاتی تھی۔ یہ بات مشہور رہی ہے کہ میر مونس سے بڑھ کر کسی نے مرثیہ نہیں پڑھا۔ ابتدا میں غزلیں بھی بہت کہیں۔ یہ مقطع زبان زد ہے ؎

مونس کی گلستاں میں ابھی آنکھ لگی ہے
اے بلبلو یہ شور مچانا نہیں اچھا

انیس کی طرح دبلے پتلے آدمی نہ تھے بلکہ کسرتی بدن تھا۔ مشک گنج میں رہتے تھے۔ مجالس عشرہ ریاست محمود آباد میں پڑھنے جایا کرتے تھے۔ مشہور ہے کہ راجہ امیر حسن خاں صاحب مرحوم مرثیہ گوئی میں آپ ہی کے شاگرد تھے۔ معقول وظیفہ ریاست سے مقرر تھا۔

نواب میر محمد حسین خاں مرحوم بھی ان کے شاگرد تھے۔ ان کے یہاں کی مجلس بھی پڑھتے تھے۔ اور وہیں کے مشاعروں میں بھی شریک ہوتے تھے۔ گھر سے کبھی پیدل نہیں نکلے سہ پہر کو بوچہ پر ہوا کھانے جاتے تھے۔

نواب صاحب کے یہاں مجلس ہر مہینے کی چھبیسویں ۲۶ تاریخ کو ہوتی تھی۔ ہمیشہ میر صاحب مرثیہ نو پڑھتے تھے۔ اور سامعین کا بہت مجمع ہوتا تھا۔

شہر میں اور بھی مجلسیں میر صاحب نے پڑھیں مگر یہ بات کسی مرثیہ گو میں نہ تھی کہ وہ ہر مہینے کی مجلس میں نیا مرثیہ کہتا ہو۔ مزید یہ کہ ہر مرثیے کے ساتھ ایک نیا سلام بھی ضرور ہوتا تھا۔

میر صاحب کے مرثیوں کے متعلق تو ہم کسی دوسرے حصے میں لکھیں گے۔ سر دست سلام کی خوبیوں کو پیش کرنا چاہتے ہیں۔

یہ بات تو ان کے خاندان میں مخصوص تھی۔ کہ زبان اور محاورات کا لحاظ مقدم سمجھا جاتا تھا اور اسی سبب سے میر صاحب کا خاندان ممتاز تھا لیکن میر مونس کے سلام میں محاورات کی تہہ میں استعارات کی چمک دمک نظر آتی تھی۔ اور یہ بات میر مونس کی ذات کے ساتھ مخصوص تھی۔ ایک سلام کا مطلع ہے۔

جلوہ ہے دل میں حبِ علی کی شراب کا
مینائے احمری میں ہے پھول آفتاب کا

اسی طرح ہر شعر میں کوئی نہ کوئی بات استعارات وکنایات میں ضرور ہوتی تھی۔

گوہر نکلتے آتے ہیں دریائے طبع سے
ہے بین آبرو جو کریں آشنا لب

مشکل زمینوں میں محاورے اور زبان کو قایم رکھنا مشکل کام ہے مگر مونس کا کلام اپنی خوبیوں کے ساتھ اس راستے کو بھی طے کرتا تھا۔

قبر میں خاک شفا پھولوں کی چادر باہر — مجرئی بوئے ارم پھیلی ہے اندر باہر
دیکھ عبرت سے ذرا گورِ غریباں کی طرف — استخواں قبر کے اندر ہیں تو پتھر باہر
باغِ عالم میں چلی ہے یہ ہوا خست کی — غنچے کہتے ہیں کہ مٹھی سے نہ ہو زر باہر

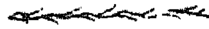
خیبر کی مدح کروں شہ کا ثنا خواں ہوکر — مہر کی اپنی ہوا کھوؤں سلیماں ہوکر

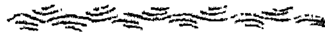
سلامی لطفِ زبان ہمزباں اٹھاتے ہیں — مرے سخن کا مزا قدر داں اٹھاتے ہیں

مونس کی کوئی اولاد نہ تھی۔ اپنے بھائی کے بھتیجے میر نظم حسین کو بجائے فرزند پرورش کیا۔ ممبر پر بیٹھا بیٹھا شعر کی تصویر کھینچنا آپ کا خاص حصہ تھا۔ جہاں شاعری کا رنگ دکھاتے تھے لوگوں کی زبان پر واہ واہ کی صدا بلند ہوتی تھی۔ بین دکھلاتے تھے تو ساری مجلس صفِ ماتم بنجاتی تھی لکھنؤ میں ان کی زود گوئی کی عام شہرت تھی۔ ہر مہینے ایک نیا مرثیہ سننے کے واسطے دور دور سے لوگ آتے تھے۔ رجب کے مہینے میں جب مرزا دبیر صاحب اور میر انیس صاحب اپنا اپنا نیا مرثیہ پڑھتے تھے۔ میر مونس کی چھبیسویں تاریخ کا مرثیہ بہت زوردار ہوتا تھا۔ اور پڑھنے کے انداز میں اپنے بھائی میر انیس سے بھی گوئے سبقت لیجاتے تھے۔

جب میر انیس نے ۱۲۹۱ھ میں انتقال فرمایا۔ تو مونس کو سخت صدمہ ہوا۔ اور ہر مجلس میں اس غم کا اظہار فرماتے تھے۔ ابھی سال بھر ہوا تھا۔ کہ دفعتہً عید کے مہینے میں ۷ شوال کی شب درد گردہ اٹھا۔ شدت سے تکلیف تھی۔ آپ نے کرب کی حالت میں اگالدان پر ہاتھ رکھ کر زور دیا اور اٹھنا چاہا۔ اسی حالت میں روح نے مفارقت کی۔ یہ واقعہ پانچ منٹ میں ختم ہو گیا۔ تمام شہر میں کہرام مچ گیا۔ صبح کو جنازہ بہت دھوم سے اٹھا۔ شہر کے تمام رؤسا شریک ساتھ تھے۔ کلاں کوٹھی میں غسل دیا گیا۔ گھسن والی بغیا میں جہاں میر انیس مدفون ہیں دفن ہوئے۔

گھسن شاہی میں ایک آئینہ ساز تھا۔ جو شاہی آئینے بنایا کرتا تھا۔ اس کے انتقال کے بعد لڑکوں نے اس باغ کو بیچ ڈالا۔ اور اب اس باغ میں میر انیس و میر مونس کی قبریں ہیں۔





حکیم مسیحا

حکیم محمد علی خاں مسیحا تخلص شاگرد رشید شیخ امام بخش ناسخ پیشہ طبابت گندمی رنگ دراز قد تحقیقات الفاظ کے بہت دلدادہ تھے۔ ناسخ کے خاص رنگ میں غزل کہتے تھے۔ فن سخن میں استاد مشہور تھے۔ مگر معاش محض طبابت پر تھی۔ صاحب تلامذہ تھے۔ نواب مہدی حسن خاں آباد شاگرد ناسخ سے بہت اتحاد تھا۔ عصمت ریختی گو لکھنوی بعد شیخ ناسخ حکیم مسیحا کے شاگرد ہوئے۔ اور انہیں سے اصلاح کلام لیتے تھے۔ حکیم صاحب کے کلام میں شستہ الفاظ بہت ہے اور اپنے استاد کے پورے پورے مقلد تھے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

ہوں جس کا باغ عالم میں مقلد
وہ ناسخ بلبل ہندوستاں ہے

متروکات ناسخ کی پابندی کو لازم سمجھتے تھے۔

بے اضافت قبیح کیا ہے لکھ۔ حسن کلام
اے مسیحا نون کا اعلان رہنے دیجیے

بات یہ ہے کہ دہلی والے صورت اضافی میں بھی اعلان نون کو جائز رکھتے تھے۔ ناسخ نے اسے متروک کیا۔ اور غیر عطف و اضافت کی صورت میں اعلان نون کو جائز قرار دیا۔ اسی کی طرف حکیم مسیحا نے اشارہ کر کے کہا ہے۔

مشاعروں میں کم شریک ہوتے تھے۔ مگر ان کے مکان پر خود شعرا کا مجمع رہتا تھا۔ اصلاح اچھی دیتے تھے۔ اکثر ملیح آباد بغرض علاج مریض تشریف لے جاتے تھے۔ مذہب امامیہ تھا۔ غزل کے سوا دوسرا کلام ان کا دیکھنے میں نہیں آیا۔ صاحب دیوان تھے۔ سنہ وفات صحیح نہیں معلوم مگر غالباً بعد غدر یعنی ۱۲۸۳ھ میں انتقال کیا۔

ناسخ کے ماتم میں کہتے ہیں۔

اے مسیحا کیوں نہ ہو بے رنگ بستان سخن حیف دنیا سے جناب ناسخ اشعر اٹھا

اکثر اشعار ان کے زبان زد عام ہیں۔ چنانچہ یہ اشعار نقالوں کی زبان پر ہیں۔

اے پری پیکر ملا تجھکو سراپا نور کا — آنکھ آہو کی کمر چیتے کی چہرا حور کا
تیرے پستاں پر نظر آتا ہے عالم نور کا — اے پری روشن ہے گویا قمقمہ بلور کا
حشر سے یہ مدعا ہے آپ کا رخ دیکھ لوں — میں نہیں مشتاق غلماں کا نہ طالب حور کا

اس کے علاوہ آپ کا کلام معنوی نکات سے خالی نہیں ہے۔ اور ناسخ کے رنگ میں ہے۔

آنکھوں سے اشک الفت لب میں نکل گیا — لڑکے نے دیکھ لی جو مٹھائی مچل گیا
اس شمع رو نے مجھ سے جو کیں تجھکو گرمیاں — کیسا رقیب آتش حسرت سے جل گیا

اے خدا تو شافع مطلق ہے ہر آزار کا — نام ہے دار الشفا بیشک تری سرکار کا
اس فقیر عشق کو کچھ غم گناہوں کا نہیں — حشر میں کافی ہے تکیہ رحمت غفار کا

یاد چشم سیہ یار نے سونے نہ دیا — مجھکو اندیشہ بیمار نے سونے نہ دیا

آنسوؤں سے ہے سمندر زیر پا بالائے سر — رکھتے ہیں پانی کی چادر زیر پا بالائے سر

وعدہ ناحق ہے آج کا کل کا — یاں بھروسا نہیں ہے اک پل کا
تونے کاٹا جو سر تو بوجھ اترا — اے پری زاد ہو گیا ہلکا
آپ کی ذات ابر رحمت تھی — کیوں نہ سر پر ہو سایہ بادل کا

مال گردوں اگر نالہ مرا ہو جائیگا — عنصر خاکی جو تن میں ہے ہوا ہو جائیگا

ہاتھ میں انگیا کی جب تریا آگئی — آج ہم عنقا کو لائے دام میں
لکھنؤ کی یاد میں آنکھوں سے خوں جاری ہوا — یاد آیا میکدہ بھرتے تھے حسین آباد میں

خوب واقف ہیں مسیحا حسن و قبح شعر سے
سالہا بیٹھے ہیں بزم ناسخ استاد میں

دل ہے مقیم کوچۂ گیسوئے یار میں ۔ مٹی مری خراب ہے ملک تتار میں

ابروؤں کے لیے دنیا میں بڑا رتبہ ہے ۔ آنکھ پر رکھتے ہیں دلبر نہیں تلواروں کو

عبث انسان کو الفت ہے چاندی اور سونے سے ۔ مآل کار سونا خاک میں معلوم ہوتا ہے

ہر اک لب وصف رخ میں کھولتا ہے ۔ اس آئینہ کا طوطی بولتا ہے

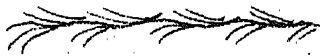
گل نہیں سنتے کسی نے کان بہرے کر دیے ۔ نالۂ مرغ چمن اے باغباں بیکار ہے

اے مسیحا گوہر مضمون نہ ہاتھ آیا کبھی ۔ روز جوش قلزم بحر رواں دیکھا کیے

مجھکو امید رحمت رب کریم ہے ۔ کیا غم ہے شعلہ زن جو مسیحا جحیم ہے
روز نشور سے نہیں کم ہے شب وصال ۔ خوف و رجا میں ہوں مجھے امید و بیم ہے
دکھلاؤ آکے پنجۂ پرنور باغ میں ۔ محتاج شانۂ گیسوئے موج نسیم ہے

مسی آلودہ لب پہ بانکی کب ترے لالی ہے ۔ کلی لالے کی خالق نے یہ سوسن سے نکالی ہے

مرے پہلو سے آپ جب سرکے ۔ نہ تھمے اشک دیدۂ تر کے
کیا کہیں دنیا سے ہم کیوں کر چلے ۔ بار عصیاں لے کے اپنے سر چلے



مرزا حاتم علی مہر

مرزا حاتم علی بیگ مرحوم (مہر تخلص، تاریخی نام خورشید علی ہے ۱۲۳۰ھ چوتھی جمادی الاول ہفتے کے روز قریب شام جھٹ پٹے وقت گلزار عدم سے دنیا کی بہار دیکھنے آئے۔ اس زمانے میں ان کے پدر بزرگوار مرزا فیض علی بیگ قزلباش ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے علی گڈھ کے تحصیلدار تھے۔ کہ مرزا مہر لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔

جب ان کی عمر ڈھائی برس کی ہوئی تو ان کے چھوٹے بھائی مرزا عنایت علی بیگ ماہ پیدا ہوئے۔ مرزا مہر چار برس کے اور مرزا ماہ ڈیڑھ برس کے تھے کہ باپ نے اس جہان فانی سے انتقال فرمایا۔ بیوہ ماں نے اپنے حسن انتظام سے دونوں بچوں کی تعلیم اور پرورش میں نہایت عقلمندی کا ثبوت دیا۔ اور ابھی تعلیم سے فراغت ہوئی ہی تھی کہ اٹھارہ برس کے سن میں اپنے بیٹے کی رسوم سے شادی بھی کر دی۔ مرزا صاحب نے اپنے عقد کی تاریخ نئے طرز پر لکھی ہے۔

چوں مرا قیدی زندان علایق کردند سال تاریخ عروسی خودم بنوشتم
یعنی آزاد وشے بودم و اکنون زے مہر از سر حسبہ گرفتار شدم بنوشتم

قیدی زندانِ علایق بنکرِ سر حسبہ کا تعمیہ بہت مناسب کیا ہے۔ شادی کے دو برس بعد خدا نے فرزند عطا کیا جس کا نام مرزا سجاد علی رکھا اور تاریخی نام آغا بہرام نکالا۔ آغا بہرام دسویں شوال کو دوشنبہ کے روز صبح صادق کے وقت پیدا ہوئے۔ مرزا صاحب مرحوم نے اس خوشی کی بھی تاریخ لکھی۔

شوال کی دسویں تھی دوشنبہ کا وہ دن تو بین نماز صبح کا تھا وہ ہنگام
خالق نے عطا کیا مجھے جو فرزند ہم صولت اسکندر و ہم جرات سام
دل نے کہا مجھ سے مہر اس بیٹے کا تاریخی ہو کے جس میں رکھنا وہ نام
ناگاہ یہ دی سروش غیبی نے ندا لو ہم نے تو رکھا نام آغا بہرام ۱۲۵۰ھ

آغا بہرام کے تین برس کے بعد ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کا دو برس کے بعد انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد پھر کوئی اولاد نہیں ہوئی۔

بزرگ ان کے مغل قزلباش اصفہان کے رہنے والے تھے۔ نواب شجاع الدولہ بہادر کے عہد میں ان کے دادا مرزا مراد علی خاں قزلباش لکھنؤ میں آئے۔ اور شاہی دربار میں رکن الدولہ کا خطاب حاصل کر کے ممتاز عہدوں پر رہے۔ کچھ دنوں ڈلمؤ رائے بریلی کے ناظم بھی رہے۔ مرزا مراد علی خان کے والد یعنی مہر کے پردادا نادر شاہ کے وقت میں کمانڈر توپ خانہ ہو کر ہندوستان آئے تھے۔

مہر کو شاعری کا چسکا ابتدائے سن سے تھا اور معلوم ہوتا ہے کہ چودہ پندرہ برس کے سن میں اچھی طرح شعر کہنے لگے۔ اس لئے کہ اپنے عقد کی تاریخ آپ فارسی میں لکھی۔ اور بہت اچھی لکھی۔ طبیعت کے اقتضا سے مہر ناسخ کے شاگرد ہوئے۔ اور آہ نے آتش سے اصلاح لی۔ شاید دس برس اصلاح لی ہوگی کہ ناسخ کا انتقال ہو گیا۔ انتقال کی تاریخ مہر نے جو لکھی۔ اس میں بیشک اپنی استادی کا کمال دکھایا ہے۔ ناسخ کے ایک مقطع کے مصرعہ آخر سے تاریخ انتقال بے کم و کاست نکالی ہے

ناسخ ازل سے بندۂ شاہ نجف رہے (۱۲۵۴ھ)

۱۸۴۰ء میں سند عہدہ منصفی کی حاصل کر کے چنار گڑھ کے منصف مقرر ہوئے۔ وکالت ہائی کورٹ کی سند حاصل کی۔ ابھی عہدہ منصفی کے امیدوار تھے کہ حاسدین نے رخنہ اندازی شروع کی۔ اس واقعہ کو مہر نے ایک تاریخ میں لکھا ہے۔

امیدوار کیا جج نے منصفی کا مجھے — تو مجھ سے ہو گئی ناحق کو حاسدوں کو کد
دیا سوال مری ضد پہ صدر میں لے مہر — ہوا وہاں سے بھی آخر سوال ان کا رد
ملا ذریعۂ کامل خدا کا فضل مجھے — اثر پذیر عدو کا نہ ہوگا بغض و حسد
نکالوں سال مؤذی کو اب کہو تاریخ — عدو شود سبب خیر گر خدا خواہد

۱۸۵۷ء کے غدر میں سات انگریزوں کو اپنے گھر میں چھپایا۔ اس خدمت میں مرزا سخاوت علی بیگ اور مہر کے ماموں شریک تھے پھر لکھنؤ سے ان کو لیکر آگرے گئے۔ گورنمنٹ سے اس خدمت کے صلے میں بائیس پارچہ کا خلعت مع مالائے مروارید اور گھوڑا اور اسلحہ عطا ہوئے۔ اور جاگیر میں دو موضع قریب فتح پور مرحمت ہوئے۔ آپ اپنا قیام آگرے میں کر لیا۔ اور وہیں ہائی کورٹ میں وکالت کرنے لگے۔ لیکن موجودہ زمانے کے وکیلوں کی طرح نہ تھے۔ موکل سے کبھی فیس طے نہیں کی۔ مقدمے کی کامیابی کے بعد اگر کچھ موکل نے خدمت کی تو قبول کر لی۔ اور نہیں تو کچھ طالب نہیں ہوئے۔ باہر سے جو لوگ اپیل کرنے آتے تھے اور مہر کو اپنا وکیل کرتے تھے۔ تو

کھانا اور مکان ان کے سر۔ بلکہ آگرہ ایسی میں کرایہ کی ضرورت ہوئی تو وہ بھی مرزا صاحب سے وصول کرکے گھر جاتے تھے۔ کچھ دنوں آنریری مجسٹریٹ بھی رہے۔ اس حکومت پر آپ کے اخلاق عام رہے۔ مرزا صاحب کا مذہب شیعہ اثنا عشری تھا۔ لیکن کبھی مذہب کا ذکر نہ آنے دیتے تھے نمازِ جنازہ شیعہ سنی دونوں نے پڑھی۔ غدر میں بہت سا کلام برباد ہوگیا لیکن شاعری کا ذوق شوق بدستور رہا۔ آپ کے خاص احباب میں مرزا غالبؔ، مولوی غلام امام شہیدؔ، خواجہ غلام غوث خاں بیخبرؔ، میر وزیر علی صاحب صباؔ تھے۔ غالب مرحوم نے ان کے نام بہت سے خط لکھے ہیں۔ جو ان کی تالیف میں شایع ہوچکے ہیں۔ منشی محمد اسمعیل صاحب منیرؔ اور مرزا دبیرؔ میر انیسؔ صاحب بھی خاص ملنے والوں میں تھے

آگرہ میں جب ان کی شاعری کی شہرت ہوئی تو مہاراجہ بلوان سنگھ بہادر والیٔ کاشی مقیم آگرہ ان کے شاگرد ہوئے اور پچاس روپیہ ماہوار تنخواہ بھی قدردانی کے لحاظ سے مقرر کردی۔ ان کا تخلص راجہ رکھا گیا۔ اس زمانے میں اردو زبان کے قدردان ہر جگہ موجود تھے۔ راسی سے لوگوں کو تالیف اور تصنیف کا بہت شوق تھا۔ غدر میں جو کلام کھو گیا۔ اس کے علاوہ بھی مہرؔ کی تصنیف و تالیف کا بہت ذخیرہ مطبوعہ اور غیر مطبوعہ موجود ہے۔

الماس درخشاں۔ دیوان کا نام ہے۔ اس کا تاریخی نام خیالاتِ مہرؔ ہے جو مصنف کے انتقال کے بعد ان کے پوتے مرزا قاسم حسین صاحب قزلباش نے چھپوایا ہے۔ اس میں کچھ غزلیں فارسی کی بھی شامل ہیں۔ اور اکثر غزلیں سنگلاخ زمین میں لکھی ہیں۔ جو مصنف کی کہنہ مشقی اور استادی کا اظہار کررہی ہیں۔

پارۂ عروض۔ اردو میں فنِ عروض کا ایک مختصر رسالہ ہے جس میں انہیں بحروں کا بیان ہے۔ جس میں اردو کے شاعر اکثر طبع آزمائی کیا کرتے ہیں۔ جو مصنف کے ایک شاگرد نے چھپوا کر شایع کیا۔

آئینۂ فرنگستان۔ تاریخ کی ایک کتاب ہے جو ۱۸۷۳ء میں چھپی تھی اس میں مختصر حال شروع عملداری انگریزی سے گورنر اور لفٹننٹ گورنر کا اور بڑے بڑے واقعات کی تاریخیں لکھی ہیں۔

داغِ رنگیں۔ ایک مثنوی ہے جس میں عاشق و معشوق کا ایک سچا واقعہ نظم کیا ہے اور کمال یہ ہے کہ پوری مثنوی ایک رات میں نظم کرکے چھپوائی۔

داغ دل مہر۔ ایک واسوخت ہے۔
شبستان عشرت میں اپنے فرزند آغا سخاوت علی بیگ کی شادی کے سہرے اور تاریخیں جو احباب نے لکھی تھیں جمع کر کے چھپوائی ہیں۔
ذاب انتقام۔ ایک مذہبی کتاب ہے جس میں مختار کا حال نظم کیا ہے۔
شعاع مہر۔ مثنوی ہے جو ۱۲۶۵ھ میں مطبع حیدری آگرہ میں طبع ہوئی ہے۔ یہ وہی مثنوی ہے جس کی تعریف غالب نے اپنے خطوط میں لکھی ہے۔ اس میں نگارین بیگم زوجہ مسعود سوداگر پر سلطان محمود کا عاشق ہونا نظم کیا ہے۔

ان کے علاوہ رسالہ زبر و بینات، ہمدم آخرت، بیان بخشائش، عید قیصریہ، پنجہ مہر، توقیر شرف وغیرہ مختلف مقاصد پر نظم کی گئی ہیں۔ اس سے مہر کی پرگوئی کا پتہ ملتا ہے۔ اس کے علاوہ اور مراثی وغیرہ غیر مطبوعہ آپ کے یادگار ہیں۔ ہر صنف سخن پر تھوڑا بہت کلام مرزا صاحب کا ملتا ہے۔ غزل، مستزاد، مسدس، مثلث، مسبع، تضمین، رباعی، مخمس، قطعہ، مثنوی، تاریخ وغیرہ دیوان میں بھی موجود ہیں۔

مادہ تاریخ ہمیشہ صاف اور پاکیزہ نکالتے تھے۔ بسنہ ۱۸۶۶ء میں ان کے فرزند مرزا سخاوت علی مسل خواں صدر کلکٹری ایٹہ کے سررشتہ دار مقرر ہوئے۔ اس خوشی میں آپ نے تاریخ لکھی۔

مستقل شد بہ افسری مال — از رحیم دلم چو گل بشگفت
مہر تاریخ سال استقلال — نیک سررشتہ دار ایٹہ گفت
۱۸۶۶ء

مرزا وزیر علی صبا نے انتقال کیا۔ آپ نے مادہ تاریخ نکالا۔

وزیر صبا گلشن جنت میں ہے — ۱۲۷۱ھ

غالب مرحوم کے انتقال کی تاریخ لکھی۔

بجنان غالب نامی آمد — ۱۲۸۵ھ

مہر کی خوش نصیبی، ماں نے شوہر کے انتقال کے صدمے اٹھانے کے بعد فرزند کے عروج سے دل کو خورسند کیا۔ مہر نے تعلیم پائی، شادی ہوئی، بہو گھر میں آئی، غدر ہوا، بیٹے نے سرکار کی خوشنودی کے لحاظ سے انگریزوں کی جان بچائی، خلعت اور جاگیر سے سرفراز ہوا۔ وکالت سے منصف ہوا۔ پوتا جوان ہوا۔ کلکٹری ایٹہ کا سپرنٹنڈنٹ مال مقرر ہوا۔ شادی ہوئی، پوت بہو آئی، اپنے باغ کی بہار اچھی طرح دیکھنے کے بعد سنہ ۱۲۹۶ھ میں اس جہان فانی سے

انتقال کیا۔ مہر نے تاریخ لکھی۔

شو جنتی نادر پاک گہر ۱۲۸۷ھ

ڈاڑھی ہمیشہ منڈوایا کئے۔ گلا صاف رہتا تھا۔ جب خدا نے ۱۲۰۰ھ میں پوتا دیا تو اس خوشی میں آپ نے ڈاڑھی رکھ لی۔ لوگوں نے سبب پوچھا۔ کہنے لگے یہ منت مانی تھی کہ پوتا ہوگا تو ڈاڑھی رکھینگے۔ کشیدہ قامت، رنگ گندم گوں، گنجے بال، ڈاڑھی مخضب۔

روزگار کے لحاظ سے ہمیشہ آگرہ میں رہتے تھے۔ جج مجسٹریٹ سے تین مہینے جج میں برابر نشست رہتی تھی۔ تین مہینے فرصت ہوتی تھی۔ فرصت کے زمانے میں ایٹہ میں اپنے بیٹے آغا سخاوت علی تحصیلدار ایٹہ کے پاس چلے آتے تھے۔

ایک دفعہ ایٹہ میں تھے کہ ہچکی کا مرض شروع ہو گیا۔ آخر ۲۸ شعبان ۱۲۹۵ھ مطابق ۱۸ اگست ۱۸۷۹ء روز دوشنبہ غروب آفتاب کے بعد مہر آسمان سخن بھی گوشہ قبر میں چھپ گیا۔ دوست احباب کو اس سانحہ کا بہت صدمہ ہوا۔ اور اسد علی کے تکیہ میں دفن ہوئے۔ چھیاسٹھ برس کی عمر پائی۔ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

مرزا صاحب کے کلام میں روز مرہ اور محاورے کے لطف کے ساتھ کلام میں پختگی اور ترکیب میں متانت اور مضامین بلند ہیں۔ بعض بعض مقام پر استعارات اور تشبیہیں فارسی کی بھی موجود ہیں۔ کلام کو رنگین اور بلند کر کے دکھانے میں خاص ملکہ رکھتے تھے کہیں سادہ شعر میں ایسا مزا پیدا کر دیا ہے۔ جسے سنکر آدمی پھڑک اٹھے ؎

تجھ سے تو ہے امید ہمیں لطف و کرم کی
ہوگا کسی کا فسر ہی کو ڈر روز جزا کا

کتنا صاف شعر ہے۔ اور کافر کے لفظ نے کتنا مزہ دیا۔

محراب کے عوض خم گیسوے یار کا
عادی ہے دل مرا عابد شب زندہ دار کا

اس سادگی کے بعد اس بلند پروازی کو دیکھیے خم گیسو کو محراب بنانا۔ دل کو عابد شب زندہ دار سمجھنا پھر گیسو کی رعایت سے شب کا استعمال کتنا دشوار گذار راستہ تھا۔

ظلمت سے بھی ظالموں کو سہارا ہو جائیگا
ہر گردوں کو مرا نالہ عصا ہو جائیگا

محال امر کو ممکنات کر دکھایا۔

آبروئے اشکِ ندامت سے مجھے ہوگی نصیب　　پنجۂ مژگاں ترو دستِ دعا ہو جائے گا

شعر کی بلندی قابلِ دید ہے۔

مرے دستِ جنوں کا مشغلہ اچھا نکل آیا　　گریباں پھٹ گیا تو دامنِ صحرا نکل آیا
کیا طوفاں سا طوفاں ہمارے دیدۂ تر نے　　جو اک آنسو نکل آیا تو اک دریا نکل آیا

غبارِ خاطرِ یارانِ رفتگاں نہ رہا　　میں خاک ہو کے بھی دنبالِ کارواں نہ رہا
وہ بے حجاب ہوئے عالمِ شباب آیا　　بہار آئی تو گلشن میں باغباں نہ رہا

بشکلِ آئینۂ دل صاف جو پیدا کرتا　　وہ مجھے دیکھتا اور میں اسے دیکھا کرتا

اشعارِ بالا میں حسنِ بندش شکوہ الفاظ حسنِ تخیل روزمرہ سب موجود ہے۔ ذیل میں آپ کے کلام کا مختصر انتخاب درج کیا جاتا ہے۔

میں تو اس چال پہ مرتا ہوں کہ چلتے چلتے　　ٹھوکریں ماریں سرِ گورِ غریباں کیا کیا

تجھی سے جس نے پایا مطلبِ دل اپنا پایا　　بتوں کو ہم نے عمر بھر پوجا تو کیا پایا
یہ شانِ بے نیازی ہے کہ وارفتہ کیا مجھ کو　　طبیعت بے غرض پائی دلِ بے مدعا پایا
چراغِ دیر میں شمعِ حرم میں تیرا جلوہ ہے　　تجھی کو ہر جگہ دیکھا تجھی کو جابجا پایا

میرے اور یار کے بیچ میں جو پردہ حائل　　جوش اتنا نہ ہوا دیدۂ گریاں ہوتا
قفل کنجی کی اگر گوشہ نشینی صاحب　　کوچۂ زلف مجھے گوشۂ زنداں ہوتا

عاقلوں کا سرِ تسلیم کرے بھی غم سادہ لوح　　خاک سے آئینہ چمکا خاک اسکندر ہوا

آسماں پر آپ کے جھکنے کا پڑتا ہے عکس　　بندہ پرور خندۂ عقدِ ثریا کھل گیا

روزی ہوا ہے دانۂ زنجیر و آبِ تیغ　　قسمت کا عاشقوں کی یہی آب و دانہ تھا

ذرا تمہیں مرے رونے پر التفات نہیں
یہ تو ذرا سے ٹرو پہ ہنسی کی بات نہیں
خدا کریم ہے اس سے تو ہے امید نجات
زبان واعظ مغرور سے نجات نہیں

پیارے میں نے جو دیکھا تو وہ فرماتے ہیں
دیکھئے دیکھئے ہوتی ہیں گنہگار آنکھیں

رنگ صحبت بدلتے جاتے ہیں
ساتھ کے یار چلتے جاتے ہیں

صبر ہم بے قرار کرتے ہیں
جبر پہ اختیار کرتے ہیں

چڑھا کشتی پہ جب مجھ غیرت سیماب دریا میں
تو پانی ننگ کے مارے تہ گرداب دریا میں
ہوا جاتا ہوں پانی پانی احسان احباب سے
عبث مجھکو ڈبوتے ہیں مرے احباب دریا میں

رات دن سینہ زنی خاک بسر کرتے ہیں
عیش و آرام سے ہم خاک بسر کرتے ہیں
روزہ کیا رکھیں وہ میخوار جو میخانے میں
پانی پی پی کے شب و روز گزر کرتے ہیں
صورت گرد رہ قافلہ میں بیکس ہوں
ہمسفر بھی مرے سب مجھ سے حذر کرتے ہیں
پوچھتا کون ہے اب علم و ہنر کو اے مہر
سخت نادان ہیں جو کسب ہنر کرتے ہیں

دل مجھکو دے کے حکم دیا بے نیاز نے
اس دل میں دو وہ درد جو درماں پسند ہو

غافل نہ ہو سرا یہ محل خطر بھی ہے
شب کاٹنی ہے صبح کو عزم سفر بھی ہے

میں وہ قاتل ہوں جس نے تیغ قاتل کو
معرکے میں گلے لگایا ہے

شانہ نکرو گیسوؤں کا تار نہ ٹوٹے
دیوانوں کی زنجیر ہے ایسا نہ ہو ٹوٹے
قربان میں کس ناز سے کہتے ہیں وہ مجھسے
مرصورت پہ کیونکر نہ ہی دل یار نہ لوٹے

کوئی دلسوز سوا اس کے نہ دیکھا اپنا — شمع رونے کو مری قبر پہ آجاتی ہے

کوچ وقت سحر ہمارا ہے — کوس رحلت گجر ہمارا ہے

سخی بھی خدا کے ہے فضل و کرم سے — جو مہر کا نام حاتم علی ہے

عبث کرتے ہیں کیوں ہر کام میں تدبیر پہلے سے — وہ ہوگا لکھ چکا جو کاتب تقدیر پہلے سے

کدھر کا چاند ہوا مہر کے جو گھر آئے — تم آج بھول پڑے کس طرف کدھر آئے

دل سوز ہے کوئی نہ کوئی غمگسار ہے — مرنے کو ہم ہیں رونے کو شمع مزار ہے

سند ہیں وہی ہوگی تری کریمی کی — جو فرد ہاتھ میں اپنے گناہ کی ہوگی

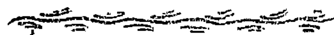
میاں اپنے بندوں کا ہر آن تو ہے — خداوند عالم نگہبان تو ہے

شمع کی تقریر پروانوں سے یہ محفل میں ہے — وہ زباں پر ہو ہمارے جو تمہارے دل میں ہو

زلف اندھیر کرنے والی ہے — تم نے ناگن بلا کی پالی ہے
اس کے مذہب کا اعتبار ہے کیا — مہر اک رند لاابالی ہے

کس منہ سے خداوند ترا شکر ادا ہو — جب دانت نہوں بندوں کے تب وہ عطا ہو

رومال کے لباس میں ابر آکے یار کا — پانی پیا کیا مری چشم پر آب سے



شیخ امام بخش ناسخ

شیخ امام بخش ناسخ مرحوم کے سنہ ولادت کا پتہ کسی تاریخ سے نہیں ملتا اور نہ ان کے باپ کا نام معلوم ہوتا ہے۔ بعض کہتے ہیں شیخ خدا بخش خیمہ دوز کے بیٹے تھے۔ اور بعض کہتے ہیں متبنیٰ کیا تھا۔ ناصر خاں ناصر دہلوی مولداً فیض آباد کے رہنے والے لکھنؤ میں تشریف لائے۔ محلہ "خیالی گنج"[1] میں سکونت اختیار کی۔ ایک تذکرہ لکھا جس میں تمام شعرا کی قومیت، پیشہ، سکونت اور شاگردی کا حال لکھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ شیخ امام بخش فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ اور کریم بخش بساطی نے فیض آباد میں ان کو پرورش کیا۔ شیخ صاحب سیاہ فام، فربہ بدن آدمی تھے۔ سر منڈا ہوا۔ ڈاڑھی خشخشی تھی۔ اور رباعیوں میں مشہور تھے۔ عہد آصف الدولہ میں مرزا محمد تقی ترقی رئیس فیض آباد کے ہمراہ لکھنؤ آئے۔ جاڑوں میں سنتکو مرزا صاحب کے مکان کے سنہری پردے اوڑھ لیتے تھے۔ دن کو باریک کپڑے پہنے ہوئے اکثر پھرتے تھے۔

منشی امیر اللہ تسلیم کہتے تھے۔ لکھنؤ میں ایک رئیس تھے میر کاظم علی۔ انہوں نے ناسخ کو اپنا فرزند بنا لیا تھا۔

اور بعد ان کے مرنے کے انہیں کی دولت ناسخ کو ملی۔

"گھو گھاٹ" میں ایک قبر ہے جس پر مصرع لکھا ہے۔

گور بے پیر شبلیل ناسخ

لیکن دیوان ناسخ میں جو تاریخ لکھی ہے۔ اس کا مصرع یہ ہے۔

با رسول ہاشمی محشور باد

۱۱۹۸ھ میں آصف الدولہ بہادر نے لکھنؤ کو بیت السلطنت بنایا۔ اس کے دو برس بعد ناسخ لکھنؤ آئے۔ کچھ دنوں عسرت میں بسر ہوئی۔ آخر شاعری کے شوق نے ان کو روسا امرا سے ملنے کا موقع دیا۔ ناسخ کے سامنے اچھے اچھے شاعر دہلوی دنیا سے رخصت ہو چکے

---

[1] یہ محلہ روشن الدولہ کی کوٹھی کے جنوب میں واقع ہے۔ مولف

تھے۔ میر تقی میر کے انتقال فرمانے کے بعد دہلی کا وقار شاعری کم ہوگیا۔ اسی زمانہ میں جرات نے انتقال فرمایا۔ مرزا رفیع سودا راہی ملک بقا ہوئے۔ اور مصحفی نے سفر آخرت قبول کیا۔

اب شیخ ناسخ کے لئے ترقی کا میدان خالی تھا۔ ناسخ سب سے پہلے میر تقی میر کی خدمت میں اصلاح کے لئے غزل لے گئے۔ انہوں نے بے توجہی سے اصلاح دینے سے انکار کردیا۔ تو ناسخ نے مصحفی سے اصلاح لی۔ اور عیسی خاں تنہا سے بھی۔

میر کاظم علی کا انتقال ہوگیا تو ایک کثیر رقم بذریعہ وصیت نامہ لی۔ اب ناسخ آسودہ حال ہوگئے۔ "ٹکسال والے مکان میں سکونت اختیار کی۔

شاگردوں سے ملنے کا وقت مقرر کیا۔ شعر کہنے کے اوقات مقرر کئے۔ صحن میں متعدد چوکیاں بچھی تھیں۔ اس کے پاس نانڈے پانی سے بھرے ہوئے رکھے تھے۔ جب زیادہ گرمی معلوم ہوتی نہانے بیٹھ جاتے۔

زندگی بھر شادی نہ کی۔ مکان کے سامنے مولوی وارث علی صاحب کا کمرہ تھا۔ وہ طلباء کو مفت درس دیتے تھے۔ اور "میزان" سے "شمس بازغہ" تک کے شاگرد ان کے پاس آتے تھے۔ ناسخ عربی سے بے بہرہ تھے۔ جو کتابیں مولوی صاحب طلبا کو پڑھاتے یہ اپنے کمرے میں وہی کتاب لیکر بیٹھ جاتے۔ اور جو سبق ملتا اسے یاد کر لیتے۔ حافظہ اچھا تھا۔ کچھ دنوں میں عربی صرف نحو حاصل کر لی۔ اسی طرح میزان سے شرح جامی تک پڑھ گئے۔

مصحفی نے ایک مرتبہ ان کی غزل اپنے شاگرد بیتاب کو اصلاح کے لئے دیدی۔ اسی روز سے خفا ہوگئے۔ اور اصلاح لینا ترک کردی۔

جب میر و مرزا نہ رہے تو ناسخ کا عروج ہونے لگا۔ اور لکھنؤ کی زبان ان کی تحقیق کے معیار پر دہلی کی قید سے آزاد ہوئی۔ لکھنؤ کے شعراء خود مستند بن گئے۔ ناسخ کی صحبت میں بڈھے فلک زدہ شاعر موجود رہتے تھے۔ اور بقدر امکان ان کی خاطر و تواضع کی جاتی تھی۔ اور ان سے شاعری و زبان کے متعلق اپنے شکوک رفع کر لیتے تھے۔ رفتہ رفتہ تحقیق الفاظ میں ناسخ کی شہرت ہوگئی۔ آتش کا رنگ تغزل بلند تھا۔ وہ غزل کو عاشقانہ رنگ میں رنگ لیتے تھے۔ اس سبب سے ان کا کلام مطبوع عام تھا۔ ناسخ کو شاعری میں یہ بات تو حاصل نہ تھی۔ مگر ان کی تحقیق حد کمال کو پہنچی

ٹکسال۔ لکھنو چوک کے وسط میں ایک محلہ ہے۔ مؤلف

ہوئی تھی۔

اصلاح دینے کا اچھا مادہ پیدا کیا تھا۔ اس لئے ان کی طرف امرا۔ رؤسا کا رجوع زیادہ تھا۔ ناسخ کے یہاں دنیاوی ساز و سامان درست تھا۔ دوسرے رؤسا کے مکان پر جانے میں عذر نہ تھا۔

اس لئے ناسخ بہت سے رؤسا اور شرفائے لکھنؤ شاگرد ہوئے۔ یہاں تک کہ نواب معتمد الدولہ بہادر آغا میر بھی ناسخ کے شاگرد ہوئے۔ اور ایک لاکھ روپیہ نذرانہ کے نام سے پیش کیا۔ آپ نے وہ سب روپیہ اپنے منظورِ نظر مرزائی صاحب کو دیدیا۔

یہ بات سچ ہے کہ خدا جب دولت دیتا ہے تو غرور آجاتا ہے۔ ناسخ نے دنیاوی دولت بھی حاصل کی اور علمی دولت بھی پائی یعنی محقق اردو مشہور ہوئے۔ دہلی کے مقابلے میں غیر فصیح الفاظ کو ترک کیا۔ اور تمام شعرا نے مان لیا۔ وزیر شہر شاگرد ہوئے۔ امرا نے قدردانی کی۔ اس پر بھی فربہ اور سیاہ فام ہونے کی وجہ سے آتشیوں نے دُم کٹے بھینسے کی پھبتی کہی۔

سید محمد عسکری عرف میر کلو عرش خلف میر تقی میر ناسخ کے یہاں آتے تھے۔ اور ناسخ ان سے افادہ حاصل کرتے تھے۔ ناسخ کے بعض شاگردوں نے مشہور کیا کہ یہ ناسخ سے اصلاح لیتے ہیں۔ عرش میر کی طرح نازک مزاج تھے۔ ناسخ سے خفا ہو گئے۔ اور اپنے ایک شاگرد سید تراب علی کا تخلص انسخ رکھا۔ انہوں نے ناسخ کے رنگ میں غزل کہی۔ اور ناسخ پر اعتراض کئے۔ آخر لوگوں نے صفائی کرا دی۔

ناسخ کی صحبت میں رؤسا کے علاوہ تمام شہر کے معزز شعرا جمع ہوتے اور ناسخ ان کی خاطر مدارات کرتے رہتے۔ اور شاعری کے متعلق اپنے شکوک رفع کیا کرتے۔ اکثر گنگے قبلا کرتے اور افیوں گھلا کرتی۔ کہنہ مشق شعرا کی صحبت میں ان کو شاعری کے متعلق بہت درک حاصل ہو گیا۔ موجودہ زبان کے ثقیل الفاظ نکال ڈالے۔

سہ پہر کو ٹکسال کے پھاٹک کے پاس ایک دکان میں بیٹھتے تھے۔ دو چار ٹکے پیسے کے لالچ میں ان کے پاس آتے۔ ان کو چیز دیتے، پیسہ دیتے اور خوش طبعی کیا کرتے۔ قریب شام نواب محسن الدولہ بہادر کی عمارت کی طرف سے شاد ہینا اور حاجی حرمین ہوتے ہوئے پہنچا دروازے

ایک پھاٹک نواب آصف الدولہ بہادر کے امام باڑے کے قریب تھا۔ اب کنگ جارج میڈیکل کالج میں شامل ہو گیا

تفریح کو جاتے تھے۔

اودھ کے بادشاہ محمد علی شاہ کو یہ خبر گزری کہ ایک شاعر نواب محسن الدولہ پر عاشق ہے اور [illegible] کو انہیں دیکھنے آتا ہے۔ یہ خبر سنتے ہی نواب محسن الدولہ بہادر کو معلوم ہوئی۔ دوسرے روز انہوں نے ناسخ سے سارا ماجرا بیان کیا۔ ناسخ نے اسی روز سے گھر سے باہر نکلنا ترک کر دیا۔

نواب محسن الدولہ بہادر کو معلوم ہوا تو کہنے لگے "ایسا ہو تو ناسخ گھر میں بیٹھے بیٹھے فاقے کر کے جان دیدے اور مواخذہ مجھ پر ہو۔" پانچ ہزار روپیہ ان کے گھر بھجوا دیا۔ قدردانی کا زمانہ تھا۔ شاگرد اس قدر استاد کی خدمت کرتے تھے کہ ناسخ گھر بیٹھے ملاقات کرتے تھے کسی رئیس کی ملازمت کی پروا نہ تھی۔ ۱۲۴۴ھ میں نواب آصف جاہ والی دکن نے انتقال کیا۔ ناسخ نے تاریخ وفات کہی:

دکن کا رئیس شاد است و اسے افسوس

۱۲ ۵۵ ۳۵

ان کی شہرت "حیدرآباد (دکن)" میں اچھی طرح ہو چکی تھی لیکن اس زمانے میں جب ناسخ "الہ آباد" میں تشریف رکھتے تھے، مہاراجہ چندو لال مدار المہام دکن نے بارہ ہزار روپیہ بھیج کر ناسخ کو طلب فرمایا۔ انہوں نے استغنا سے جواب لکھ دیا کہ میں یہاں ایک سید کے دامن سے وابستہ ہوں۔ اب یہاں سے لکھنؤ واپس جاؤں گا۔ انتہائے قدردانی دیکھئے کہ مہاراجہ نے دوبارہ پندرہ ہزار روپیہ بھیجا اور یہ اصرار کیا کہ اگر آپ یہاں تشریف لائیں گے تو "ملک الشعراء" کا خطاب آپ کو ملے گا۔ حاضری دربار کی شرط نہ ہوگی۔ ملاقات آپ کی خوشی پر رہے گی۔ مگر ان کی وارستہ مزاجی نے اس کو بھی قبول نہ کیا۔

لکھنؤ سے نکلنے کا یہ سبب واقع ہوا کہ نواب مرزا حاجی اور ناسخ سے بہت دوستی تھی۔ رفتہ رفتہ وہ شیخ صاحب کے طفیل سے بادشاہ کے ملازم ہو گئے۔ کل آمدنی شیخ صاحب کی ان کے پاس جمع ہوتی تھی۔ شیخ صاحب کے احسان سے کبھی دربار شاہی میں پہنچ گئے۔ مرزا حاجی اکثر ساتھ رہتے تھے۔ امراء رؤساء شہزادگان والاشان کی خدمت میں حاضر رہتے تھے۔

ایک دن نواب غازی الدین حیدر بہادر نے اپنے دربار میں فرمایا کہ اگر ناسخ ہمارے دربار میں قصیدہ تہنیت پیش کریں تو ان کو خطاب "ملک الشعراء" عطا ہوگا۔ نواب مرزا حاجی نے یہ خبر ناسخ کو دی۔ ناسخ نے فرمایا کہ اگر شاہان دہلی کی طرف سے خطاب عطا ہوتا تو میرے لئے باعث فخر تھا۔

نواب مرزا حاجی نے یہ کلمہ بادشاہ کے گوش گزار کر دیا۔

اسی روز نواب معتمد الدولہ بہادر نے فرمایا کہ بہتر ہے آپ صوبہ اودھ سے چند روز کے واسطے باہر چلے جائیں۔ بادشاہ کا مزاج تند ہے۔ خدانخواستہ کوئی امر آپ کے خلاف شان ظہور میں آیا تو ہم لوگوں کی بےعزتی ہوگی۔ ناسخ رات ہی کو الہ آباد روانہ ہو گئے۔ اور نواب مرزا حاجی نے ان کی تمام رقم آپ صرف کی۔

دو دیوان مطبوعہ موجود ہیں۔ تیسرا دیوان میری نظر سے گزرا ہے مگر افسوس ہے کہ اس وقت موجود نہیں ہے۔

مثنوی "نظم سراج" بھی ناسخ نے لکھی تھی۔ مگر وہ بھی دیکھنے میں نہیں آئی۔ ایک مختصر مولود شریف نظم مطبوعہ موجود ہے۔ قصیدہ ناسخ نے کبھی کسی رئیس کی شان میں نہیں کہا ہجو سے ہمیشہ گریز کیا۔

دلی کے شعرا اکثر باوجود کثیر آمدنی کے مذموم حالت میں بسر کرتے تھے۔ جیسے مصحفی کی غزل فروشی مشہور عام ہے۔ میر حسن خلیق بھی غزلیں بیچا کرتے تھے۔ اور تمام شعرا نے روسا اور امرا کی مدح میں ہزاروں قصیدے کہے اور ان سے فیض حاصل کیا مگر لکھنؤ کے دونوں شاعر ناسخ اور آتش کا دامن اس کثافت سے پاک رہا۔ دونوں نے اپنی آن بان رکھی ناسخ نے عیش کیا دولتمندی میں بسر کی۔ آتش نے فاقے کئے اور کسی والئی ملک کی بھی خوشامد نہ کی۔ اور کسی رئیس کی ملازمت کو قبول نہ کیا۔ اس پر بھی ان کی ہمتوں نے ان کو شاہانہ ساز و سامان سے رکھا جس طرف چلتے تھے لوگ آنکھیں بچھاتے تھے لیکن افسوس ہے ان کے بعد اس آن بان کو لکھنؤ کے اور شاعر نباہ نہ سکے۔ اور گردش زمانہ نے ان کو قصیدہ خوانی پر مجبور کر دیا۔

ناسخ کے شاگردوں میں میر علی اوسط رشک اور خواجہ وزیر اور کپتان مقبول الدولہ قبول اور فتح الدولہ برق اور شیخ امداد علی بحر بہت مشہور ہوئے اور انکے دیوان مطبوعہ موجود ہیں۔

ناسخ کا مذہب شیعہ تھا۔ آپکی پیدائش فیض آباد میں ہوئی تھی ۱۱۹۱ھ میں لکھنؤ تشریف لائے اور ۱۲۳۲ھ میں لوٹ کر الہ آباد گئے [illegible] آخر عمر میں ان کو [illegible] عارضہ میں مبتلا رہتے تھے آخر اسی مرض کے اشتداد سے ۱۲۵۴ھ میں انتقال کیا۔ اور اپنے مکان واقع محلہ ٹکسال میں دفن ہوئے قبر ان کی موافق اصول مذہب شیعہ زمین دوز بنائی گئی۔ تربت کا نشان پختہ اب تک موجود ہے تھوڑا زمانہ ہوا کہ ان کے ورثا نے اس مکان کو فروخت کر ڈالا۔ افسوس

انتخابِ کلام

بلبل ہوں بوستانِ جنابِ امیرؑ کا
روح القدس ہے نام مرے ہم صفیر کا

مرا سینہ ہے مشرق آفتابِ داغِ ہجراں کا
طلوعِ صبحِ محشر چاک ہو میرے گریباں کا
ازل سے دشمنی طاؤس و مار آپس میں رکھتے ہیں
دلِ پرداغ کو کیونکر ہے عشق اُس زلفِ پیچاں کا
شگفتہ مثلِ گل ہر فصلِ گل ہیں داغ سینے میں
بنا ہے کیا بہار اس کا لبِ دریا گلستاں کا
دیا میرے جنازے کو جو کاندھا اُس پری رو نے
گماں ہے تختۂ تابوت پر تختِ سلیماں کا

جس جگہ ہے حسن فوراً آفتِ دوراں پیدا ہوا
چاہ میں یوسف گرا تو کارواں پیدا ہوا
سخت دل جو ہیں انھیں محروم رکھتا ہے فلک
بیضۂ فولاد سے بچہ کہاں پیدا ہوا

اس ادا سے دھوئے ہیں دستِ حنائی اپنے
ہر حبابِ آبِ جو اک دیدۂ پرخوں ہوا

کب ہماری فکر سے ہوتا ہے سودا کا جواب
ہاں تتبع کرتے ہیں ناسخ ہم اس مغفور کا

لبریز اس کے ہاتھ میں ساغر شراب کا
بنتا ہے عکسِ شمع سے کٹورا گلاب کا
رکھتا ہے چرخ اوج کسی کا کب ایک دن
ہوتا ہے دوپہر میں زوال آفتاب کا
جو ہے حسین اُس کو ہے نفرت جہان سے
ہوتا نہیں اُدھر کبھی منہ آفتاب کا

پریوں کو عمل سے میں تسخیر نہیں کرتا
جز نقشِ درم کچھ بھی تاثیر نہیں کرتا
کیونکر مرے رونے سے دل نرم ہو اُس بت کا
پتھر میں کبھی پانی تاثیر نہیں کرتا
کیوں فکرِ عمارت ہے دنیا میں تجھے ناسخ
ویرانے میں گھر کوئی تعمیر نہیں کرتا

دل میں ساکن ہے خیال اک بتِ بے پروا کا
آشیانہ مرے ویرانے میں ہے عنقا کا

جو اسپ آتش سے نہ چھپا اور [illegible] | کندہ [illegible] گیا نقش اپنے خاتم کا
سخاوت جس کو کہتے ہیں [illegible] | [illegible] گیا سے نام حاتم کا
[illegible] | [illegible] مریم کا
گذر [illegible] | [illegible] شان عالم کا
کہیں [illegible] | کسی جانب پڑا تھا کا [illegible] جسم کا

[illegible] آواز کا | [illegible] نقش تیر انداز کا
[illegible] | پوچھ [illegible] نہیں مجھ سے کسی کے ناز کا

[illegible] اپنا [illegible] | ناتواں ہوں [illegible] بھی [illegible] کا

[illegible] | [illegible] گراں گرا

[illegible] | [illegible] چھوڑ دیا

[illegible] ناتواں [illegible] | [illegible] رستم [illegible] کا

[illegible] | [illegible] دیا

[illegible] | [illegible] کا
[illegible] | [illegible] آشیاں کا
[illegible] | [illegible] قاتل کی آستیں کا

[illegible]

[illegible]

[illegible] | [illegible] روشن ہے

ہے دلا کس کو دوام اس گردشِ ایام میں　　خاک کے پتلے ہزاروں بن گئے ہیں خاک میں

رفعت کبھی کسی کی گوارا یہاں نہیں　　جس سر زمیں کے ہم ہیں یہاں آسماں نہیں
دو روز ایک وضع پہ رنگِ جہاں نہیں　　وہ کونسا چمن ہے کہ جس کو خزاں نہیں

ہے ریاضِ فکرِ ناسخ کی جو شادابی یہی　　لکھنؤ میں آئے گی روحِ غنی کشمیر سے

اجل سر پر کھڑی ہے خوابِ غفلت میں تو ماتا ہے　　چھپر کھٹ کے عوض لازم جنازے کا بنانا ہے

یہ آدمی ہے کہ برسوں جہاں رہتا ہے　　وگرنہ ماہ کو اک شب کہاں رہتا ہے

کونسا خورشید آج اپنا چراغِ خانہ ہے　　بزم میں باہم ہجومِ ذرہ و پروانہ ہے

فکر سے میں نہیں خالی غمِ جاناں میں کبھی　　کبھی زانوں پہ ہوا سر ہے گریباں میں کبھی

جسمِ نزار بے حرکت پیرہن میں ہے　　سب مجھکو جانتے ہیں کہ مردہ کفن میں ہے
ہیں بے نصیب صحبتِ جاناں سے ایک ہم　　پروانہ بزم میں ہے تو بلبل چمن میں ہے

ہمصفیر اس باغ کی کیسی ہوا ناساز ہے　　طائرِ رنگِ چمن تک مائلِ پرواز ہے

مشتاق سب ہیں بدر سے افزونیِ ہلال کے　　دنیا میں قدرداں نہیں صاحب کمال کے
مرنا قبول ہے مجھے دنیا نہیں قبول　　غمزے اٹھیں گے مجھ سے نہ اس غزال کے

چشمِ جاناں اور ہے چشمِ غزالاں اور ہے　　وضعِ انساں اور ہے ترکیبِ حیواں اور ہے

زنداں میں بھی کوچہ ترا اے یار آتا ہے نظر   بلبل قفس میں ہے مگر گلزار آتا ہے نظر

عشق مجھے آیا جو میں پہنچا در دلدار پر   پاؤں کے بدلے کیا سر سایۂ دیوار پر
رہنے دے بس یونہی اے چارہ گر ٹانکے نہ دے   بخیہ میں چاک گریباں کے تو دامن تار پر
بیٹھنے کا قصد کرتا ہوں جو کوئے یار میں   سایہ چڑھ جاتا ہوا سے نجل کے دیوار پر

زلف کے صدمے زیادہ رخ سے ہیں مجھ زار پر   دن سے افزوں رات تو ہوتی ہے بیمار پر
ہے یہ میرے ضعف کا روز جدائی میں اثر   شام ہے اور دھوپ چڑھ سکتی نہیں دیوار پر
طاق کعبہ پر لگایا ہے کسی نے آئینہ   یا جبیں صاف ہے یہ ابروئے خمدار پر

قامت یار کو ہم یاد کیا کرتے ہیں   سرو کو صدقے میں آزاد کیا کرتے ہیں
رشک سے نام نہیں لیتے کہ سن لے نہ کوئی   دل ہی دل میں اسے ہم یاد کیا کرتے ہیں
تیرا دیوان ہے کیا سامنے ان کے ناسخ
جو کہ قرآں پہ ایراد کیا کرتے ہیں
ہے عجب رنگ کی وحشت ترے دیوانے میں   جی نہ آبادی میں لگتا ہے نہ ویرانے میں

خامشی مجھکو ہوئی قفل دہن ان روزوں   چھٹ گیا مشغلۂ شعر و سخن ان روزوں

ہم زباں اپنا شمع سے سخت ہیں بیزار ہیں   چاہیے گل گل کے سر عاشق کے آزار میں

سوائے مکر زمانے میں رسم و راہ نہیں   وہ کون جا ہے جہاں چاہ زیر کاہ نہیں
ہمیشہ کام میں غیروں کے ہیں سعادتمند   ہما کو اپنے لئے فکر عز و جاہ نہیں

صبح فرقت تیرگی میں شام سے کچھ کم نہیں   چاند نکلا ہے افق سے نیر اعظم نہیں

قدح لئے ہوئے گل مثل بادہ خوار آیا — خزاں چمن سے گئی موسم بہار آیا

ترے جاتے ہی ہوا رنگ چمن ہو جائیگا — برگ گل جو ہے وہ برگ یاسمن ہو جائیگا

فرقت ساقی میں مجکو عیش بھی غم ہو گیا — جام جب دیکھا بزنگ شیشہ قد خم ہو گیا

تو نے ظالم دل روشن جو ہمارا توڑا — غل فرشتوں نے کیا عرش کا تارا توڑا

غم فرقت سے جان تن میں نہیں — جان کیا تن بھی پیرہن میں نہیں
لے کے بوسے ہوا میں کیوں بیہوش — مے تو اس کے چہ ذقن میں نہیں

کیونکر ترے آگے نہ جھکے حور کی گردن — بجلی کی کمر شعلے کا منہ نور کی گردن
قربان تری آنکھوں پہ ہے دیدۂ ساغر — گردن پہ فدا شیشۂ بلور کی گردن

یاد ہیں سب گلعذار لکھنؤ — ہے تصور میں بہار لکھنؤ
گل سے رنگیں تر ہیں رخسار لکھنؤ — نشے سے بہتر خمار لکھنؤ
سارے نقشے سامنے آنکھوں کے ہیں — نقش ہیں نقش و نگار لکھنؤ

ہم صفیر اپنا وطن ہے لکھنؤ — ہم تو بلبل ہیں چمن ہے لکھنؤ

آسماں کی کب ہے طاقت جو چھڑائے لکھنؤ — لکھنؤ مجھ پر فدا ہے میں فدائے لکھنؤ

نظر آتا ہے ہلال رمضاں جام بھی لا — ساقیا مجکو سپر چاہئے تلوار کے ساتھ

آگئی موت شب ہجر میں ہیہات مجھے — اب کہاں یار سے امید ملاقات مجھے

کبھی نالہ کبھی گریہ کبھی وحشت کبھی غش　　کیا ہی اے عشق کیا تو نے خوش اوقات مجھے

دل بر میں ہے جسم میں نہ جی ہے　　کچھ میری خبر نہیں ابھی ہے

شب ماہ کی فرقت میں جو تارے نکل آئے　　تاروں سے سوا اشک ہمارے نکل آئے

دیکھا جسے اور بھی ہے تجھ میں ہے ہر بات نئی　　وضع نئی قطع نئی گات نئی بات نئی

باغ میں آج جو اس گل کی سواری آئی　　شور بلبل نے کیا باد بہاری آئی

ناسخ شراب پی شب تاریک ہے تو کیا
محتاج آفتاب نہیں اجتناب کا

شبہ ناسخ نہیں کچھ میر کی استادی میں
آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں

انس　　مونس　　انیس

وحید

نفیس　　سلیس　　رئیس

میر نفیس لکھنوی

میر خورشید علی نفیس کو ہم نے اس وقت دیکھا جب اُن کا سن اسّی برس سے تجاوز کر چکا تھا نہایت نیک مزاج، مہذب و متین تھے۔ سیتلا منہ داغ۔ گندمی رنگ، کتابی چہرہ، کرنجی آنکھیں، گول بدن اور دراز قد تھے۔ اس ضعیفی میں بھی کسرت کرنے کا شوق تھا، بازوؤں پر جوشن کے مٹھے بندھے ہوئے، کمر کسی قدر خم ہو چلی تھی، ہاتھ میں چاندی کی شام کی چوب، انگلیوں میں فیروزے کی انگوٹھیاں، لباس میں دہلی کا تتبع کرتے، ڈھیلی مہری کا پیجامہ، گھٹنوں تک کا مہین شربتی کا کرتا، نیچی کمر توڑی کا جامدانی کا انگرکھا، چوگوشیہ ٹوپی، ڈاڑھی منڈی ہوئی۔ مونچھیں بڑی بڑی[۵۱]۔

"چوبداری محلے" میں رہتے تھے۔ چہرے سے رعب و متانت کے آثار ظاہر ہوتے تھے "سبزی منڈی"[۵۲] سے ہو کر "چوک" میں اشیائے ضروری خریدنے کو تشریف لاتے تو ایک ملازم ضرور ساتھ ہوتا، سودا اپنی پسند اور پرکھ سے خرید کر ملازم کو دیتے تھے۔

ان کے والد میر ببر علی انیسؔ تین بھائی تھے۔

میر ببر علی انیسؔ۔ میر نواب مونسؔ۔ میر مہر علی اُنسؔ۔ جن میں سے میر اُنسؔ کے فرزند میر وحید۔ میر مونسؔ کے کوئی اولاد نہ تھی۔ اور میر انیسؔ کے اولاد ذکور میں تین بیٹے۔

میر خورشید علی نفیسؔ، میر محمد سلیسؔ، میر عسکری رئیسؔ۔ سن کے علاوہ فن کے اعتبار سے بھی میر نفیسؔ اپنے تمام بھائیوں میں ممتاز تھے۔ استعداد علمی بہت اچھی تھی۔ فارسی میں مفتی میر محمد عباس سے مشورۂ سخن ہوتا۔ اور اردو میں اپنے والد کے شاگرد تھے۔

مرثیہ گوئی کی شہرت میں میر انیسؔ کے بعد انہیں کا رتبہ ہے۔ عادت تھی کہ ۲۵۔ رجب کو اپنا نو تصنیف مرثیہ "دلارام کی بارہ دری" میں پڑھا کرتے۔

۵۱۔ یہ وضع ان کے خاندان کی تھی۔ ان کے جد اعلیٰ میر حسن بھی اس وضع کے پابند تھے۔ اور ڈاڑھی منڈانے کی ابتدا خاندان میں انہیں سے ہوئی۔

۵۲۔ اس نام سے لکھنؤ۔ چوک کے قریب ایک محلہ آباد ہے۔ مولف

پنڈت دلارام کشمیری برہمن تھے، جنھوں نے ایک عالیشان بارہ دری اپنے نام سے بنوا کر مع سازوسامان، فرش و فروش وغیرہ کے شادی و غمی، مجالس و مولود کے جلسوں کے لئے ہندو اور مسلمان عوام کے نام وقف کر دی تھی۔

میر نفیس ادھر منبر پر تشریف لے گئے۔ ادھر حاضرین مجلس خاموشی کے عالم میں تصویر حیرت بن گئے۔ آپ نے پہلے کچھ رباعیاں پڑھیں، واہ، واہ کے شور سے بارہ دری ہل گئی، پھر ایک سلام پڑھا بعدہ مرثیہ شروع کیا، ڈھائی تین گھنٹے کامل پڑھتے۔

اسی برس کا سن تھا۔ کمر جھک گئی تھی۔ چہرہ پر جھریاں پڑ گئی تھیں لیکن جس وقت منبر پر جاتے یہ معلوم ہوتا تھا کہ شیر گونج رہا ہے۔ ایک مصرعے سے دوسرے مصرعے کا زور بڑھتا جاتا تھا۔

تعریف کے وقت لوگ کھڑے ہو جاتے اور ہاتھ بڑھا بڑھا کر کہتے "سبحان اللہ میر صاحب! یہ آپ ہی کا حصہ ہے، نیا مضمون، آج تک نہیں سنا۔ کیا بندش ہے۔ اور کیا پیاری زبان ہے۔ واقعہ کی تصویر کھینچ دی ہے۔ اور شب کا بند تو قسم ہے جناب امیر کی لاجواب ہے"۔

ایک مرتبہ میر صاحب مرثیہ جدید پڑھ رہے ہیں، لوگ کھچا کھچ بھرے ہیں، صاحب مجلس منبر کے پاس کھڑے ہیں۔ یہ بھی ایک مسن آدمی ہیں۔ میر انیس کے ملنے والے، میر اعظم علی نام ہے، رجب کی مجلس ان کی مشہور ہے۔ لوگ دور دور سے آتے ہیں۔ آٹھ آٹھ روز تک اسی انتظار میں قیام کرتے ہیں،

میر صاحب اسی انداز سے پڑھ رہے ہیں، محویت کا عالم ہے، ایک مرتبہ آپ نے ہاتھ اٹھا کر کہا ؎

وہ گرد اٹھی وہ جنگ بند بوتراب آیا

میر یکم قد اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور ہاتھ سے اشارہ کر کے "وہ" اس طرح کہا کہ لوگ پیچھے پھر کے دیکھنے لگے:

حیدر آباد (دکن) میں جب تشریف لے جاتے تو آپ کے رہنے کے واسطے ایک خاص کوٹھی تھی۔ امرا اور رؤسا وہیں آپ سے ملنے آتے، آپ سب کی خاطر مدارات کرتے۔ آنریبل راجہ امیر حسن خاں صاحب والی محمود آباد (اودھ) کے زمانے میں آپ اکثر ریاست میں تشریف لے جاتے اور راجہ صاحب آپ کی بہت قدر و منزلت کرتے۔

ایک حکیم صاحب فرماتے ہیں کہ میر نفیس ایک دفعہ "دیانت الدولہ کی کربلا"[1] میں مرثیہ پڑھنے تشریف لائے۔ لوگوں کا ہجوم کثرت سے تھا۔ بیٹھنے کی جگہ نہ ملتی تھی۔ گرمی کا زمانہ تھا۔ میر صاحب نے ایک سلام پڑھا جس کا مقطع یہ تھا۔

نفیس افسوس ہم تو یہاں ہیں، دوست جا پہنچے
خراساں ہیں، نجف ہیں، روضۂ سبطِ پیمبر ہیں

اسی سلسلے میں یہ لکھ دینا بیجا نہ ہوگا کہ میر انیس مرحوم کے ایک نواسے میر احسان علی تھے رئیس تخلص کرتے تھے۔ نہایت خوش گو اور خلیق۔ نواب مرزا امجد علی خاں بہادر مرحوم رئیس "شیش محل لکھنؤ" کے داروغہ تھے۔ ابتدا میں تو میر انیس مرحوم سے اصلاح لیتے رہے۔ میر صاحب کے انتقال کے بعد اپنے ماموں میر نفیس سے مشورۂ سخن فرماتے۔ اس فن میں طبیعت ایسی مناسب پائی تھی کہ میر نفیس کا سا نقادِ سخن میر احسان علی رئیس کی شاعری کا معترف تھا۔ ایک بات یہ تھی۔ کہ میر احسان علی رئیس شہرت پسند نہ تھے۔ صرف "شیش محل" کے مشاعروں میں شریک ہوتے۔ اور وہیں اپنا تو تصنیف مرثیہ پڑھتے۔

کثرتِ کارِ سرکاری کی وجہ سے عام مشاعروں کی شرکت سے معذور رہتے۔ افسوس کہ عین جوانی میں ان کا انتقال ہو گیا۔

کلام ان کا بہت تھا جو ضائع ہو گیا، کچھ ان کے فرزند سید نبن صاحب سے ایک مرثیہ دستیاب ہوا جس کے دو ایک بند یہ ہیں۔

کھولا جو مہر نے علمِ زرنگار کو　　　پُر نور کر دیا فلکِ بے مدار کو
پایا جو خوشگوار نسیمِ بہار کو　　　وجد آگیا ہر اک شجرِ سایہ دار کو
رونق دو چند ہو گئی دنیائے زشت کی
خوشبو ہوا سے آگئی باغِ بہشت کی

اُڑ کا وہ نور کا، وہ بیاضِ سحر کا رنگ　　　تھا زرد چرخِ نیلوفری پر قمر کا رنگ
کوسوں گلوں سے تھا شفق و دشت و در کا رنگ　　　رہ رہ کے چھوٹتا تھا یہ تھا ہر شجر کا رنگ
جھونکے ہوا کے چار طرف سرد سرد تھے

---

[1] یہ کربلا لکھنؤ "تحسین گنج" میں واقع ہے اور بہت مشہور ہے۔ مولف

ذرّوں کی یہ چمک تھی کہ سہرے بھی گرد تھے

دلچسپ بلبلوں کے وہ نغمے ادھر ادھر شاخوں پہ طائروں کا وہ پھرنا کشادہ پر
گویا دلھن بنی تھی ہر اک شاخ بارور شاداب تھے یہ برگ و گل و غنچہ و ثمر
دیکھا جو رعب سبزۂ دشتِ نبرد کا
مینا اتر گیا فلک لاجورد کا

آئی نظر سحر کی سفیدی جو ناگہاں نکلے حرم سرا سے شہنشاہِ انس و جاں
اکبر نے شاہ دیں سے جو میداں میں دی اذاں آنسو بھر آئے رونے لگے بستہ زباں
بس دم زباں پہ تھا یہ ہر اک اہل دل کی
یہ آخری اذاں ہے شبیہِ رسول کی

پُرنور وہ صفیں وہ نمازی ملک سیر اک ایک حق شناس و نمودار نامور
ذی قدر یادگار جہاں غیرتِ قمر سوکھے ہوئے لبوں پہ دعائیں وہ با اثر
تھی حق کی یاد ساغرِ کوثر نظر میں تھے
گویا ملک زمیں پہ لباسِ بشر میں تھے

جب پڑھ چکے نمازِ سحر شاہِ تشنہ لب پھر دفعتاً ادھر سے بڑھی فوجِ بے ادب
تیر آ گئے جب قریبِ سپاہِ شہِ عرب غصّے سے تھرتھرا گئے سب تشنگانِ رب
راحت جو غازیوں کو نہ تھی بے لڑے ہوئے
تیغوں کو تول تول کے سب اٹھ کھڑے ہوئے

مرثیہ کی ابتدا میں تمام ہمراہیوں کا شہید ہونا اور اس کے بعد عزیزوں کا فدا ہونا، بچوں کا جامِ شہادت پینا، پھر امامِ عالی مقام کا رن کی اجازت کے واسطے خیمے میں آنا۔ ان واقعات کو مصنف نے نہایت دردناک الفاظ میں نظم کیا ہے۔ امام کی تشریف آوری پر اہلِ حرم میں جو حشر بپا تھا اس کے متعلق لکھا ہے:-

روتے ہوئے جو اندرِ خیمہ داخل ہوئے امام دوڑے سب اہلِ بیتِ رسولِ فلک مقام
آئے نظر جو یکہ و تنہا شہِ انام شہ سے کیے لپٹ کے سکینہ نے یہ کلام
اماں میں مضطرب شہِ انور کو کیا کیا
بابا ہمارے چھوٹے برادر کو کیا کیا

بیٹی سے رو کے کہنے لگے شاہِ دیں پناہ　　بی بی، شہید ہو گیا رن میں وہ رشکِ ماہ
پھٹتا تھا تشنگی سے جگر، حال تھا تباہ　　جنت میں لے گئی انہیں نہرِ لبن کی چاہ
دیکھا نہ ماں کو پھر، کہ اجل پا گئی انہیں
آغوشِ قبر دیکھ کے نیند آ گئی انہیں

بے جاں ہوئے، اب آنے کی اُن کے نہیں ہے آس　　اب ہم بھی جاتے ہیں کوئی دم میں انہیں کے پاس
رونے لگے یہ کہہ کے جو شبیرِ حق شناس　　آئیں قریب بانوئے بیکس بہ درد و یاس
فرقت جو دل پہ شاق تھی زہرا کے ماہ کی
دامن قبا کا تھام کے اک سرد آہ کی

کی عرض، دل ہے غم سے دوپار میں کیا کروں　　جز موت، اب نہیں مجھے چارا میں کیا کروں
دکھ میں کیا سبھوں نے کنارہ میں کیا کروں　　بچوں کا بھی رہا نہ سہارا میں کیا کروں
خالی ہے گود، بانوئے ناشاد لٹ گئی
اصغر سے بھی میں ظلم کے جنگل میں چھٹ گئی

لاشے سحر سے آتے ہیں اے فاطمہ کے لال　　باقی نہ پیر ہیں، نہ جواں ہیں، نہ خورد سال
غربت میں آپ بھی ہیں جو آمادۂ جدال　　سونپا کسے کنیز کو، یا شاہِ خوش خصال
سب مر چکے اب آنکھوں کا تارا نہیں کوئی
لونڈی کی زندگی کا سہارا نہیں کوئی

پورا مرثیہ اس انداز سے لکھا ہے کہ سننے والوں کا جگر شق ہوتا ہے۔ میر نفیس کو میر احسان علی رئیس کی وفات کا بہت صدمہ ہوا۔ اب ان کی یادگار اولادِ ذکور میں صرف ایک سید نبن صاحب ہیں۔

میر نفیس باوجود اس کمال کے حد درجہ منکسر مزاج تھے۔ اس رفعت کمال پر ہر ایک سے جھک کر ملتے۔ باتیں اس طرح کرتے کہ گویا کچھ جانتے نہیں ہیں۔ غرور کا کلمہ زبان پہ نہ آتا۔ اکثر کہا کرتے "مجھے تو کچھ بھی نہیں آتا ہے۔"

کسی نے تعریف کی کہ "آپ کے کلام میں بالکل میر انیس مرحوم کا رنگ ہے۔" آپ بگڑ بیٹھے اور کہنے لگے "یہ آپ نے کیا کہا وہ کجا اور میں کجا۔ ہاں ان کا ایک ادنیٰ خوشہ چیں ہوں۔ آپ نے ان کے مرتبے کو پہچانا نہیں۔"

اپنے سے چھوٹوں کے لئے بھی سلام کو پہلے آپ ہی ہاتھ اٹھاتے۔ نماز، روزے اور احکام شرع کے سخت پابند تھے۔

پچاسی برس سے زیادہ سن ہوا۔ ضعف اور نقاہت کے ساتھ عوارض بھی پیدا ہو گئے۔ چند روز بیمار رہ کر ۱۳۔ ذیقعدہ سنہ ۱۳۱۹ ہجری مطابق سنہ ۱۹۰۱ء کو انتقال فرمایا جس وقت روح لطیف نے جسم خاکی سے مفارقت کی صبح کاذب کا وقت تھا۔ تمام علمائے کرام اور عمائدین شہر شریک تجہیز و تکفین ہوئے۔ جنازے کو فوراً دریائے گومتی پر لے جا کر غسل دیا پانچ بجے شام کو غسل سے فراغت ہوئی۔ تو جنازہ "چوک" کی راہ سے سید تقی صاحب مرحوم مجتہد کے امام باڑے میں لائے۔ مجتہد العصر میر آغا صاحب مرحوم نے نماز جنازہ پڑھائی، اور میر انیس مرحوم کے مقبرہ میں مدفون ہوئے۔ آپ کے مرثیوں کا ایک حصہ طبع ہو چکا ہے۔ باقی مرثیے غیر مطبوعہ ہیں۔

آپ کے فرزند میر خورشید حسن عرف دولہا صاحب عروج کہتے ہیں کہ جناب نے مغفور نے ۲۵۔ رجب کو ایک نو تصنیف مرثیہ پڑھا۔ جس کا ایک شعر یہ تھا۔

دعائے خیر سے روح حزیں کو شاد کریں
ہمارے بعد بھی احباب ہم کو یاد کریں

اور اس کے چار مہینے بعد ذیقعدہ میں انتقال فرمایا۔ اس کو حسن اتفاق کہا جائے یا پیشین گوئی۔ نہایت کوشش سے میر نفیس مرحوم کے غیر مطبوعہ مرثیے ہم پہنچے ہیں۔ جن کا انتخاب ہم درج ذیل کرتے ہیں۔ ناظرین خود اندازہ کر لیں کہ میر صاحب کا رنگ کس قدر گہرا ہے۔

جب گیسوئے مشکیں کی گرہ شام نے کھولی　　چہرے سے ردا بیضاء خود کام نے کھولی
شمشیر و سپر لشکر اسلام نے کھولی　　خیمے میں کمر شاہ خوش انجام نے کھولی
سجدہ کیا زینب نے مصلے کو بچھا کے
مغرب کی اذانیں ہوئیں لشکر میں خدا کے

وہ شام غم انجام وہ جنگل کا اندھیرا　　نزدیک سے خیمہ نظر آتا تھا نہ ڈیرا
مہمانوں سے راحت نے جو منہ اپنا تھا پھیرا　　خود کہتی تھی وہ رات کہ دور آج ہے سویرا
تاریک شبیں ہوں گی پہ یہ بات نہ ہوگی
ایسی کبھی اے حشر تلک رات نہ ہوگی

صحرا میں غضب تھا شبِ عاشورہ کا آنا ۔۔۔ ہر چشم میں تھا تیرہ و تاریک زمانا
اس رات سے تھا قافلۂ راحت کا روانا ۔۔۔ وہ شب بھی ڈرانی تھی وہ جنگل تھا ڈرانا
شمشیرِ جفا فوجِ الم تولے ہوئے تھی
ثابت تھا کہ منہ اپنا بلا کھولے ہوئے تھی

خورشید ہوا لشکرِ ضو لے کے جو راہی ۔۔۔ دنیا میں ہوا داخلہ فوجِ سیاہی
کی شام سے آ کر شبِ تیرہ نے جو شاہی ۔۔۔ عالم میں ہوئی روشنی آنے کی مناہی
جب سلطنتِ نور لٹی کون و مکاں میں
ظلمت کا عمل بیٹھ گیا ایک جہاں میں

تھا غرب سے تا شرق کسی جا نہ اجالا ۔۔۔ خالی کہیں ظلمت سے نہ پستی تھی نہ بالا
رنگ اپنا سیاہی نے درختوں پہ جو ڈالا ۔۔۔ پتا بھی ہر اک سبز نظر آتا تھا کالا
ضو خلق سے معدوم تہِ چرخِ بریں تھی
اک نقطۂ سیاہی کا زمانے کی زمیں تھی

عالم میں جو ظلمت تھی سرِ شام سے پھیلی ۔۔۔ افلاک پہ رنگت تھی ستاروں کی بھی میلی
ضو تھی نہ زحل میں نہ وہ تھا نورِ سہیلی ۔۔۔ تھی رات کو برپا تھا سیہ خیمۂ لیلی
خارِ غم و اندوہ ہر اک دل میں گڑا تھا
پنہاں تھی ضیا خلق میں اندھیر پڑا تھا

وہ شام، وہ غربت، وہ سیاہی، وہ بیاباں ۔۔۔ نہ روشنیِ شمع کسی جا نہ چراغاں
پھرتی تھیں نبی زادیاں سب مضطر و حیراں ۔۔۔ ڈھلکی تھی ردا بال تھے زینب کے پریشاں
فرماتی تھیں کل حشر بپا ہوئے گا لوگو
یہ رات جو گزرے گی تو کیا ہوئے گا لوگو

اس مرثیے میں میر صاحب نے شبِ عاشور کا واقعہ نظم کیا ہے۔ پھر تاریکیِ شب کا سین (منظر) دکھایا ہے۔ بعدہٗ لکھا ہے کہ امام علیہ السلام نمازِ عشا سے فرصت کر کے مناجات میں مشغول ہوئے، سحر ہوئی، یاور و انصار دوپہر تک قتل ہوتے رہے، پھر علی اصغر شہید ہوئے۔ اور حضرت بانو کا بین تو دردناک طور پر نظم کیا ہے

اے بانوئے غمدیدہ و مضطر ادھر آؤ ۔۔۔ اب صبر کرو اشک نہ آنکھوں سے بہاؤ

تکیئے علی اصغر کے نہ چھاتی سے لگاؤ   مر جاؤ گی گہوارے کے نزدیک نہ جاؤ
حلقے میں ہیں آفت کے، تباہی میں پڑے ہیں
رکھ دو کہیں، اُن کے جو یہ ہیکل، یہ کڑے ہیں

یہ سنتے ہی سر پیٹ کے بانو یہ پکاری   ہے ہے مرے اصغر تری تربت کے میں واری
تم چھٹ گئے کیوں کر نہ کروں گریہ و زاری   خالی ہوئی یاں آکے بھری گود ہماری
جینے کی نہیں، گر نہ تمہیں پاؤں گی بیٹا
میں بیٹھے ہی بیٹھے مر جاؤں گی بیٹا

یاد آتا ہے اماں کو تمہارا وہ ہمکنا   وہ پھول سا رُخ، نرگسی آنکھیں وہ جھپکنا
منہ کھول کے ہر بار مرے منہ کو وہ تکنا   جھولے میں وہ بے دودھ وہ بے آب بلکنا
طاقت نہیں ماں کے دلِ بے صبر میں بیٹا
کیونکر تمہیں آرام ملا قبر میں بیٹا

دلارام کی بارہ دری میں ماہِ رجب کی سالانہ مجلس تھی سامعین رؤسا، امراو بہر سے جمع تھے میر صاحب کو تشریف لانے میں کسی قدر توقف ہو گیا، آتے ہی دیکھا کہ ماشاء اللہ مجلس بھری ہے۔ گرمی کا زمانہ ہے، لوگ اکتا رہے ہیں۔ آپ ممبر پر تشریف لے گئے۔ فرمایا "التماس دعا ہے" سب نے دعا مانگی، آپ نے ایک رباعی پڑھی۔ رباعی

مر جائے جو فرزند تو کیا چارا ہے   ہاں! صبر علاجِ دلِ صد پارا ہے
اصغر کو لٹا کے شہ نے تربت میں کہا   آرام کرو اب یہی گہوارا ہے

چند رباعیوں کے بعد مرثیہ شروع کیا:-

پھر طبعِ سلیم انجمن آرائے سخن ہے   پھر دیدۂ دل عاشقِ سلمائے سخن ہے
پھر جلوہ کناں چہرۂ زیبائے سخن ہے   پھر مشک فشاں طرۂ لیلائے سخن ہے
پھر خضرِ قلم بادیہ پیمائے سخن ہے   پھر یوسفِ دل محوِ زلیخائے سخن ہے
پھر پیشِ نظر طورِ تجلائے سخن ہے   پھر طبع کو ذوقِ منّ و سلوائے سخن ہے
یاد آگیا پھر لب کو مزا شہدِ سخن کا
پھر آج زباں کھولتی ہے قفل دہن کا

یہ مرثیہ حضرت قاسم کے حالات کی نسبت ہے۔ ایک مقام پر لکھتے ہیں:-

ہاں! شادی و ماتم کا مرقع ہے یہ عالم — غم میں کہیں شادی ہے، کہیں بیاہ میں ماتم
رقّت بھی ہے، عشرت کی بھی محفل ہے فراہم — بکھرائے ہے گیسو شبِ عاشورِ محرم
دیکھا نہ سُنا بیاہ میں اس رنج و محن کو
دولھا کو نہ پانی ہے میسر نہ دلھن کو

غربت میں مصیبت ہے، تلاطم ہے، قلق ہے — نوشاہ کی ماں خوش ہے، مگر رنگ بھی فق ہے
ماں چُپ ہے دلھن کی، یہ جگر سینے میں شق ہو — اشکوں کو جو روکا ہے، تو چہرے پہ عرق ہے
کہتی ہے میں حیراں ہوں یہ کیا ہوتا ہے لوگو
شادی ہے کہ سامانِ عزا ہوتا ہے لوگو



نواب خلد آشیاں

نواب کلب علی خاں بہادر خلد آشیاں کے احسان اردو علم ادب کے طبقے پر بہت ہیں اگر زمانے کے ہر دور کے لئے کوئی مخصوص نام ہوتا تو ہم نواب خلد آشیاں کے زمانے کو علمی قدر دانی کا دور کہتے ۔ اس لئے کہ ان کی علمی قدر افزائیوں کی روئیداد ایسی باعظمت ہے جو کبھی مٹانے سے نہیں مٹ سکتی ۔ دربار رامپور ہی کی بدولت ہندوستانی منطق و فلسفہ کو ترقی ہوئی ۔ اسی باعظمت دربار کی صحبت میں بیٹھکر لوگوں نے شاعری سیکھی ۔ اسی دربار کی بیش بہا فیاضیوں نے ایسے ایسے شعراء، نامدار ثقات اہل کمال پیدا کئے جن میں ہر ایک کا نام قیامت تک قدر شناسوں کی نگاہوں میں آفتاب کی طرح روشن رہیگا ۔ نواب خلد آشیاں جن کی عمر عزیز کے پر تکلف کارنامے والیان ملک کے لئے دستور العمل بن سکتے ہیں عیش پرستی کی تمام محفلیں تغیرات زمانہ سے درہم و برہم ہو جاتی ہیں ۔ مگر علمی فیاضیوں کے جلسے ہمیشہ دیر پا ثابت ہوئے ۔ اور ان میں انقلاب عالم سے ایک نیا لطف پیدا ہو جاتا ہے ۔

"خلد آشیاں"[۲۴] نواب یوسف علی خان بہادر ناظم کے فرزند رشید تھے ۔ آپ ذیقعدہ کی چوبیسویں تاریخ یوم جمعہ وقت طلوع آفتاب ۱۲۸۱ھ میں سریر آرائے سلطنت ہوئے ۔ سلامی کی توپیں سر ہوئیں ۔ نوبتخانوں کی صدائیں بلند ہوئیں ۔ تہنیت کے نغموں سے تمام رعایا شاد ہوئی ۔ ارکان دولت نے نذریں پیش کیں ۔ مگر مذہبی پابندی کا یہ لحاظ تھا کہ فی الفور آپ نماز جمعہ کے لئے مسجد تشریف لے گئے ۔ بعد ادائے نماز دعا و دست فرمائی جشن برپا ہوا ۔ رعیت نوازی تو ایسی کی کہ غلے وغیرہ کے محصول میں ایک لاکھ روپئے سال کی آمدنی ریاست کو تھی جلوس فرماتے ہی یہ محصول معاف فرما دیا ۔

سال بھر کے بعد مسٹر جان انگلس ریاست میں تشریف لائے حضور معہ ارکان خاص دیوان خانے میں رونق افروز ہوئے ۔ بڑی دھوم دھام سے گورنمنٹ کی طرف سے دستار بندی کی رسم ادا ہوئی اس جشن کے دوسرے روز تمام علماء کو خلعت تقسیم ہوئے ۔ شعراء کی تنخواہوں میں اضافہ ہوا تھوڑے دنوں کے بعد ملکہ معظمہ کی طرف سے مسند نشینی کا خلعت آیا ۔ اس خوشی کا جلسہ بہت دھوم سے ہوا

حکّام عالیمقام شریک جلسہ ہوئے۔ روہیلکھنڈ کے تمام راجہ اور رؤسا جو ریاست کو ہمیشہ نذریں دیتے تھے۔ حاضر ہوئے۔ نہایت دھوم سے جلسہ ہوا۔ اور سواری جلوس کی نہایت شان و شوکت سے نکلی۔ دو لاکھ روپیہ اس جشن میں صرف ہوا۔

عمارتوں کا شوق ہوا تو مسجد جامع۔ سرائے۔ اصطبل۔ فیلخانے۔ گاؤخانے۔ فراشخانے وغیرہ تیار ہوئے۔ بازار پُرتکلف بنائے گئے۔ خسرو باغ میں کوٹھی۔ نہایت شان و شوکت کی بنوائی۔ ایک کوٹھی در دولت کے قریب تعمیر ہوئی۔ بینظیر اور بدر منیر کے نام سے دو باغ پختہ بنوائے اور وہاں ہر سال بینظیر میلے کی بنیاد ڈالی تاجروں کے لئے ہر قسم کے مال کا محصول معاف فرمایا۔ اس لئے کہ میلے میں ہجوم زیادہ ہو۔ نواب گورنر جنرل بہادر نے محکمہ کونسل دارالسلطنت کلکتہ کی ممبری کے لئے دریافت کیا۔ آپ نے قبول فرمائی۔ اور چار سو آدمی ہمراہ لیکر کلکتے تشریف لے گئے۔ اور شریک کونسل ہوئے۔ سنہ ۱۲۸۵ھ میں صاحبزادہ محمد ذوالفقار علی خاں بہادر کی شادی بہت دھوم سے کی سنہ ۱۲۸۶ھ میں شہزادہ ڈیوک آف آڈنبرا ہندوستان تشریف لائے۔ خلد آشیاں نے آگرہ میں ان سے تزک و احتشام سے ملاقات کی۔ سنہ ۱۲۸۹ھ میں زیارت حرمین شریفین کا ارادہ فرمایا۔ تمام مالی و ملکی معاملات سے دست بردار ہوگئے۔ اور تمام رعایائے مضافات ریاست سے عمال کے ذریعہ سے عفو حقوق کی درخواست کی۔ اور خود بنفس نفیس جمعہ کو جامع مسجد میں بآواز بلند اپنے حقوق سے تمام رعایا کو بری الذمہ کیا۔ ماہ شوال کی ساتویں تاریخ ظہر کے وقت جہاز پر سوار ہوئے۔ سنہ ۱۲۹۰ھ چھٹی محرم کو زیارت حرمین شریفین سے مشرف ہوکر مع الخیر ریاست میں واپس آئے۔

مہاراجہ بہادر والی ریاست گوالیار شوق دیدار میں ملاقات کو تشریف لائے۔ اور جو کچھ ریاست کی تعریف سُنی تھی اس سے زیادہ خلیق اور ملنسار پایا۔

رئیس ٹہری اور نواب لوہارو کا تشریف لانا اور ریاست کی تعریف میں رطب اللسان جانا۔ مشہور عام ہے۔ نواب جاورہ۔ رئیس اندور، مہاراجہ پٹیالہ، بیگم صاحبہ بھوپال، مہاراجہ بنارس مہاراجہ وزیانگرم وغیرہ سے اتحاد اور مستحکم دوستی تھی۔ سلسلۂ نقشبندیہ میں مولانا عبدالرشید صاحب مرحوم سے بیعت تھی۔

علمی مذاق نے تالیف اور تصنیف کی طرف راغب کیا۔ پہلے نثر نویسی کی طرف توجہ رہی۔ اردو، فارسی کے نثر مضامین بلبل نغمہ سنج، ترانۂ غم، قندیل حرم، اور شگوفہ خسروی کے نام سے کتاب کی صورت میں نہایت پاکیزہ کاغذ پر چھپکر تقسیم ہوئے۔ تاج فرخی کے نام سے

ایک دیوان فارسی طبع ہوا نشۂ خسروانی پہلے اردو دیوان کا نام ہے۔ دستنبوری خاقانی اردو کا دوسرا دیوان ہے۔ درۃ الانتخاب، تیسرا دیوان اردو کا ہے۔ توقیع سخن، چوتھے دیوان کا نام ہے۔ یہ چاروں دیوان اردو میں بے مثل ہیں۔ متروکات سے بہت پرہیز کیا۔ جدید الفاظ غلط تلاش کر کے ترک کیے۔ چوتھے دیوان میں یہ التزام کیا ہے کہ الف ہندی جو آخر لفظ میں آیا وہ بھی تقطیع میں نہیں گرایا۔

اعلان نون بحالت اضافت اخفائے نون بغیر اضافت سے پرہیز کیا ہے۔ ان قیدوں پر کلام مزے سے نہیں گرنے پایا۔ جو کچھ فرمایا وہ پسند طبع خاص وعام ہوا بہت سی غزلیں زبان زد ہیں۔ کلام نہایت پاکیزہ ہے۔ چند اشعار پر اکتفا کی جاتی ہے۔

انتخاب کلام

اُس کی بے داد پر تو مرتا ہوں　　لطف کرتا تو کیا ستم ہوتا

تیرا تو مشغلہ ہے یہ نواب رات دن　　میں روز سیتے سیتے گریبان تھک گیا

عاشق ہوا ہوں دل سے خدا کے حبیب کا　　حقا کہ مثل ہی نہیں میرے رقیب کا

قصۂ زیست تھا دراز مگر　　اُس نے دو باتوں میں تمام کیا

الٰہی کیا کرے گا حشر میں وہ نامراد آخر　　جسے آتا نہ ہو کوئی طریقہ دادخواہی کا

ہم تو رو رو کے جاتے رہے الفت اپنی　　زیر لب ہنس کے وہ کہتے رہے ہر بار عبث

دیوانہ گر کہیں گے تو مجھکو کہیں گے لوگ　　تم کیوں ہو مضطرب مجھے بیتاب دیکھکر

نہ نکلے عشق میں اُف منہ سے اے دل　　جہاں کی بات ہو رکھنا وہیں تک

سیر ہو حشر میں جب داورِ محشر پوچھے — حالِ دل اور میں اس شوخ کی صورت دیکھوں

قاصد کو بھیجتا ہوں تو شوخی کی راہ سے — میرا ہی نامہ بھیجتے ہیں وہ جواب میں

کروں میں ابتدا کس سے الٰہی — تمنائیں ہیں دل میں انتہا کی

عیش کا نام نہ لیتا کبھی عالم میں کوئی — ہم سے دو چار بھی ہوتے جو رُلانیوالے

بھیج دے ساری بلائیں کہ ذرا دل بہلے — اے فلک سوچ تو کیسی شبِ تنہائی ہے

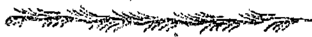
لازم ہے ایک قبر مری ہر گلی میں ہو — تا بعد میرے نام مرا کو بکو رہے

نامہ یہ کس کو لکھا ہے جو کبوتر سیکڑوں — میرے آگے بیٹھے ہیں مشتاق پر کھولے ہوئے

بیخودی کا اب یہ نقشہ ہے کہ ہم — شکوے کرتے ہیں تری تصویر سے

پھائے مرہم کے الگ رکھنا مرے ناسور سے — ان کو میں فردوس میں بدلوں گا چشمِ حور سے

نواب کی صحبت میں ہندوستان کے سرمایۂ ناز اساتذہ موجود رہتے تھے۔ غزل کی اصلاح منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی مرحوم سے لی۔ خود بھی نقاد تھے۔ طبیعت میں دو دنی ترقی ہوگئی۔



وسیم خیرآبادی

سید محمد عسکری صاحب وسیم خیرآبادی منشی امیر احمد صاحب امیر مرحوم کے ارشد تلامذہ میں ہیں۔ ان کو منشی صاحب مرحوم کی صحبت میں رہنے کا اتفاق بہت رہا ہے۔ امیر اللغات کی ایک جلد کی ترتیب بھی انہیں نے کی ہے۔ منشی صاحب نے خیابانِ آفرینش کی ایک تاریخ پر خود ان کو اپنے ہاتھ سے تلمیذ رشید لکھا ہے۔ بہت مدت تک آپ مہاراجہ صاحب جونپور کے دربار میں بزمرۂ شعرا ملازم رہ چکے ہیں۔ تحقیق وصحت الفاظ کا ان کو بہت شوق ہے۔ ہندوستان کے اطراف وجوانب میں ان کے بہت سے شاگرد ہیں۔ رسالہ گلچیں عرصۂ دراز سے مختلف مقامات سے شایع ہوتا رہا ہے۔ گورکھپور سے نکلا۔ اس کے بعد لکھنؤ میں آیا۔ اب خیرآباد سے نکلتا ہے۔ اس کے ایڈیٹر منشی وسیم صاحب ہیں۔ خیابانِ آفرینش کی جو تاریخ آپ نے لکھی ہے۔ اس میں انتہا کا نازک تخرجہ لکھا ہے۔ کہتے ہیں ؎

ہے عجب صنعت میں تاریخ وسیم
وصفِ ذاتِ احمدِ بے میم ہے

پورے مصرعہ میں تاریخ ہے۔ اور اعداد میم کا تخرجہ ہے۔ ایسی تاریخیں حسنِ اتفاق سے نکلتی ہیں۔ وسیم ان کمالات کے ساتھ حد کے منکسر مزاج آدمی ہیں۔ تغزل کا رنگ منشی ریاض احمد صاحب ریاض خیرآبادی سے ملتا ہے ؎

تم وصل کی شب خوبیٔ قسمت ہو کسی کی — پہلو میں جو آجاؤ طبیعت ہو کسی کی
لیلیٰ سے کہو نجد میں بے پردہ نہ آئے — جامے سے نہ باہر کہیں وحشت ہو کسی کی
منہ چوم لوں کیا بات شبِ وصل کہی ہے — پھر کیا ہو جو بگڑیں نزاکت ہو کسی کی

دیوانہ وسیم آئے تو ذمہ ہے ہمارا
پرسش بھی اگر روزِ قیامت ہو کسی کی

منشی صاحب مرحوم کے زمانۂ حیات میں ایک طرح ہوئی تھی جس میں منشی صاحب کے تمام شاگردوں میں ریاض کے بعد وسیم کی غزل سب سے اچھی رہی تھی ؎

تیر آئیں دل میں اک دن کے لئے — حسرتیں بیتاب ہیں ان کے لئے
ہائے کیا آئی جوانی کیا گئی — کر گئی بدنام دو دن کے لئے
وہ گھٹا اٹھی ہے پی لو واعظو — ورنہ پھر ترسو گے اس دن کے لئے
غش ہوئے موسیٰ تو آئی یہ صدا — پردہ ہم کرتے تھے اس دن کے لئے

منشی صاحب کے وقت میں "پیام یار" میں ایک طرح ہوئی ہے

پری خانہ بنا رکھا ہے بیٹے اپنے زنداں کو

منشی وسیم صاحب کی غزل اسمیں بھی معرکۃ الآرا ہوئی ہے

دیا سر تیغ کو، دم تیر کو، دل اسکے پیکاں کو — قیامت ہے وہ بت اب بھی نہ مانے میرے احساں کو
بھرے بیٹھی ہیں حسرتیں کہیں یہ ارمانوں کا مجمع ہے — کہ رستہ دل میں آنیکا نہیں ملتا ہے پیکاں کو

وسیم اس در پہ جب جاتا ہے درباں ٹوک دیتا ہے
الٰہی جلد جھٹلا دے قضا آوازہ درباں کو

غمخواروں میں ہوں۔ بازاروں میں ہوں۔ اس میں منشی صاحب مرحوم نے بے مثل غزل کہی ہے۔ اس کے علاوہ حکیم جلال مرحوم، تسلیم مرحوم، داغ مرحوم کی غزلیں بہت اچھی ہو چکی ہیں۔ لیکن منشی وسیم نے اس طرح میں بھی اپنی جدت طبع دکھائی ہے

جب کہا چتون نے اسکی میں ستمگاروں میں ہوں — بول اٹھی چین جبیں میں بھی جفا کاروں میں ہوں
دل ہے کیا شے جس حسیں کے پاس بیچا ہو نہیں — وہ یہی کہتا ہے میں اس کے خریداروں میں ہوں
خلد ہی میں دی جگہ رحمت نے اس کی حشر میں — لاکھ میں نے یہ کہا میں تو گنہگاروں میں ہوں

عیب کوئی تھا کہ نہ ٹھہرا جنس عصیاں کا وسیم
اس کی رحمت بول اٹھی میں خریداروں میں ہوں

غزل کے علاوہ منشی وسیم صاحب نے اور بھی اصناف سخن میں جوہر کمالات دکھائے ہیں۔

قطعات تاریخ آنریبل سر راجہ محمد علی محمد خاں صاحب بہادر کے۔ سی۔ آئی۔ آئی۔ والی ریاست محمود آباد دام اقبالہ کے فرزند مسعود کی ولادت کے لکھے ہیں۔ بحر مخفوف مسدس میں ایک بہاریہ قطعہ لکھا ہے۔ اسی بحر میں پورے مصرعہ سے تاریخ نکالی ہے ۔

وہ پھل باغ مراد کا ہے

۲ ۱۳ ہجری

یہ قطعہ تاریخ پورا قصیدہ ہے تشبیب اور گریز نہایت نازک رکھی ہے ؎

کس ناز سے آئی ہے بہار آج | جو گل ہے چمن میں ہنس رہا ہے
آنے سے بہار کے ہر اک گل | کیا باغ و بہار ہو رہا ہے
اب جوشِ بہار و عکسِ گل سے | ہر ذرہ نمونہ پھول کا ہے
گلشن کی زمیں ہے گل زمیں آب | ہے صورتِ گل جو نقش پا ہے
ہر غنچہ خوشی سے ہے شگفتہ | ہر پیڑ نہال ہو رہا ہے

اسی طرح بہت بڑی تشبیب کے بعد گریز کرتے ہیں ؎

آقا مرے باغ باغ ہیں آج | گل نخل امید کا کھلا ہے

اس کے بعد ایک بہت بڑا قطعہ لکھا ہے جس کے ہر مصرع سے تاریخ ولادت نکلتی ہے اور بہت سی تاریخوں میں صنعتیں ہیں۔ نئے نئے تخرجے اور نئے نئے تعمئے۔ یہ قطعات ایک کتابی صورت میں چھپے ہیں۔

اس کے ماسوا قصائد میں بھی وسیم صاحب کو ید طولیٰ حاصل ہے۔ بہت سے قصیدے مشکل ردیف و قافیوں میں کہے ہیں۔ حال میں ریاست گوالیار سے ایک خبر آئی کہ والیِ ریاست کے یہاں فرزند پیدا ہوا ہے اور ایک بہت بڑا جلسہ ہونے والا ہے جس میں تمام امراء و رؤسا جمع ہونگے۔ اور شعراء بھی قصائد تہنیت لکھیں گے۔

جناب مضطر خیر آبادی نے شعرا کی طبع آزمائی کے لئے مصرع طرح بھی شایع کیا ؎

تجھے اے موتیوں والے نیا گوہر مبارک ہو

بہت سے شعرا نے طبع آزمائی کی۔ اور خیال ہوا کہ جب ریاست کی طرف سے ایسی تحریک ہوئی ہے۔ اور ریاست کے ایک خاص شخص نے مصرع طرح مقرر کیا ہے تو امید ہے کہ شعرا کو انعام بھی حوصلے سے زیادہ ملیگا۔ شعرا نے دل کھول کے قصیدے لکھے۔ اور بہت سے لوگ بہ امید عزت افزائی گوالیار میں پہنچے۔ لکھنؤ سے صفدر صاحب مرزا پوری۔ شاکر میرٹھی وغیرہ وغیرہ اور دوسرے مقامات سے بھی شعرا آگئے۔

وسیم صاحب نے بھی معرکۃ الآرا اسی طرح میں ایک قصیدہ لکھا ظاہر ہے کہ یہ طرح قصیدے کی شان کے لائق نہ تھی۔ اور اس طرح میں قصیدہ کہنا مشکل تھا۔ گر وسیم صاحب نے یہی نہیں کیا کہ قصیدہ کہا ہو۔ بلکہ قصیدے میں ولادت کی تاریخیں بہت سی صنعتوں میں لکھیں۔ اور

گوالیار پہنچے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ وسیم صاحب کا قصیدہ سب سے اچھا رہیگا۔ اور سب سے زیادہ انعام ان کو ملیگا۔ مگر وہاں جاکر معلوم ہوا کہ یہ دعوتِ شعرا ریاست کی طرف سے نہیں ہے بعض اراکین ریاست نے ایک جلسہ قرار دیا ہے۔ البتہ جو شعرا تشریف لائے ہیں اُن کو انعام ریاست کی طرف سے ملیگا۔ جلسے کے روز سب نے اپنے اپنے قصائد پڑھے۔ ریاست میں ایسے لوگ کم تھے جو دادِ سخن دینے کی کامل قابلیت رکھتے ہوں۔ ہم بعض بعض اشعار وسیم صاحب کے درج کرتے ہیں

تجھے اے ساقیٔ گل روے احمر مبارک ہو
مبارک ہو خُم تجھے شیشہ و ساغر مبارک ہو

التزام میکشی کو کس طرح نباہا ہے۔

لگائے اس کے دل پر سنگِ جو بن دخترِ رز کا ۔۔۔ مبارک ہو دل مینا کو یہ پتھر مبارک ہو
لپک جائے فلک تک شعلہ ہائے آتشِ مے کی ۔۔۔ پری کو شیشے کی اُڑنے کو یہ شہ پر مبارک ہو
اتار اب طاق سے شیشے کو ساقی جوشِ نشہ میں ۔۔۔ ترے ستون کو سپر گنبد اخضر مبارک ہو

اسی قصیدے کی تشبیب میں نشہ مے کی تعریف کے ساتھ متعلق محفل کا بیان کیا ہے جسکو آج تک کسی قصیدہ گو نے نہیں لکھا۔

دکھائے جامِ شکل حالِ عالم مثلِ جامِ جم ۔۔۔ تجھے اک دم میں ساقی سیر بحر و بر مبارک ہو
زمین و چرخ کی نیرنگیاں آئینہ ہوں تجھ پر ۔۔۔ تجھے گلگشت ہفت اقلیم و ہفت اختر مبارک ہو
مبارک ہو نظارہ جلوہ کوہ قاف کا تجھکو ۔۔۔ تجھے سیر بہار قلزم خضر مبارک ہو
مبارک ہیں چرخ وارض تجھکو بزم آرائی ۔۔۔ سماں ارض گردوں نغمۂ دلبر مبارک ہو
قریب بزم اور بنگ ہوا پر شعلہ رو ٹھہریں ۔۔۔ تجھے رقص حسینان زمرد پر مبارک ہو
تری محفل سے شرمندہ ہو محفل راجہ اندر کی ۔۔۔ زمیں پر رقص پریاں سیمیں بر مبارک ہو
ہوا پر نغمہ زن بلبل ہوا پر شعلہ رقصاں ہوں ۔۔۔ نئے گلرو، نیا گلشن، نیا منظر مبارک ہو

اس تشبیب کے بعد گریز اور گریز کے بعد تاریخی مصارع ہیں۔

پتا تاریخ وسیم مدح گو ہے سال ہجری میں
کہ یہ گلزار زینت کا گل احمر مبارک ہو

۱۳ ۳۴ ہجری

ایک مصرع پانچ عدد کے تعمیہ کے ساتھ ہے۔

مہاراجہ! یہ فرزند پری پیکر مبارک ہو   مہا کے منہ سے یہ کیسا ہمایوں یہ پری مصرع

شعرا کو سخت افسوس ہوا کہ یہ جلسہ ریاست کی طرف سے نہیں تھا لیکن یہ معلوم کرکے کچھ اطمینان ہوا تھا کہ شعرا کو ریاست کی طرف قصاید کا صلہ عطا ہوگا۔ اور خارجاً یہ بھی افواہ سنی گئی کہ دو ہزار روپیہ دینا ریاست نے منظور کیا ہے۔ مگر ابھی تک شعرا متوقع ہیں۔ وسیم پرانے مشاق شاعر ہیں اور آپ کی مشق سخن چالیس پینتالیس سال کی ہے اور منشی صاحب مرحوم کی صحبت میں رہنے کا بہت اتفاق ہوا ہے۔ دفتر امیر اللغات میں مدت تک کام کیا ہے۔

اب سنا گیا ہے کہ ریاست حیدرآباد میں اردو یونیورسٹی قایم ہونیوالی ہے۔ اور اس صیغہ میں اردو زبان والوں کے لئے بہت جگہ ہوگی۔ اگر ریاست اس وقت کے موجودہ چند سن رسیدہ شاعروں کو یونیورسٹی میں لے لے۔ تو زبان کا آغاز با اصول ہو جائیگا اور یہ لوگ چراغ سحری ہیں۔ چند روز سے زیادہ ریاست کا نمک نہیں کھا سکتے۔ ہمارے نزدیک جناب وسیم۔ جناب ریاض۔ جناب کوثر۔ جناب نظم طباطبائی۔ جناب رشید۔ جناب فصاحت۔ جناب افضل۔ جناب انجم لکھنوی۔ جناب بیخود دہلوی۔ وغیرہ کو اردو یونیورسٹی میں داخل ہونا ضروری ہے۔ تاکہ اس کی ابتدا با اصول قایم ہو اور یہ بات یادگار رہ جائے گی۔ کہ یونیورسٹی میں ایسے ایسے سخن سنج لوگ داخل تھے۔ ایسے چند نفوس پھر زمانہ پیدا نہ کریگا آجکل ان کا وجود اردو کے لئے غنیمت ہے۔

ہوس دہلوی

نواب مرزا محمد تقی خاں ہوس شوستری خلف نواب مرزا علی خاں ولاور جنگ ابن موتمن الدولہ نواب محمد اسحاق خاں صوبہ دار گجرات۔

مالک بن ابراہیم کی نسل سے ہیں۔ اور کہا جاتا ہے کہ نواب محمد اسحاق خاں محمد شاہ بادشاہ دہلی کی طرف سے صوبہ دار مقرر ہوئے۔ اور امت الزہرا بیگم معروف بہ بہو بیگم صاحبہ جو زوجہ نواب شجاع الداولہ بہادر موتمن الدولہ بہادر کی بیٹی اور نواب مرزا علی خاں ولاور جنگ کی حقیقی بہن تھیں۔ اس صورت میں نواب مرزا محمد تقی خاں ہوس بہو بیگم کے بھتیجے ہوتے ہیں۔ مگر خلاصہ تاریخ اودھ کا مصنف لکھتا ہے کہ نواب محمد اسحاق خاں کی کوئی اولاد جیتی نہ تھی اس سبب سے محمد شاہ بادشاہ دہلی نے بہو بیگم صاحبہ کو اپنی بیٹی بنایا تھا۔ اور شادی بھی محمد شاہ بادشاہ نے ان کی کی۔ بلکہ نواب محمد اسحاق خاں نے بادشاہ سے کہا میری کوئی اولاد نہیں ہے اس کی شادی مجھے کرنے کی اجازت دیجئے۔ بادشاہ نے منظور نہ کیا اور کہا تم کو جس قدر دینا ہو بطور نوید کے دے سکتے ہو۔ تو نواب محمد اسحاق خاں نے اپنا تمام زر، زیور، جواہرات، مال و اسباب بطور نوید پیش کیا۔ اور بائیسوں صوبہ داروں نے اپنے حوصلے سے زیادہ نوید میں زر و جواہر دیا۔ شادی کے وقت ان کی عمر ۱۴ برس کی تھی سنہ ۱۱۵۰ھ میں ان کی شادی ہوئی

اس کے علاوہ وثیقے میں بھی کہیں مرزا محمد تقی خاں ہوس کا نام نہیں ہے کیونکہ بہو بیگم صاحبہ نے ستر لاکھ روپیہ اپنے اعزا اور ملازمین کے وثیقے میں جمع کیا۔ اس میں مرزا علی خاں کے نام وثیقہ ہے اور ان کو اپنا بھائی بیان کیا ہے لیکن ان کی کسی اولاد کا ذکر نہیں ہے۔ اسی طرح سالار جنگ کو اپنا بھائی بیان کیا ہے۔ ان کے تین بیٹے مرزا قاسم علی خاں مرزا اکبر علی خاں مرزا اصغر علی خاں کا ایک ایک ہزار روپیہ وثیقہ بھی لکھا ہے۔ بلکہ ان کے اور متعلقین مرزا جوہر مرزا مہتر مرزا عباس تک کی تنخواہ درج ہے۔ ممکن ہے کہ یہ بھائی مختلف البطون ہوں۔ تو بھی ہوس کا نام وثیقہ میں ضرور ہوتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا محمد تقی خاں کو یہ کیا ہوا کہ یہ کل تملک تو کچھ فرزند نہ تھے

دوسرا شبہ یہ ہوتا ہے کہ ہوس بی لطف النسا اسی دام میں یا کہ اسیر بے پر و بال تھا

تخلص ہوس تھا۔ ان کی تنخواہ بہت تھی اور ان کے بیٹے مرزا حیدر تھے یہ مرزا والاجاہ کے مورث اعلیٰ تھے۔ مگر اس کی تصدیق کسی صحیح تاریخ سے نہیں ملتی مرزا محمد تقی خاں ہوس کا طرز کلام بتاتا ہے کہ وہ دہلوی تھے اور دہلی کی زبان نظم کرتے تھے نواب بہو بیگم صاحبہ کے تمام خاندان کے لوگ لکھنؤ کی زبان استعمال کرتے تھے۔

منشی قمر صاحب نے بھی بیان کیا کہ میں نے مرزا علی خاں بہادر کو دیکھا ہے وہ معالی خاں کی سرائے میں رہتے تھے۔ ان کی اولاد میں ہوس نہ تھے۔ یہ کوئی دوسرے شاعر تھے اور مرزا محمد تقی خاں بی لطف النسا کے شوہر کو تو میں جانتا ہوں وہ آتش کے شاگرد تھے۔ ان کا تخلص مجھے یاد نہیں۔ مرزا محمد تقی خاں ہوس میر تقی میر کے ہمعصر تھے۔ بہرحال ہوس دہلی کے رہنے والے تھے۔ اور دہلی سے فیض آباد عہد نواب شجاع الدولہ بہادر میں آئے تھے۔

عہد آصف الدولہ میں فیض آباد سے لکھنؤ تشریف لائے اور محلہ مفتی گنج میں سکونت اختیار کی۔ میر تقی میر کے زمانے میں ان کی اس قدر شہرت نہ تھی۔ ابتدائی شاعری تھی۔ ناسخ کی طرح متروکات زبان انہوں نے بھی قایم کیے۔ اور جو کچھ کہا دہلی کے رنگ میں کہا مشاعروں میں کم شریک ہوتے تھے طبیعت میں رنگینی اور کلام میں بہت شوخی تھی۔

معاملہ بندی میں مشہور ہوئے۔ آخر میں بہت شہرت پائی۔ یہ بات مشہور ہے کہ دہلی والے متروکات کا پرہیز نہیں کرتے۔ مگر ہوس کے کلام میں میر کے زمانے کے متروک الفاظ کہیں نظر نہیں آتے۔ نہ "ٹک" ہے نہ "ٹپٹ" ہے۔ نہ "سجن" نہ "لالیاں کالیاں" ہیں بعض جگہ "میاں" کا لفظ نظم کیا ہے۔ جیسے ؎

صحرا ہی میں مسکن ہے نہ گلزار میں وقفہ
گھر بھولے ہیں سو ڈھونڈتے پھرتے ہیں میاں ہم

پہلے آپ میر تخلص کرتے تھے لیکن جب میر تقی میر لکھنؤ میں تشریف لائے اور ان کی شاعری کے ڈنکے بجنے لگے۔ تو آپ نے سوء ادبی سمجھ کر اپنا تخلص ہوس کر دیا جس کو ایک مقطع میں ادا کرتے ہیں۔ ؎

سُن کر ہوس کے شعر کو اُس شوخ نے کہا
کچھ آگے نام اور تھا یہ نام اب ہوا

بعض متروک الفاظ ان کے کلام میں موجود ہیں جس سے
اثر کب نہیں ہوئے تھے ؎

حسینوں بہرِ خدا اپنے دل میں جا گہ دو
انہیں چھوٹے ہیں بے یار بے دیار رہوں میں

اس میں بجائے جگہ کے جاگہ نظم کیا ہے لیکن پھر بھی ہوسؔ نے بہت کچھ زبان کو صاف کیا اور فنِ شعر میں صفائی، بندش، برجستگی، شستگی، رفتگی، شکوہ الفاظ، سب ہی کچھ موجود ہے۔ دیوان غیر مطبوعہ نہایت ضخیم ہے سے

جوانی ہو چکی پیری سے اب و چار رہو نہیں		خزاں رسیدہ ہوں واماندہ بہار رہوں میں
جلا کے راکھ کرائے سوزِ دل مرا تنِ زار		تری مدد سے کسی دوش کا نہ بار رہوں میں

ایک جگہ عطف کی حالت میں اعلان نون بھی کر گئے ہیں۔

ہنگامہ کفر و دین کا گو جائے سیر تھا		میں واں گیا جہاں نہ حرم تھا نہ دیر تھا

اس میں کفر و دیں کی ترکیب اضافی کے ساتھ نون کا اعلان کیا ہے۔

کیا جانے دل ہی دل میں وہ کرتا تھا کسکا ذکر		ہر دم زبانِ یار پہ یادش بخیر تھا
تاثیر بخش تھی یہ ہوسؔ کی صدا ہے آہ		از ہوش رفتہ وحشت کا ہر وحش و طیر تھا

مغتنم جانیے ہم صحبتِ یاراں ہونا		چشمِ مردم سے ہے اک روز تو پنہاں ہونا
حسن اپنا ہی ہوا دامِ بلا یوسف کو		بسکہ تقدیر میں تھا ساکنِ زنداں ہونا
جا مرے دل میں کرائے آبلہ پائے طلب		لطف کیا تاجِ سرِ خارِ مغیلاں ہونا

دستِ رنگیں میں ترے دزدِ حنا پیدا ہوا		پنجۂ خورشید تھا اشک یدِ بیضا ہوا
منتِ ناجنس لینا غیرِ بدنامی نہیں		کوئی شانے سے سلجھ سکتا ہے دل الجھا ہوا
دیکھکر روتے مجھے محفل میں اسنے ہنس دیا		غنچۂ لب بستہ تصویر کیوں کروا ہوا

شبِ ہجر میں دمِ واپسیں دلِ مضطرب کا یہ حال تھا		کہ جو سانس ہونٹوں پہ آتی تھی تو نکلنا اس کا محال تھا
ہوا قطع رشتۂ زندگی تری تیغ سے تو بجا ہوا		مرا سر ہی دوش پہ بار تھا مرا تن ہی مجھ پہ وبال تھا
مرا پہنچا آخری وقت جب مجھے دیکھنے کو وہ آئے تب		لگے کہنے اسکو یہ کیا ہوا کہ یہ کل تلک تو بحال تھا
کئے یہ صفیروں نے چہچہے نہ ہوسؔ کا غنچۂ دل کھلا		گئی فصلِ گل اسی دام میں کہ اسیرِ بے پر و بال تھا

یہ اور تعجب کی بات ہے کہ کہیں تو اتنی صفائی کلام اور کہیں اتنی پرانی زبان کہ میر تقی میر سے بھی پہلے کا کلام معلوم ہوتا ہے

میں کہا بوسا نشب غیر سے تھا تم کو کیا
مسکرا کہنے لگا شوق مرا تم کو کیا

شکوہ اس بت کی جفا کا جو کیا میں تو کہا
تم تو دنیا میں ہو اک اہل وفا تم کو کیا

لیکن ایسی زبان کسی کسی غزل میں پائی جاتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ابتدا کا کلام ہے

کاہشیں پیری کے عالم کی دلاتی ہیں یاد
راحت بے غمی دامن مادر مجھکو

سنا تا کون بچے کے مہل یہ سخن ہمکو
نہ لگتا لوث بدنامی اگر دامان مریم کو

جدھر جاتا ہوں میں دیوانہ وار پتھر برستے ہیں
خدا محفوظ رکھے شیشہ ناموس عالم کو

ہوائے آشیاں بندی ہے مجھکو جس گلستاں میں
شرر کا حکم ہے دامان گل پر اشک شبنم کو

سورج کو دم صبح جو وہ مہ نگراں تھا
مغرب پہ بھی مشرق کا منجم کو گماں تھا

آئینہ نہ تھا سامنے جو دیکھتے اس کو
تھا وہ مری آنکھوں میں پر آنکھوں سے نہاں تھا

گھبرا کے یہاں آئے تھے ہم ملک عدم سے
یاں بھی نہ لگا جی ہمیں کیسا خفقاں تھا

وہ منہ نہ رہا اب جو دکھاؤں میں کسی کو
کیوں حسرت پیری کبھی میں بھی تو جواں تھا

جانا مجھے سنتے پہ کسی نے بھی نہ دیکھا
میں گلشن ہستی میں نسیم گزراں تھا

افسوس کیا دیکھ کے کل ہم نے ہوس کو
کس سوچ میں انگشت تحیر بدہاں تھا

مسی سے لب ہے رنگیں اس غیرت چمن کا
اندیشہ ماہ نو کو کیوں کر نہ ہو گہن کا

اڑ جائے نور اس کا ہو منہ سحر کا کالا
نقشہ بگاڑ ڈالا مستوں کی انجمن کا

نازک مزاج ہوں میں اے خاک وشت غربت
ہر ذرہ مجکو تجھ سے ہے لاکھ لاکھ من کا

مرا آدم نے کیا پایا جہان سفلہ پرور کا — نہ شفقت باپ کی دیکھی نہ چین آغوش مادر کا
کچھ وا کج لکھا تا حق ہمارا خط پیشانی — میسر تھا نہ منشی قضا کیا تار مسطر کا

واہ رے تیرا اثر اے کاوش دست مژہ — اک نہٹے رفتہ رفتہ زخم کاری ہوگیا

دیوانہ کس قدر ہے یہ موسم شباب کا — تصویر کے لبوں سے ہوں خواہاں جوابکا

شغل شب تنہائی کس سے کہیں ہم اپنا — دو چار گھڑی روکر بہلاتے ہیں غم اپنا
ارمان ہے پیری میں رو رو کے بصد حسرت — لڑکوں سے جوانی میں قصہ کہیں ہم اپنا

کم نہیں ہے نامہ اعمال مجھ آزاد کا — جرم لکھنا منع تھا مجنون مادرزاد کا
آشنائے لذت درد اسیری ہوں ہوس — منہ مرا جل جائے گر شکوہ کروں فریاد کا

تم نے ظاہر میں گلے لگنے سے انکار کیا — خواب میں ہم نے بہت دیر تمہیں پیار کیا
خوں کا دعوی نہیں محشر میں ہو قاتل سے ہوس — میں مکر جاؤنگا اس نے اگر اقرار کیا

شوق خراش خار مرے دل میں رہ گیا — پائے تلاش پہلی ہی منزل میں رہ گیا
مجنوں تجھے خبر نہیں تیری تلاش میں — غش کھا کے کوئی کہتے ہیں محمل میں رہ گیا
میں زمزمہ سرا تو چمن سے گیا ولے — افسانہ اک گروہ عنادل میں رہ گیا

پاس ماں باپ کو لازم تھا شگون بد کا — نہ پہنانے تھے یہ منت کے سلاسل مجھکو
خوں بہا کچھ تو مرا چاہیے آخر یارو — پھاڑ دو یہ کفن دامن قاتل مجھکو
سفر ملک عدم میں کروں کیونکر تاخیر — بار کرنا نہیں کسنا نہیں محمل مجھکو
کیا تعجب ہے ہوس مردہ بے وارث ہوں
پھینک دیں راہ میں گر نعش کے حامل مجھکو

کم کرو ذکر جوانی مانو میری بات کو   ہنسی ہے دن کو کہانی خواب کہنا رات کو

یاد ایام جوانی یاد ہنگام بہار   کیسی کیسی دل میں تھی سیر چمن کی آرزو

غم نہ کھا کہنے کا تو شاد ہو اے یوسف مصر   ولے بر جنس کوئی جس کا خریدار نہ ہو
پاس ناموس محبت ہے یہانتک لازم   دل بھی تیرا تری حالت سے خبردار نہ ہو
خار محفل تو ہیں ہم لیک غنیمت سمجھو   گل کی کیا قدر جہاں میں ہو اگر خار نہ ہو

فراق روح سے اے جسم بیقرار نہ ہو   عزیز اس کو نہ کر جس پہ اختیار نہ ہو
وہ آنے کا نہیں سنکر ہجوم پروانہ   ہماری قبر پہ شمع سر مزار نہ ہو
پکارا دیکھ کے آئینہ آپ وہ خود بیں   الٰہی ایسی بلا سے کوئی دوچار نہ ہو
ہے اس غریب کا احوال جا بگریہ ہوس   سوائے یاس کوئی جس کا غمگسار نہ ہو

رنگ گل شگفتہ ہوں آب رخ چمن ہوں میں   شمع حرم چراغ دیر قشقہ برہمن ہوں میں
قمری سرو قد ناز نغمہ عندلیب حسن   گیسوئے تابدار کا پیچ و خم و شکن ہوں میں
خنداں نہ تاں ہیں مجھ بغیر بے خردان روزگار   اہل خرد میں اے ہوس رونق انجمن ہوں میں

ہوس کے سنہ ولادت اور سنہ وفات کا پتہ نہیں چلتا۔ اتنا معلوم ہوا ہے کہ بعد وفات محلہ مفتی گنج لکھنؤ میں خاص اپنے مکان میں دفن ہوئے۔ نشان قبر ابتک موجود ہے۔

یقین دہلوی

انعام اللہ خاں نام یقین تخلص خلف اظہر اللہ خاں دہلوی شاگرد مرزا جان جاناں مظہر مصحفی اپنے تذکرے میں لکھتے ہیں کہ مرزا جانجاناں مظہر میر و مرزا کے شاگرد تھے اور مشائخ کبار میں ان کا شمار تھا۔

یقین سے ان کو بہت محبت تھی اور یقین بھی اپنے استاد کے بہت مداح تھے کبھی کسی دوسرے استاد سے اصلاح نہ لی۔

عہد شاہ عالم بادشاہ دہلی میں ان کے باپ نے کسی وجہ سے خفا ہو کر ان کو قتل کیا اور اور دیگ میں بند کر کے دفن کر دیا۔ یہ واقعہ ۱۲۰۴ھ کا ہے

پچیس ۲۵ برس کی عمر میں پیوند زمین ہوئے نہایت خوش رو اور زود فہم تھے قلمی دیوان ان کا ہماری نظر سے گذرا ہے جو ۱۲۵۷ھ کا لکھا ہوا ہے۔

جسکو بی وزیرن صاحبہ کے واسطے مولانا سید نور الہدا زائر نے مرزا دلاور علی صاحب خوشنویس سے لکھوایا ہے۔ اور اکیس شوال ۱۲۵۷ھ کو ختم ہوا۔

کلام میں فلسفیانہ رنگ ہے۔ زبان بہت قدیم ہے۔ میر تقی میر ملک الشعرا کے زمانہ میں یقین بھی تھے۔ یہ زیادہ تعجب کی بات ہے کہ یقین کی کوئی غزل پانچ شعر سے زیادہ کی نہیں ہے۔

انتخاب کلام

کون کر سکتا ہے اس خلاق اکبر کی ثنا
نارسا ہے شان میں جسکی پیمبر کی ثنا

میں تو ظاہر نہ کروں اسکی جفا کو لیکن
چھپ سکے کیونکہ یقین زخم نمایاں میرا

اگر مر کر نہ میں اس شوخ کو نذر اپنی جاں کرتا
خدا جانے وفا میری کے حق میں کیا گماں کرتا

ہیں زخم بہت کاری اس سینے سے کیا ہوگا / اب مرنا ہی بہتر ہے اس جینے سے کیا ہوگا

سر پہ سلطنت سے آستان یار بہتر تھا / ہمیں ظل ہما سے سایہ دیوار بہتر تھا

یہ دل ایسا خراب کوچہ و بازار کیوں ہوتا / نہ لگتا گلرخوں سے گر تو ایسا خوار کیوں ہوتا

اگر ہوتی نہ کافر باغباں سے آشنا بلبل / تو اتنا گل کے نظارے سے کیوں کرتی حیا بلبل

تو نے جو ہم پہ جفا کی ہے سو مذکور نہیں / لیک جو ہم نے وفا کی ہے سو منظور نہیں

جب دیکھتا ہوں تجھکو تنہا سجن چمن میں / کس کس طرح کی باتیں آتی ہیں میرے من میں

اسیران قفس کی نا امیدی پر نظر کیجو / بہار آوے تو اے صبا مت ہمکو خبر کیجو

جفا کے عذر میں اے ظالموں دیر کرو / مری زبان کو شکایت سے مت دلیر کرو

منہ اتنا نہ دکھا کر وہ ہو جائیگا دیوانہ / آئینہ کو کہتے ہیں اے شوخ پریخانہ

بدلا ترے ستم کا کوئی تجھ سے کیا کرے / اپنا ہی تو فریفتہ ہووے خدا کرے

زنجیر میں بالوں کے پھنس جانیکو کیا کہئے / کیا کام کیا دل نے دیوانے کو کیا کہئے

دربار رامپور

زبان اردو کی علمی خدمتوں کے لحاظ سے یادش بخیر عرش آشیاں نواب کلب علی خاں بہادر والی ریاست دارالسرور رامپور کا عہد معدلت مہد بہت وقیع تھا۔ دربار اکبری کے نورتن مشہور ہیں مگر دربار رامپور کے در انتخاب ریاست کی تحقیق نظر سے داد دینے کے قابل ہیں تھے۔ کوئی مشہور نامور شاعر کوئی مستند عالم کوئی دانا پنڈت ایسا نہ تھا جو ریاست کا وظیفہ خوار نہ ہو اور دربار رامپور سے تعلق نہ رکھتا ہو۔ شاعروں کا ایسا انتخاب تو کسی بادشاہ نے بھی نہ کیا ہوگا اسی حسن تحقیق کو لوگ آج تک یاد کرتے ہیں۔ دراصل غدر کے بعد لکھنؤ اور دہلی کی علمی دنیا رامپور کے دامن دولت سے وابستہ ہوگئی۔ اور نواب کی قدردانی کا ہر ایک نے اعتراف کیا
نواب کے دربار کے شاعر اور نثار جس پایہ کے تھے اس کا ذکر کرنا دلچسپی سے خالی نہیں دربار رامپور کے یہ گوہر شہوار تمام ہندوستان میں مشہور ہیں۔ اور ان کی فیاضی کی داستانیں تمام زبانوں پر ہیں۔ ہم اس وقت درباری شاعروں کے مختصر حالات لکھتے ہیں جس سے ہمارا خاص مقصد یہ ہے کہ اگر اور ریاستیں بھی اسی تحقیق سے زبان اردو کی پرورش کے لحاظ سے اپنے دربار میں لیے نورتن جمع کرتی رہیں۔ تو اردو بہت جلد ایک علمی زبان بن جائے۔

اس تذکرے کا آغاز اسیر مرحوم و منیر مرحوم سے کرنا مناسب ہوتا۔ لیکن اس سے قبل ان کے تذکرے شائع ہو چکے ہیں۔ اس سبب سے سرپرست دربار کے اور شاعروں کا تذکرہ لکھا جاتا ہے۔

بحر شیخ امداد علی نام ولد شیخ امام بخش لکھنؤ توپ دروازہ کے رہنے والے شیخ ناسخ مرحوم کے شاگرد رشید سیاہ فام دبلے پتلے میانہ قد تھے تحقیق لغت اور صحت الفاظ ہندی میں مشہور استاد لوگ ان کی زبان کی سند مانتے تھے۔ ہمیشہ محاورات کی تلاش رہتی تھی۔

نواب سید محمد علی رند۔ آتش کے شاگرد ان کے بہت قدردان تھے اور کچھ خدمت بھی کیا کرتے تھے تحقیق الفاظ میں رشک کے بعد ناسخ کے شاگردوں میں یہی ممتاز تھے۔ چھوٹی شہزادی اشرف النساء بیگم افسر بہو صاحبہ دختر حضرت امجد علی شاہ بادشاہ کی سرکار سے کچھ قلیل وظیفہ پاتے تھے۔ افیون کا استعمال کرتے تھے عیش باغ کے میلوں میں بھی

اکثر جاتے تھے۔ زندگی بہت عسرت سے بسر ہوتی تھی۔ بمشاو شاگردوں میں ایک میاں تحیر تھے۔ جن کی ایک مناجات بہت مشہور ہے ؎

ہر امر میں ہیں قدرتِ ربّ العلا علے   رکھتے ہیں اختیار نبیّنا اور مُنا علے
کیوں کر کہے نہ قوم نصیری خدا اعلیٰ

استاد کی طرح شاگرد بھی فلک زدہ تھے۔ افیون بہت پیتے تھے۔ شیریں طوائف اُن کی شاگرد تھی اور وہی کچھ وظیفہ دیتی تھی۔

میاں تحیر ڈاڑھی کا ہمیشہ صفایا رکھتے تھے۔ اس زمانہ میں شہرت حاصل کرنے کا اہلِ کمال کے پاس کوئی ذریعہ نہ تھا۔ اس سبب سے میاں تحیر کے کمال کی کیفیت کسی رئیس کے گوش گذار نہ ہوئی ۶۵ برس کی عمر میں تقدیر نے یاوری کی۔ اور نواب کو معلوم ہوا کہ لکھنؤ میں ایک زباں داں موجود ہے۔ قدردانی اور عزت افزائی کے لحاظ سے خود تحریک فرما کر میاں تحیر کو اپنے دربار میں بلوایا اور خلعتِ خاص سے سرفراز فرما کر بیش بہا تنخواہ مقرر کر دی لیکن میاں تحیر کی زندگی لکھنؤ میں کٹی تھی۔ آخر وقت میں غربت کی برداشت نہ ہو سکی۔ اتفاق سے نواب کے یہاں ایک مشاعرہ ہوا تحیر نے مقطع میں لکھنؤ کی جدائی کا اظہار بہت دردناک پہلو میں کیا۔ نواب کو ان کی حالت پر رحم آگیا اور استفسارِ حال کر کے ان کو کچھ انعام و اکرام دیکر رخصت کر دیا۔

خواجہ حسام الدین کہتے ہیں۔ ہم نے اپنے اُستاد شیخ فضل احمد کیفؔ سے پوچھا آج کل اردو شاعری میں کون کون استاد ہیں۔ کہنے لگے فی زمانہ شیخ امداد علی تحیر کی تحقیق اردو بہت اچھی ہے اور زباں دانی کا دعوے اُن کو زیبا ہے۔ محاورات کو صحت سے نظم کرتے ہیں۔ اور میاں اسیر بھی اُستاد ہیں۔

نواب مہدی علی خاں مرحوم تلمیذ تحیر کہتے تھے کہ جس وقت ہم شاگرد ہوئے ہیں۔ استاد چھوٹی شہزادی کی ڈیوڑھی پر رہتے تھے۔ پھاٹک کی بغل میں ایک کمرہ ہے۔ اس میں افیون گھولا کرتی تھی۔ اور ایک کہنہ چٹائی بچھی رہتی تھی تحقیق الفاظ کو لوگ دور دور سے آتے تھے اور امرا اس بورئے پر بیٹھنا اپنا فخر سمجھتے تھے۔ دن بھر ڈیوڑھی پر رہتے تھے۔ شام کو اپنے مکان پر جاتے تھے۔ توپ دروازہ پر ایک کچا مکان تھا۔ اس میں رہتے تھے۔ لڑکا تو کوئی نہ تھا۔ بیوی تھیں اور آپ تھے۔ لوگ کہتے ہیں ایک لڑکی تھی جس کو بہت چاہتے تھے۔ اب تو توپ دروازے کا مکان کھد گیا متعلقین کا حال معلوم نہیں۔ زندہ ہیں یا مر گئے۔ اردو الفاظ کے اکثر محضر آپ کے

پاس دستخط کے لئے آتے تھے۔ خرچ زیادہ تھا۔ آمد کم تھی۔ اس سبب سے بہت تنگدست رہتے تھے۔ شاگردوں سے لینے میں انکار تھا۔ مگر اس پر بھی لوگ خدمت سے دریغ نہ کرتے تھے۔

حکیم میر ضامن علی جلال مرحوم بعد رشک انہیں سے مشورہ سخن فرماتے تھے۔ کم مائیگی نے بحر کی قابلیت کو شہرت نہ دی۔ حکیم مظفر علی خاں کہتے ہیں۔ میں نے میاں بحر کو دیکھا ہے گندمی رنگ چھریرا بدن کتروان ڈاڑھی تھی۔ ان کا ایک لڑکا تھا محفوظ کو دن اکثر مشاعروں میں غزل پڑھتے ہوئے سُنا ہے۔ بہت خوش الحان تھے۔ بحر وارفتہ مزاج تھے۔ جو کچھ کہتے تھے جمع نہ کرتے تھے۔ نواب سید محمد خاں رند نے ان کی تمام غزلیں ایک دیوان کی صورت میں جمع کیں۔ اور ردیفیں تمام کرا کے دیوان کمل کیا جس کو بحر نے مطبع مصطفائی میں چھپوایا۔

نواب سلیمان خاں صاحب اسد فرماتے ہیں کہ بحر کو ہم نے بارہا دیکھا۔ آواز میں سخت رعشہ تھا۔ غزل خود نہیں پڑھتے تھے۔ میاں فہم ان کے شاگرد پڑھتے تھے۔ بہت تعریف ہوتی تھی۔ کئی شاگرد ان کے ساتھ آتے تھے۔ جب دیوان چھپ چکا۔ تو ایک لغت کی تصنیف میں مصروف ہوئے۔ خدا جانے اس کو تمام کیا یا ناتمام رہ گیا۔ عروض اچھی طرح جانتے تھے۔ اور اس فن پر بہت ناز تھا۔

ناسخ کے انتقال کے بعد ایک مشاعرہ منعقد کیا گیا۔ اور اس سے یہ غرض تھی کہ اس مشاعرہ میں ناسخ کے تمام شاگرد بلائے جائیں۔ اور اُن کی قابلیت کا اندازہ کیا جائے کہ بعد ناسخ کون جانشینی کے قابل ہے اور اس امر کے فیصلے کے متعلق نواب عاشور علی خاں عاشور کو تکلیف دی گئی۔ جب ناسخ کے تمام شاگرد غزلیں پڑھ چکے تو نواب عاشور علی خاں نے فیصلہ کیا کہ بہ اعتبار امتیاز شاعری میں خواجہ وزیر کو ترجیح دیتا ہوں۔ ورنہ بہ اعتبار فن رشک اور بحر بہت اچھے ہیں۔ اور برق بھی غنیمت ہیں۔

رامپور سے واپس آنے کے بعد میاں بحر زیادہ دنوں تک زندہ نہ رہے۔ تخمیناً ۷۰ برس کی عمر میں لکھنؤ میں انتقال کیا۔ اور کربلائے تال کٹورہ میں دفن ہوئے۔

کلام سے ناظرین خود اندازہ کرلیں کہ کس پایہ کا شاعر تھا۔

بشر روز ازل سے شیفتہ ہے شان و شوکت کا
عناصر کے مرقع میں کھبرا ہے نقش دولت کا

خدا آباد رکھے لکھنؤ کے خوش مزاجوں کو
ہر اک گھر خانہ شادی ہے ہر کوچہ ہے عشرت کا



اہل دنیا خوش ہوں یا ناخوش ہوں بے پروا نہیں آسرا رکھتا ہے یہ بندہ خدا کی ذات کا

خدا علیم ہے ہر شخص کی بناوٹ کا کہو نماز کو سجدے کئے کہ سر پٹکا

بتو خدا پہ نہ رکھو معاملہ دل کا برا بھلا یہیں ہو جائے فیصلہ دل کا

شہرا شعرا میں ہو مرے حسن عمل کا اللہ کرے خاتمہ بالخیر غزل کا
کیا تفرقہ ہے ظاہر و باطن میں تمہارے دل سنگ سے بھاری ہے بدن پھول سے ہلکا

نقش دنیا کا مرے دل پہ اثر کیا ہوگا فقر کہتا ہے کہ حاجب نہیں ڈر کیا ہوگا
غم ہے اے ہجر تری بے سر و سامانی کا ہو گئی کیونکر تری اوقات بسر کیا ہوگا

اپنا ہو آپ قاتل مٹی میں جیتے جی مل ڈھا بیٹھ کعبۂ دل حج کا ثواب ہوگا

دیکھتا ہوں ایسے رونے کا برا انجام ہے ہجر گھل گھل کر حباب آب جو ہو جائیگا

ہم فقیر اللہ کے جھوٹی صدا دیتے نہیں جو ہمارا جام بھر دیگا وہ جم ہو جائیگا

وقت آخر ہمیں دیدار دکھایا نہ گیا ہم تو دنیا سے گئے آپ سے آیا نہ گیا
میرا دل کس نے لیا نام بتاؤں کس کا میں ہوں یا آپ ہیں گھر میں کوئی آیا نہ گیا

تیر مارا نہ یار نے خنجر اک ادا سے مجھے تمام کیا

قدرداں کوئی نہ اسفل ہے نہ اعلا اپنا نہ زمیں پہ نہ فلک پر ہے ٹھکانا اپنا

ضبط نے رکھے لب فریاد بند　　صبر میرے زخم کا مرہم رہا
شعلہ تھا عہد جوانی اڑ گیا　　برف تھا ہنگام پیری جم رہا

وہ چھپ گئے اک جھلک دکھا کر　　ہم رہ گئے اشک ڈبڈبا کر

تیرے ہوتے میں رہوں شہر میں رسوا ہو کر　　کھینچ اے جادۂ صحرا رسن پا ہو کر
روشنی مال لٹانے ہی میں ہے اے ممسک　　ہاتھ میں زر نہیں رہتا ید بیضا ہو کر

کیا چشم سرگیں کی ہے شوخی حجاب میں　　پلکوں میں ہے نگاہ کہ بجلی سحاب میں

افسوس عمر کٹ گئی رنج و ملال میں　　دیکھا نہ خواب میں بھی جو کچھ تھا خیال میں

چھیڑا جو ذکر میرا یاروں نے انجمن میں　　شمعیں یہ روئیں آنسو بھر بھر گئے لگن میں

حسن سے بڑھ کے زمانے میں کوئی چیز نہیں　　اپنا گھر بیچتے دیکھا ہے خریداروں کو

ہوا بدل گئی پیری میں نوجوانی کی　　بہار دیکھ چکے باغ زندگانی کی

خدا کو یاد کر کیوں ملتجی ہے کیمیا گر سے　　کہ سونا خاک سے ہوتا ہے پیدا لعل پتھر سے

ضیا باری قلم کرتا ہے کیا کیا وصف ساقی میں　　ملا ہے نور کا فوارہ مجھکو حوض کوثر سے

افشا ہوئے اسرار جنوں جامہ دری سے　　چھپائے گئے اخبار مری بے خبری سے

زر ہو گیا قارون کو راہ عدم کی روشنی　　بے دیئے ہوتی نہیں دام و درم کی روشنی

مزید مردم مفلس کا مال ہوتا ہے ذلیل اہل غرض کا کمال ہوتا ہے

نہ ہو شعر گوئی پہ اے بحر نازاں کوئی پوچھتا ہے ہنر ہے تو کیا ہے

پس کے مرجائینگے جوڑا نہ خبردار بندھے ایک اک بال میں سو سو ہیں گنہگار بندھے

تکیے کی یاد چاہئے مسند پہ بیٹھ کر تمگیرہ سر پہ آج ہے کل شامیانہ ہو

حور بنکر ترے کشتے کی قضا آتی ہے دامن تیغ سے جنت کی ہوا آتی ہے
اس کی رحمت ہے مری بادہ کشی پہ عاشق نام توبہ کا جو لیتا ہوں گھٹا آتی ہے
بحر اللہ کی درگاہ سے مایوس نہ ہو
اس کو بگڑی ہوئی تقدیر بنا آتی ہے
آنکھیں نہ جینے دینگی تری بیوفا مجھے ان کھڑکیوں سے جھانک رہی ہو قضا مجھے

آج ہنستے میں جو سب دانت تمہارے دیکھے ہم نے اک برج میں بتیس ستارے دیکھے

پیار کی آنکھ سے دشمن کو بھی جو دیکھتے ہیں ہمنے ایسے بھی ہیں اللہ کے پیارے دیکھے

اپنے اعمال سے پیری میں خبردار ہوئے سوتے تھے سر پہ جو دھوپ آئی تو بیدار ہوئے
نقاب میں نہیں بیوجہ منہ چھپائے ہوئے کسی غریب کا آتے ہیں دل دکھاتے ہوئے
کہدو یہ قافلے والوں سے ہم بھی آتے ہیں بڑھے نہ جاؤ خدارا قدم بڑھائے ہوئے
کہا کسی نے نہ آنا ہمارے دفن کے وقت کہ خاک ڈالو نہ ان پر یہ ہیں نہائے ہوئے

یہ آب آب خال لب یار سے ہوئے شکر ہی جو تھے وہ شربتی اب فالسے ہوئے

جامۂ قدسی بھی آلودہ دامانی ہوئی — چاند سی پیری میں داغِ پشیمانی ہوئی
آبرو ریزی ہوئی اے تجر ایسی بہرِ رزق — صورتِ گرداب روٹی ہاتھ میں پائی ہوئی

رباعیات

اک جلوہ تھا جس محل میں قندیلوں کا — اس کی چھت میں ہے گھر ابابیلوں کا
کل رقص کناں تھے جن منڈیروں پر مور — ہے آج وہاں پر آستاں چیلوں کا

خم آگیا قد میں ابروؤں کی صورت — سب کٹ گئے عضو گیسوؤں کی صورت
غم کھایا جوانی کا یہ ہم نے دن رات — سب گر گئے دانت آنسوؤں کی صورت

افسوس پیامِ مرگ لائی پیری — دکھلاتی ہے شانِ جانگزائی پیری
کیا یہ عصا قدِ خمیدہ کیا — ہے تیر و کماں بدست آئی پیری

منشی امیر التسلیم مرحوم اکثر فرمایا کرتے تھے کہ نواب کلب علی خاں صاحب بہادر کا زمانہ اردو علم ادب کی خدمتوں کے لحاظ سے بہت زیادہ وقیع تھا۔ تمام ہندوستان کے سخن فہم دربار میں جمع تھے۔ لفظی تحقیق کا بہت شوق تھا۔ ہر شاعر اسی دھن میں رہتا اور یہی خواب دیکھا کرتا تھا کہ اب دربار رامپور میں ہماری طلبی ہوتی ہے۔ ہم منشی نول کشور کے مطبع میں کاپی لکھتے تھے کہ ایک مرتبہ مالک مطبع کے نام ہماری طلبی کا تار آیا۔ منشی جی نے ہم کو بلا کر رامپور کے تار کا ذکر کیا اور کہا کہ اگرچہ آپ کی حسن کارگذاری کی وجہ سے دل تو نہیں چاہتا کہ آپ مطبع سے جدا ہوں لیکن رئیس رامپور کے مزید احسانات اس کے مستغنی نہیں ہیں کہ ہم ان کے ارشاد کی تعمیل میں عذر کریں۔

مالکِ مطبع سے رخصت ہو کر نواب کے دربار میں آئے اور ایسی نعمتیں پائیں جو خواب میں بھی نہ دیکھی تھیں۔ تیس روپیہ ماہوار تنخواہ مقرر ہوئی۔ مگر اس میں ہماری بسر اوقات نہ ہوتی تھی۔ عید بقر عید کے موقع پر قصیدے پیش کرتے۔ وہ سو روپے قصیدے کا صلہ

ملتا تھا۔ اس کے علاوہ نواب کی مہربانیوں سے ہمارا خرچ بہت بڑھ گیا۔ ہمیشہ بنئے کا قرض ہو جاتا تھا۔ نواب کو خبر ہوتی تو بہت افسوس کرتے۔ اور بلا کر پوچھتے کتنا قرضہ دینا ہے۔ ہم صاف صاف کہہ دیتے۔ حضور قرضے سے دوگنی چوگنی رقم عطا فرماتے۔ اور کہتے دیکھو آئندہ قرض لینے سے احتیاط رکھنا مگر یہاں تو نواب کی فیاضیوں نے سیر چشم بنا دیا تھا۔ اور یقین جانتا تھا کہ ہمیشہ سرکار قرضہ ادا کر دیتے ہیں اس لحاظ سے یہ عادت برقرار رہی۔ اس خراب عادت نے نواب کے بعد بہت تکلیف دی۔ اور آخر بیس روپیہ ماہوار ہماری پنشن ہو گئی۔

نواب حامد علی خاں بہادر دام اقبالہ جب سریر آرائے سلطنت ہوئے تو دادا جان کے وقت کا شاعر سمجھ کر دربار میں طلب فرمایا۔ پیری اور ضعف کی وجہ سے آداب تعظیم معاف کئے گئے۔ استفسار حال کیا۔ ہم تو بہرے اور اندھے تھے ہوم سکریٹری صاحب نے ہمارا حال کہا کہ نواب خلد آشیاں کے زمانہ میں تیس روپئے ماہوار ملتا تھا۔ اور مزید فیاضیاں تھیں۔ اب پنشن بیس روپیہ ملتی ہے۔ نواب صاحب بہادر نے فرمایا۔ پنشن کیسی یہ کوئی سپاہی تھے کہ اب بندوق نہیں چلا سکتے۔ پنشن کر دی گئی۔ یہ تو شاعر ہیں ان سے خدمت کون سی لی جاتی تھی۔ جواب نہیں کر سکتے۔ عہد خلد آشیاں کے تیس روپیہ برقرار کئے جائیں۔ اور ہمارے عہد کے دس روپیہ ماہوار اضافہ کئے جائیں۔ آئندہ چالیس روپیہ ماہوار بلاشرط خدمت ملا کرے۔ اسی طرح نواب کی فیاضیاں بہت سی قابل ذکر ہیں۔

مکرم منشی سید ریاض احمد صاحب ریاض فرماتے ہیں کہ نواب کلب علی خاں بہادر کا دربار ہم نے دیکھا ہے بیشک وہ ایک علمی دربار تھا۔ نواب بہت گورے چٹے قدآور جوان تھے قلعہ مچھی بھون میں دربار فرماتے تھے۔ ان کے دربار میں لوگ دو زانو دست بستہ بیٹھتے تھے چہرے سے سطوت شاہی ٹپکتی تھی۔ کوئی آنکھ ملا کر بات نہیں کر سکتا تھا۔ حاضرین دربار روبرو اور ایک طرف بغل میں بیٹھتے تھے۔ علامہ مولوی عبدالحق صاحب خیرآبادی مولوی منشی امیر احمد مینائی منشی محمد اسمعیل منیر حکیم سید ضامن علی جلال حاضر دربار رہتے تھے اور دن رات علمی چرچا رہتا تھا۔

نواب معزز الدولہ بہادر فرماتے ہیں کہ نواب کلب علی خان کے دربار میں ہم مدت تک رہے۔ ہم اس کے برابر علمی اور ادبی حیثیت سے کسی ریاست کو نہیں سمجھتے حق تو یہ ہے کہ

رئیس تشریف فرما ہوتے تھا جب تو ہم ایسے نازک مزاجوں کی وہاں بسر ہوئی۔ ہم لوگ خوگر اور باتوں کے ہیں۔ اور چاہتے ہیں کہ دانہ کم ہے لیکن کوئی ٹٹو نہ کہے۔ گھوڑا کہے۔ اس بارے میں نواب کلب علی خاں بہادر مردم شناس تھے اور حفظ مراتب ہر ایک کی عزت کرتے تھے۔ مچھی بھون کے قلعہ میں دربار ہوتا تھا۔ اور گول کمرہ میں نواب کا نوارٹی پلنگ طلائی پاؤں کا بچھا ہوتا تھا۔ اس پر آپ تشریف فرما ہوتے تھے۔ گرمیوں میں مخمل اور جاڑوں میں ورنی چاندنی اور قالین کے فرش پر درباری لوگ بیٹھتے تھے۔ نواب کی دہنی طرف نواب حیدر علی خاں بہادر۔ نواب اسد الدولہ نواب مفتاح الدولہ اور حقیر اس کے بعد نادر شاہ خاں صاحب عبداللہ خاں صاحب بائیں طرف اصغر علیخاں صاحب بہادر منشی منیر آفتاب الدولہ قلق منشی امیر احمد اور کوتوال شہر سامنے دست بستہ چوبدار کھڑے ہوتے تھے۔ ڈیوڑھی کے اندر شاہی قاعدے کے موافق لال پردہ بانات کا پڑا ہوتا تھا۔ سلام کرانے کو مردھا۔ ساتھ آتا تھا۔

درباری شعرا میں ایک منشی سید محمد اسمعیل حسین صاحب منیر شکوہ آبادی تھے۔ ان کے والد کا نام سید احمد حسین تخلص شاد تھا۔ منیر کو عنفوان شباب سے شاعری کا شوق تھا۔ لکھنؤ میں آکر شیخ ناسخ مرحوم کے شاگرد ہوئے۔ اور ناسخ کے حکم سے رشک سے اصلاح لینے لگے۔ لکھنؤ کانپور مرشد آباد کے مشاعروں میں شریک ہوئے۔ انہوں کا شوق تھا حسن طلب میں ان کا جواب نہ تھا۔ بات بات پر انعام اکرام حاصل کرتے تھے۔ حافظہ بہت صحیح تھا۔

منشی امیر اللہ تسلیم مرحوم کہتے تھے کہ ان کا سر بہت بڑا تھا۔ نہایت بزرگ تھے۔ نواب کے خاص درباری شعرا میں ان کا شمار تھا۔ تحقیق الفاظ بہت اچھی تھی۔ جب یہ ریاست رامپور میں تشریف لے گئے زندگی بھر وہیں رہے اور اسی سرزمین پر دفن ہوئے۔ سرکار سے سو روپے ماہوار تنخواہ ملتی تھی۔ آپ کا ایک کلیات منیر مطبع ثمر ہند لکھنؤ میں چھپا ہے جس میں تین دیوان ہیں۔ دیوان اول منتخب العالم حاشیہ پر ہے۔ دوسرا دیوان تنویر انشا مع عبارات نثر حاشیہ پر ہے۔ تیسرا دیوان نظم منیر متن میں ہے۔ اسی کے آخر میں ایک مثنوی بھی شامل ہے۔

دوسری کتاب مثنوی معراج المضامین چھپی ہے۔ کلیات منیر کی طبع کے لئے کئی ہزار روپیہ

نواب کلب علی خاں بہادر نے مرحمت فرمایا تھا۔ کلام بہت پاکیزہ تھا۔ چند شعر منتخب کئے جاتے ہیں۔

بندہ ہوں اے منیر خدائے کریم کا
صراف ہوں خزانۂ فیضِ عمیم کا

کعبے کے سامنے دلِ خانہ خراب تھا
یہ جھونپڑا حضورِ محل کا جواب تھا

جائے انصاف ہے دم کیوں نکلیں الجھے
اے اجل گھر ہے قریب رگِ گردن انکا

عجز و نخوت نے قدم جب حد سے باہر رکھ دیا
پاؤں پر سر میں نے اُسنے پاؤں سر پر رکھدیا
جب مری گردن پر اُس نے کند خنجر رکھدیا
بارِ منت کے نیچے گراں جانی نے پتھر رکھدیا

رو کے بیٹھے تھے رہِ میکدہ ہم روکے
جھوم آگئیں قبلے سے گھٹائیں کیوں کر

نیند آتی ہے ہر ایک کو آغوشِ لحد میں
شاید کہ اجل کہتی ہے افسانہ کسی کا

منیر نے اپنے دیوان میں ایک قصیدہ نواب صاحب کی تعریف میں لکھا ہے۔ اس میں آپ کی علمی قدردانیوں کا حال بھی لکھا ہے۔ سرکاری اطبا کا مفصل حال لکھنے کے بعد شعرائے دربار کے نام بھی نظم کئے ہیں۔

مجمعِ شاعراں نامی ہے
شاعری کی ہے گرم بازاری
بحر منشی امیر اور اسیر
جس کے الفاظ کا مختاری
منبعِ پاک عروج و داغ سے ہے
نشۂ آب کی گہر باری
ہے جلال و نسیاد شاغل سے
محفلِ نظم جلوہ گرساری
مثنوی میں صبا و حواجہ بشیر
رونق شاعری و نشاری
بدر شاداں یقینی غنی سر دم
رہتے ہیں مدح خواں سرکاری

فارسی گو نثار شیرازی[۱۴] ترزبانی میں ابر آزاری
فن تاریخ میں رشا[۱۶]۔ منصور[۱۵] جان صاحب[۱۷] کی ریختی پیاری

سب سے بڑھ کر منیر[۱۸] کو حاصل
ہے کمالی و ہمزہ گفتاری

اٹھارہ شاعروں کا ذکر تو منشی "منیر" نے کیا ہے۔ جو درباری شاعر تھے لیکن ان کے علاوہ اور بہت سے شاعر تھے۔ جو وقتاً فوقتاً دربار میں داخل ہو گئے۔

کلکتہ میں انتقال فرمایا ؎

یہ کیا خبر تھی کہ یوں دور آسماں ہوگا ۔ کہ تجھ سا دوست طرفدار دشمناں ہوگا
بڑی مہم ہے یہ اللہ آبرو رکھ لے ۔ سنا ہے چاہنے والوں کا امتحاں ہوگا
مزاج تک نہ دم نزع پوچھیے گا حضور ۔ وہ کیا کہے گا جو کچھ دم کا میہماں ہوگا

شاہ قمر الدین حیدر آروی تلمیذ حقیر بلگرامی کسی قدر گراں گوش تھے۔ شاعری کا بہت شوق تھا۔ کوئی مشاعرہ نہ چھوٹتا تھا۔ کچھ مدت ہوئی انتقال فرمایا ؎

بزم سے اُٹھ کے چلونگا تو مچل جاؤں گا ۔ میں کچھ ارمان عدو ہوں کہ نکل جاؤنگا
غم یارانِ گذشتہ کا عبث ہے شکوہ ۔ وہ گئے آج جہاں سے تو میں کل جاؤنگا

مولوی علی میاں صاحب کامل لکھنؤ کے ثقات شعرا میں ان کا شمار تھا۔ قصیدہ گو شاعر مشہور تھے۔ مرثیے بھی بہت تصنیف فرمائے۔ تمام اصناف سخن میں قادر تھے۔ کلام پُر مغز ہوتا تھا۔ چھ ساٹھ برس ہوئے انتقال فرمایا۔ سن شریف ستّر سال سے تجاوز کر گیا تھا ؎

لے لے گئے سمجھ کے تبرک لحد کی خاک ۔ اعمال نیک نے مری مٹی خراب کی

سید مہدی صاحب جلیل لکھنوی برادر زادہ عشق بہت خوش گو شاعر تھے۔ تخمیناً سات برس ہوئے انتقال فرمایا۔ چالیس پینتالیس برس کی عمر تھی ؎

یہ نیا رشک ہے غیروں کو ملال اچھا ہے ۔ کہ مرے جاتے ہیں جب سے مرا حال اچھا ہے
کیا شکوہ دم نزع بھی پوچھیں تو کہوں ۔ تم سلامت رہو اب تو مرا حال اچھا ہے

ان میں اکثر شاعر ایسے ہیں جن کے دیوان مرتب تھے لیکن طبع ہونے کی نوبت نہ آئی افسوس

امیر و داغ

منشی امیر احمد امیر مینائی مرحوم لکھنوی اور نواب فصیح الملک داغ دہلوی اس آخری زمانے میں فلک شاعری کے آفتاب و ماہتاب تھے۔ دونوں شاعر و ماہر تھے۔ ایک مضمون آفرینی کا دلدادہ تھا تو دوسرا زبان و معاملات کا فریفتہ۔ ان کے تاریخی حالات تو اور تذکرہ نویسوں نے لکھے ہیں۔ اور مکمل واقعات بھی لکھے گئے ہیں۔ اس لئے اس کی تو کوئی ضرورت نہیں معلوم ہوتی صرف اتنا بتا دینا کافی ہے کہ دونوں کا مرتبہ شاعری میں کیا تھا۔

اصل بات یہ ہے کہ یہ دونوں شاعر دنیائے اردو کے لئے غنیمت تھے۔ زبان کی بہت خدمت کی۔ دونوں کا پایہ سخنوری بہت بلند تھا۔ منشی امیر احمد امیر کے کلام میں نازک خیالیوں کے ساتھ ساتھ شکوہ الفاظ کی شیرینی بھی ملی ہوتی تھی۔ معانی آفرینی میں ان کا مرتبہ کسی نازک خیال فارسی شاعر سے کم نہ تھا۔ اور عمدہ بات یہ تھی کہ باوجود شکوہ الفاظ وقت پسندی کو وہ ناجائز رکھتے تھے۔ ان کے کلام کے سمجھنے میں کسی تاویل کی ضرورت نہ تھی۔ ان کی فکر سخن ایسی ہے جیسی ایک علامہ فن کی ہونی چاہئے۔ ان کے اکثر اشعار اپنے انداز بیان سے اہل فن کو مزا دیتے تھے۔ شوخی بیان کم تھی۔ مگر احاطہ تغزل سے کوئی شعر باہر نہ تھا۔

نواب فصیح الملک داغ مرحوم بھی دہلی کے شاعر تھے اردو محاورات و اصطلاحات کو برمحل صرف کرنا ان کا حصہ تھا۔ اور خدا نے ان کی طبیعت کو شعر کے مناسب پیدا کیا تھا۔ اور وہ دہلی کے محاورات نظم کرتے تھے لیکن اکثر تذکیر و تانیث کے جھگڑے میں وہ لکھنؤ کی تقلید کر جاتے تھے۔ جیسے "قلم" - "سانس" کو مونث نظم کیا ہے۔ اور یہ ایک اچھی بات ہے کہ دونوں زبانوں کا ایک مرکز ہو جائے۔ ایک کے محاورے کو دوسرا برا نہ سمجھے، حالانکہ محاورات اور تذکیر و تانیث کے صرف بعض الفاظ میں کچھ یونہی اختلاف ہے۔ ایسا اختلاف لکھنؤ کے بعض ثقات کے کلام میں بھی موجود ہے۔ اس سے اہل تحقیقات کو فائدہ ہو سکتا ہے۔ بہر حال دونوں استادوں کے کلام سے زبان دہلی و لکھنؤ کا صحیح پتہ چلتا ہے۔ داغ کے کلام میں عربی فارسی الفاظ کا استعمال کثرت سے نہیں ہے۔ اور معاملہ بندی میں وہ

اپنا مثل نہیں رکھتے تھے۔ دونوں کا کلام اپنی اپنی آن رکھتا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

امیر

آہوں سے سوزِ عشق مٹایا نہ جائیگا آندھی سے یہ چراغ بجھایا نہ جائیگا

اس میں آہوں کو آندھی سے اور سوزِ عشق کو چراغ سے استعارہ کیا ہے۔

داغ

دل لیکے اس کی بزم میں جایا نہ جائیگا یہ مدعی بغل میں چھپایا نہ جائیگا

داغ نے اس مطلع میں مدعی کو دشمن کے معنی پر صرف کیا ہے۔ جو محض عند ہے۔ یہ خاص محاورہ اہل زبان کا ہے۔

امیر

گھر میں تمہارے غیر سے جایا نہ جائیگا آغوش نور میں کبھی سایا نجایئگا

داغ

اس بزم میں شریک تو جایا نہ جائے گا میں جاؤں گا اگر مرا سایہ نہ جائیگا

امیر

لاؤں میں اس سے دل میں کدورت محال ہے یہ لال خاک میں تو ملایا نہ جائے گا

داغ

دل کیا ملاؤ گے کہ ہمیں ہو گیا یقیں تم سے تو خاک میں بھی ملایا نہ جائیگا

امیر

چلو ہی سے پلا دے مجھے ساقیا شراب ہوں ناتوان جام اٹھایا نہ جائے گا

داغ

فتنہ نہیں ہوں جس کو اٹھایا کرے فلک مجھسے گرے ہوئے کو اٹھایا نہ جائیگا

بیقرار دل اور اختیار دل میں بھی دونوں نے غزلیں کہکر داد سخن دی ہے۔

امیر

جاتا تو اس کے کوچہ میں ہے بار بار دل کھائے نہ چوٹ یاس کی امیدوار دل

امیر نے یاس کی چوٹ میں بہت نزاکت پیدا کی ہے

داغ

بھسا نہ دے زمانے کو پروردگار دل آشفتہ دل فریفتہ دل بے قرار دل

کیا برجستہ مطلع نکلا ہے۔

امیر

بزم وصال ہے کہ کوئی صید گاہ ہے ۔ میرے شکار تم ہو تمہارا شکار دل

داغ

یہ صید گاہ عشق ہے ٹھہرائیے نگاہ ۔ صیاد مضطرب ہے نہ ہوگا شکار دل

امیر

تسکین دے تصور جاناں کسے کسے ۔ بیتاب ادھر ہے جان ادھر بے قرار دل

داغ

تاثیر عشق ہے یہ ترے عہد حسن میں ۔ مٹی کا بھی بنائیں تو ہو بے قرار دل

امیر

ٹھنڈی ہیں اسکے آگے حسینوں کی گرمیاں ۔ پتلا ہے شوخیوں کا مرا بے قرار دل

داغ

اس نے کہا ہے صبر پڑے گا رقیب کا ۔ سے اور بے قرار ہو اے بے قرار دل

مزاروں میں غمگساروں میں کہتے ہیں ۔

امیر

وہ بے کس ہوں نہیں ہے کوئی میرا غمگسار نہیں ۔ فقط اک دل ہے سو وہ بھی تمہارے جاں نثار نہیں

داغ

رہے گا کوئی تو تیغ دو دم کے یادگاروں میں ۔ مرے لاشے کے ٹکڑے دفن کرنا سو مزاروں میں

امیر

چلے ساقی بہانے توبہ کر آئی ہے یاروں میں ۔ دلھن بنکر نہ بیٹھے دختر رز بادہ خواروں میں

داغ

کسی کی نرگس مخمور کچھ کہدے اشاروں میں ۔ مزہ ہے رات دن چلتی رہے پرہیزگاروں میں

انتخاب کلام امیر

حسن مطلق کا ازل کے دن سے میں دیوانہ تھا — لامکاں کہتے ہیں جس کو وہ مرا کاشانہ تھا
باغ عالم کا تماشا باعث غفلت ہوا — دیکھنا آنکھوں کا کانوں کے لئے افسانہ تھا
وصل ہوتا کس طرح خلوت کہاں تھی رات کو — پھول تھے نرگس کے رکھے شمع تھی پروانہ تھا
دیر کی تحقیر کرانی نہ اے شیخ حرم — آج کعبہ بن گیا کل یہ بھی بت خانہ تھا
میں پرانا مست ہوں جنت مرا کاشانہ تھا مطلع — حور ساقی چشمۂ کوثر مرا پیمانہ تھا
دی گئی منصور کو سولی ادب کے ترک پر — تھا انا الحق حق مگر اک حرف گستاخانہ تھا

مرے بس میں یا تو یا رب وہ ستم شعار ہوتا — یہ نہ تھا تو کاش دل پر مجھے اختیار ہوتا
میں زباں سے تم کو سچا کہو لاکھ بار کہہ دوں — اسے کیا کروں کہ دل کو نہیں اعتبار ہوتا

موباف کھل گیا ہے کسی گلعذار کا — آنچل لٹک رہا ہے عروس بہار کا
جھونکا ادھر نہ آئے نسیم بہار کا — نازک بہت ہے پھول چراغ مزار کا

ناوک ناز سے مشکل ہے بچانا دل کا — درد اٹھ اٹھ کے بتاتا ہے ٹھکانا دل کا

کیا میں اے پردہ نشیں قتل کا خواہاں ہوتا — شرم آتی تجھے تقصیر بھی جو عریاں ہوتا
درد وہی تھا دل بیمار کا غمخوار قدیم — اب یہ صورت ہے کہ وہ بھی نہیں پرساں ہوتا
جب وہی حور نہیں خلد میں تو داور حشر — جھونک دیتا مجھے دوزخ میں تو احساں ہوتا

حیا بولی ابھرا جو جوبن کسی کا — مٹا دو لگی میں چلبلا پن کسی کا
رقیبوں سے وہ خوش رقیب ان سے راضی — برا کر کے ہیں کچھ بھلا پن کسی کا
شباب آچکا اب کسے ڈھونڈتا ہے — امیر اٹھ گیا ہے ابھار جوبن کسی کا

مرے پھولوں میں کیا ہے موقع ہنسی کا — نہ اتنا بھی بے درد ہو دل کسی کا

تیر کھانے کی ہوس ہے تو جگر پیدا کر — سرفروشی کی تمنا ہے تو سر پیدا کر
قطرہ اشک بنے گوہر گوش جاناں — آبرو اتنی تو اے دیدۂ تر پیدا کر
کونسی جا ہے جہاں جلوۂ معشوق نہیں — شوق دیدار اگر ہے تو نظر پیدا کر

تری سفاکیاں پہنچیں یہاں تک — کہ ڈرتی ہے حیات جاوداں تک
کڑی ہے اس قدر منزل عدم کی — کہ مر مر کر پہنچتے ہیں وہاں تک
بہار آخر ہے اور میں بے پر و بال — قفس سے ڈاک بیٹھے آشیاں تک
ہزاروں حسرتوں کا ہو گیا خون — کہاں تک پاس رسوائی کہاں تک
کہاں ہم اے امیر اب اور کہاں داغ — یہ قصے ہو چکے خلد آشیاں تک

یہ تو میں کیونکر کہوں تیرے خریداروں میں ہوں — تو سراپا ناز ہے میں ناز برداروں میں ہوں
حشر میں اتنا کہوں گا اس سے میں محروم وصل — پاکدامن تو ہے میں کیونکر گنہگاروں میں ہوں
زاہد و کافی ہے اتنی بات بخشش کیلئے — اس کو شوق مغفرت ہے میں گنہگاروں میں ہوں
کس طرح فریاد کرتے ہیں بتا دو قاعدہ — اے اسیران قفس میں نو گرفتاروں میں ہوں
پھول میں پھولوں میں ہوں کانٹا ہوں کانٹوں میں امیر
یار میں یاروں میں ہوں عیار عیاروں میں ہوں

ضبط کرنا دل جو سمجھیں نہ کہیں — چوٹ لگ جائے کسی کی کہیں نہ کہیں

کلیاں یہ سرخ سرخ نہیں لالہ زار میں — مہندی لگی ہے دست عروس بہار میں

پڑ گئی کیا لوٹ یارب گلشن ایجاد میں — دست گلچیں میں ہے گل بلبل کف صیاد میں

گزشتہ خاک نشینوں کا یادگار ہوں میں — مٹا ہوا سا نشان سر مزار ہوں میں

نگاہ گرم سے مجھکو نہ دیکھ اے دوزخ　　خبر نہیں تجھے کس کا گناہگار ہوں میں
زمین قصر سلاطین سے آرہی ہے صدا　　کہ آج منزل عشرت ہوں کل مزار ہوں میں
پھر اس کی شان کریمی کے حوصلے دیکھے　　گناہگار یہ کہدے گناہگار ہوں میں

باںکی ادا ہے وہ نگہ خشم گیں نہیں　　غمزہ چھری لئے ہے وہ چیں جبیں نہیں

عزیز احباب ساتھی دم کے ہیں سب چھوٹ جاتے ہیں　　جہاں یہ تار ٹوٹا سارے رشتے ٹوٹ جاتے ہیں

شوخی تھی قیامت، تری مستانہ ادا میں　　فتنوں نے قدم چوم لئے لغزش پا میں

کہہ رہی ہے حشر میں وہ آنکھ شرمائی ہوئی　　ہائے کیسی اس بھری محفل میں رسوائی ہوئی

ہے جوانی خود جوانی کا سنگار　　سادگی زیور ہے اس سن کے لئے
دختِ رز سی پاک دامن چاہیئے　　شیخ جی سے پاک باطن کے لئے
مجھ سے رخصت ہو مرا عہدِ شباب　　یا خدا رکھنا نہ اس دن کے لئے
لاش پر عبرت یہ کہتی ہے امیر
آئے تھے دنیا میں اس دن کے لئے

انتخاب کلام داغ

کیا تکلف ستم یوں انہیں حاصل نہیں ہوتا　　غنچے کی دم ملتے ہیں اگر دل نہیں ہوتا

جس نے ہمارے دل کا منہ دکھا دیا　　اس آئینے کو خاک میں آپ نے ملا دیا

دیکھئے لے گا یہ مرا حشر میں جو جائیگا　　آپ جو حکم کریں گے وہی ہو جائیگا

جب جوانی کا مزا جاتا رہا زندگانی کا مزا جاتا رہا

صبر اے زاہد نا فہم نہ بے خاروں کا بخشنے والا بھی دیکھا ہے گنہگاروں کا

گر میرے بت ہوش رُبا کو نہیں دیکھا اُس دیکھنے والے نے خدا کو نہیں دیکھا
اتنا تو بتا دے مجھے اے ناصح مشفق دیکھا ہے کہ اس ماہ لقا کو نہیں دیکھا
جب داغ کو ڈھونڈھا کسی بتخانہ میں پایا
گھر میں کبھی اس مرد خدا کو نہیں دیکھا

دونوں دشمن ہیں بشر کے آسماں ہو یا زمیں فتنہ گر بالائے سر ہے تو ستمگر زیر پا

آج راہی جہاں سے داغ ہوا خانہ عشق بے چراغ ہوا

کیوں صرف نگاہ مری جان ہو گیا میں بت پرستیوں سے مسلمان ہو گیا

کوستا ہوں جو نصیبوں کو تو کہتا ہے وہ شوخ پھر محبت نہ کرے گا اگر انساں ہوگا
زندگی عشق میں مشکل ہے تو مر جائینگے اب سے وہ کام کرینگے کہ جو آساں ہوگا

سو جتن میں تو آئیں گیا ایک دل تو کیا ملنا تھا جو مجھے مری قسمت کا مل گیا

جو سر میں زلف کا سودا تھا سب نکال دیا بلا ہوں میں بھی کہ آئی بلا کو ٹال دیا

ہوا ہے جب سے شہرہ اس عدوئے دین و ایماں کا کوئی دل چیر کر دیکھے عقیدہ ہر مسلماں کا

سر محفل مجھی سے تجکو ظالم پردہ کرنا تھا پھر اس پر یہ قیامت غیر کے دامن سے منہ ڈھکا

دل میں تو کفر ترے ہجر میں شب خدا کا   اے داغ سوئے کعبہ پھرا لگتا دعا کا
جب راہ سے وہ گذرے ڈالی بنائے محشر   فتنہ بنا نگہباں ہر چشم نقش پا کا
دست ہوس بڑھا کر کیوں مرتبہ گھٹایا   سمجھی نہ یہ زلیخا دامن ہے پارسا کا

ہے مجھکو خبر رات کو جو تیرے قریں تھا   میں گرچہ نہ تھا پاس مرا دل تو وہیں تھا

تفرقہ پرواز بھی کیا آنکھ اس صیاد کی   تیر ہیں اور دل نہیں مرے پلا ہر سو تیر کا

شب فراق جو دست دعا بلند ہوا   ندائیں آئیں کہ باب قبول بند ہوا

نفس کے آنے جانے پر بشر کی زندگی ٹھہری   یہ تو پوچھو مسافر تو نے کیا لطف سفر پایا
وہ میرا چھیڑنا ناز الفت میں شرارت سے   وہ رک رک کے ہاتھ کانوں پر ترا کہنا کہ بھر پایا

شمع پر سینک کے رکھے بھی بغل میں دل ہے   گرم جب بھی تو شب ہجر میں پہلو نہ ہوا

آئینہ تصویر کا تیرے نہ لیکر رکھ دیا   بوسے لینے کیلئے کعبے میں پتھر رکھ دیا
عجب اپنا حال ہوتا جو وصال یار ہوتا   کبھی جان صدقے ہوتی کبھی دل نثار ہوتا
جو تمہاری طرح تم سے کوئی جھوٹے وعدے کرتا   تمہیں منصفی سے کہہ دو تمہیں اعتبار ہوتا
یہ مزا تھا دل لگی کا کہ برابر آگ لگتی   نہ تجھے قرار ہوتا نہ مجھے قرار ہوتا
ترے وعدے پر ستمگر ابھی اور صبر کرتے   اگر اپنی زندگی کا ہمیں اعتبار ہوتا

خاطر سے یا لحاظ سے میں مان تو گیا   جھوٹی قسم سے آپ کا ایمان تو گیا
دل لیکے مفت کہتے ہیں کچھ کام کا نہیں   الٹی شکایتیں ہوئیں احسان تو گیا
دیکھا ہے بتکدے میں جو اے شیخ کچھ نہ پوچھ   ایمان کی تو یہ ہے کہ ایمان تو گیا

دی مؤذن نے شبِ وصل اذان پچھلی رات　　ہائے کمبخت کو کس وقت خدا یاد آیا

کیا کہوں تیرے تغافل نے حیا نے کیا کیا　　اس ادا نے کیا کیا اور اس ادا نے کیا کیا

رازِ دل کوئی کہے لاکھ میں کیوں کر اپنا　　دادِ حشر جدا چاہئے محشر اپنا

کیا کیا فریب دل کو دیئے اضطراب میں　　انکی طرف سے آپ لکھے خط جواب میں

جب کہا اور بھی دنیا میں حسیں اچھے ہیں　　کیا ہی جھنجلا کے وہ بولے کہ چلیں اچھے ہیں

حضرتِ دل آپ ہیں کس دھیان میں　　مر گئے لاکھوں اسی ارمان میں

دل ہی تو ہے نہ آئے کیوں دم ہی تو ہے نہ جائے کیوں　　ہم کو خدا جو صبر دے تجھ سا حسیں بنائے کیوں

دستِ گلچیں سے چھٹا آیا کفِ صیاد میں　　میں گل بازی ہوں کیا اس گلشن ایجاد میں

کبھی فلک کو پڑا دل جلوں سے کام نہیں　　اگر نہ آگ لگا دوں تو داغ نام نہیں

رہیگا کوئی تو تیغِ ستم کی یادگاروں میں　　مرے لاشے کے ٹکڑے دفن کرنا سو مزاروں میں

عرصۂ حشر میں اللہ کرے گم مجھکو　　اور پھر ڈھونڈتے گھبرائے ہوئے تم مجھکو

مجھکو جنت میں نہ راحت ہوگی　　گر یہی دل ہے قیامت ہوگی

اس انجمن سے بہت بے وقار ہو کے چلے　　سرور ہو کے ہم آئے خمار ہو کے چلے

جانِ عالم کی شاعری

حضرت قدر قدرت ابو منصور سکندر جاہ ناصر الدین قیصر زماں سلطان عالم محمد واجد علی شاہ جانِ عالم علاوہ اور تمام علوم و فنون کے گلشن شاعری کی بھی گلگشت کیا کرتے تھے اور اس میں بہت کچھ گلکاری کی ہے۔ نظم کے ہر صنف میں دادِ سخن دی ہے۔

یہ ہندوستان کے پہلے بادشاہ ہیں جنہوں نے شاعری میں کسی کی شاگردی قبول کرنا ننگ سمجھا۔ تمام ہندوستان کے مشہور شاعروں سے صحبت گرم رہتی تھی۔ خاص مصاحبین اچھے اچھے نامی شاعر تھے۔ خواجہ آفتاب الدولہ ارشد علی خاں قلق عرف خواجہ اسد قلق فتح الدولہ بخشی الملک میرزا محمد رضا برق۔ تدبیر الدولہ مدبر الملک مظفر علی خاں بہادر اسیر گلشن الدولہ بہار۔

اس کے علاوہ صحبت مشاعرہ میں منتخب شعرا شریک ہوتے تھے وہ زمانہ اردو شاعری کے شباب کا تھا۔ زبان کے قواعد، محاورات کی پابندی، متروکات کا لحاظ، ثقیل اور غلط الفاظ کی بندش سے پرہیز کا دور دورا تھا۔ پھر معاصر شعرا میں شیخ امام بخش ناسخ۔ خواجہ حیدر علی آتش۔ خواجہ وزیر وزیر۔ شیخ میتا عیش۔ کپتان مقبول الدولہ قبول۔ آغا حجو شرف۔ الہ یار خاں سحاب۔ میر جان خاں یکتا۔ میر مہدی سپہر۔ میر امداد علی بحر۔ اصغر علی خاں نسیم۔ میر علی اوسط رشک۔ امیر علی خاں ہلال۔ نواب حسین علی خاں اثر۔ مہدی حسن خاں آباد۔ میر وزیر صبا۔ میر دوست علی خلیل۔ میر کلو عرش۔ شیخ محمد جان شاد۔ میر وحید۔ شیخ اماں علی خاں سحر۔ ایسے ایسے باکمال استادِ فن موجود تھے۔ شاعر تو شاعر امرا میں بھی اس فن کی طرف کمال رغبت پائی جاتی تھی۔ اس لحاظ سے کہہ سکتے ہیں کہ کوئی امیر اس فن کے اکتساب سے خالی نہ تھا اور تمام شہزادگانِ والا تبار اسی رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ مثلاً

عالم شہزادہ مرزا سلیمان قدر تسخیر۔ جبرئیل مرزا فریدوں قدر۔ مرزا اسد علی خاں مرحوم کیواں قدر ہمایوں جاہ قدیر حشمت علی عہد مرزا امام علی خاں بہادر کوکب۔ شرف الدولہ منتظم الملک محمد ابراہیم خاں مستقیم جنگ خلیل۔ راجہ منتظم الدولہ مہر۔ نواب ممتاز الدولہ اثر۔ نواب سید محمد

خاں رند۔ فقیر محمد گویا۔ حسین علی خاں جویا۔ راجہ جواہر سنگھ جوہر۔ نواب طالب علی خاں عیشی مہاراجہ جے گوپال سنگھ ثاقب۔ نواب عاشور علی خاں عاشور۔ غرض لکھنؤ میں شاعری کا اچھا خاصا باغ لگا ہوا تھا جس میں طرح طرح کے گل بوٹے کھلے۔ اور عجیب عجیب بلبل چہکتے ہوئے نظر آتے تھے۔ بادشاہ کی قدردانی کے لحاظ سے خاص و عام میں یہ اسپرٹ بھری ہوئی تھی جس کو دیکھئے شاعر جس کو سنئے شاعر۔ دارالسلطنت ہونے کی وجہ سے لکھنؤ کی زبان مستند اور مقبول عام تھی۔ اور دہلی کا ٹوٹا ہوا مجمع بھی اسی دربار میں فروغ حاصل کر رہا تھا۔

محلات میں تمام بیگمات کو اگرچہ فیاض ازل سے سخن فہمی اور سخن گوئی کا حصہ ملا تھا لیکن بعض بعض بیگمیں زبان اور محاورات کے لحاظ سے نظم کی لڑیوں میں موتی پروتی تھیں ان میں ملکہ مخدرہ عظمیٰ نواب بادشاہ محل صاحبہ عرف نواب خاص محل صاحبہ عالم کا نمبر سب سے اول تھا ان کی تصنیف سے ایک دیوان بیاض عشاق اور ایک مثنوی بہت پیاری زبان میں مطبوعہ موجود ہے۔

ان کے علاوہ حضور عالیہ ملکہ اودھ اختر محل نواب رونق آرا بیگم بنت نواب علی نقی خاں تاج النساء نواب معشوق محل صاحبہ، ملکہ مہر تن افسر النساء نواب نشاط محل صاحبہ نواب زیب محل صاحبہ وغیرہ وغیرہ اسی رنگ میں ڈوبی ہوئی تھیں

شاہ اختر کا شاعری میں معجز نمائی کرنا ایک لازمی فعل تھا۔ بادشاہ کا مذاق شاعری ایک نفیس اور اچھوتا پہلو لئے ہوئے تھا تحصیل فن کے اعتبار سے عروض میں اردو کی کتاب "جواہر العروض" خود ان کی تصنیف کی ہوئی اور دوسری کتاب ارشاد خاقانی شاہد بین عادلیں ہیں ۔

اصل بات یہ ہے کم سے کم علمی مذاق کے ہر شعبے میں ایک نہ ایک تصنیف بادشاہ کی موجود ہے۔ پند و نصائح میں "نصائح اختری" اخلاق میں "مناظرہ بین النفس و العقل" مراثی میں "دفتر غم" مجربات خاص میں "مجموعہ واجدیہ" علم موسیقی کے بیان میں "ناجو"۔ "ولطن اور "بنی"۔ مثنویات میں "سرور خاقانی"۔ "حزن اختری"۔ "دریائے تعشق"۔ "بحر الفت"

"نامجات" و "شفتہ جات" میں "ملک اختر" خطابات میں "مثنوی بحر مختلف"۔ عروض میں "جواہر العروض"۔ ارشاد خاقانی" غزلیات میں چھ دیوان ضخیم اس کے علاوہ

اور بہت سے مختلف فنون کی کتابیں ہیں۔ بادشاہ اگرچہ کسی سے تلمذ نہ رکھتے تھے لیکن طرزِ کلام زیادہ تر میر و مرزا کے اندازِ شاعری سے ملتا جلتا تھا۔ شاعری میں بڑے بڑے سخن فہم شاعر پکار اٹھتے تھے "خداوند یہ شاعری نہیں سحر ہے اعجاز ہے"
فارسی ترکیبوں سے کہ جملے ایک جدید شان سے جھلکتے تھے۔

اصنافِ سخن میں صرف قصیدے ایک ایسی چیز ہیں جن کے لکھنے کی بادشاہ کو احتیاج نہ تھی۔ مگر آخر وہ بھی ائمہ معصومین علیہم السلام کی شان میں لکھے۔

مرثیوں میں اگرچہ نازک خیالی اور شاعرانہ تخیلات نہیں لیکن احادیث کا ہو بہو ترجمہ اور سادی عبارت کچھ عجیب مزا دیتی ہے۔

زمانہ ولی عہدی سے غزل گوئی کا شوق ہوا۔ عروض و قافیے کے رسالے ازبر کیے مشکل سے مشکل بحروں میں بغیر کسی کی اصلاح کے موتی پروئے۔ اور مشاعرے میں غزل پڑھی۔

بہت سے سخن فہم شاگرد ہوئے۔ نواب الدولہ رخشاں تعیش الدولہ عیش۔ منشی مظفر علی ہنر۔ مرزا محمد عباس شاد۔ لائق الدولہ شاہد اور شبیر وغیرہ کو برسوں اصلاح دی۔ غزل میں جو لفظ بنا یا پتھر کی لکیر ہو گیا۔ جب زمامِ سلطنت ہاتھ میں لی۔ شعر و سخن کا چرچا بہت کم ہو گیا تھا۔ مگر باوجود اس کے دو منشی تصنیفات کی تحریر پر لازم تھے جملہ تصنیفات کی فہرست انشاء اللہ پھر اضافہ کی جائے گی۔ عہدِ سلطنت کا ذکر ہے منشی امیر اللہ تسلیم نے جو علاوہ شاعر ہونے کے خوشنویس بے بدل تھے۔ ایک عریضہ حضرت ابو المنصور کی خدمت میں نظم میں نہایت خوشخط پیش کیا۔ اتفاق وقت سے حضور کی نظر اس عرضداشت پر پڑ گئی۔ دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور بعد ملاحظہ شرح دستخط نظم لکھوائی وہ اشعار یہ ہیں۔

بشنو اے خوشنویس اے خوشگو　　ہر دو فن سے کنی و ہر دو نکو
اسم تو مندرج بہ دفتر شد　　نسبت دہ روپیہ مقرر شد

اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح حضور اردو نظم میں قادر الکلام تھے اسی طرح فارسی میں بھی برجستہ فی البدیہہ کہتے تھے۔

بادشاہوں کا کلام اس سبب سے لوگ کم دیکھتے ہیں۔ کہ ان کی شاعری تعریف

کی بوچھار سے کمال کی حد تک نہیں پہنچنے پاتی اور صفائی بیان کو بیجا خوشامد سے پختہ کلامی اور کہنہ مشقی نہیں آنے پاتی۔ مگر شاہ اختر کا کلام اس عیب سے بری تھا وہ اپنے کلام کو ہمیشہ نکتہ چینی کی نگاہ سے دیکھتے تھے جس کا خاص سبب یہ تھا کہ وہ کسی کے شاگرد نہ تھے۔ ان کو یہ شک ہمیشہ دامنگیر رہتا تھا کہ ایسا نہ ہو کہ کوئی نقص شاعری کلام میں رہ جائے اور چونکہ خود سخن فہم تھے۔ اسی سبب سے ایسے ویسے شاعر کی غزل ان کے مشاعرے میں مشکل سے مدح کی مستحق ہوتی تھی۔ دوسرے اہل کمال کا کثیر مجمع اس کے جھنک سے ہر اک محک امتحان بنا ہوا تھا۔ کوئی لفظ بے محل صرف کیا اور شاعر نظر سے گر گیا۔ ایسا ویسا شاعر تو سامنے منہ نہیں کھول سکتا تھا۔ آتش و ناسخ کی چوٹیں۔ برق اور رشک کی نوک جھونک۔ اکتساب فن کے واسطے کیا کم تھیں۔

ایک مرتبہ ایک شاعر نے ایک شعر شاہ پر پڑھا ؎

اہل جوہر نہیں جھکتے ہیں کسی کے آگے
ٹوٹتی ہے وہی تلوار جو فولادی ہے

حضرت نے بہت پسند فرمایا اور تمام مشاعرے نے داد دی۔ دوسرے مشاعرے میں ان کے حریف نے اسی کے جواب میں ایک شعر کہا جو عام پسند ہوا ؎

نیک و بد سب سے جھک کے ملتے ہیں
دونوں ناکوں پہ تیغ کستی ہے

اسی طرح ہر مشاعرے میں نوک جھونک "اشارتاً و کنایتاً" چوٹیں فی البدیہہ اشعار ہوا کرتے تھے اور داد سخن ملتی تھی لیکن جان عالم کے تو باوجود مشاغل امور سلطنت کے جو کچھ فرمایا آویزۂ گوش خلائق ہوا۔ ہر غزل مقبول خاص و عام تھی۔
مشکل سے مشکل اور سنگلاخ زمین آپ کے دریائے فکر کے آگے پانی تھی۔ ہر پہلو پر جزئیات بلاغت کا خیال رہتا تھا۔ پھر تشبیہات و استعارات کی ملمع کاری نور علیٰ نور

ان سب باتوں سے قطع نظر کر کے تمام کلام پر اجمالی نظر ڈالی جائے تو معنوی خوبیاں اور عمدہ تخیل کے سمندر موج زن نظر آئیں گے۔

جزئیات پر خیال کیجئے تو قلیل استعمال قافئے اس شائستہ پہلو سے نظم کئے ہیں جن سے بہتر کہنا غیر ممکن ہے ؎

بندے کو اس کے عشق ہے ذات و صفات کا
مبدع حقیقتاً ہے وہ کل کائنات کا

حمد میں صفات و کائنات کے قلیل الاستعمال قافیے کس عمدہ تخیل کے ساتھ ادا کئے ہیں۔

ناقوس برہمن سے صدائے اذاں سنی
مسجد سے میں نے قصد کیا سومنات کا

توحید پرستی کا ثبوت اس سے بڑھکر کیا ہو سکتا تھا۔

جا سے بیجا ہو گئے کس کا رہا مسکن بجا
عشق کی منزل سے کب ہیں دوست اور دشمن بجا

رشک پائے یار سے پامال ہیں اہلِ فرنگ
ٹھوکر و ںنے اس بتِ خود کام کی ارگن بجا

رہرو ملک عدم کا حال کچھ کھلتا نہیں
اے جرس اس قافلے پر ہی ترا شیون بجا

مذکورۂ بالا اشعار میں خوبی معانی اور شوکت کے علاوہ ایک خاص بات یہ ہے کہ اس کی ہر ردیف کے جدا جدا معانی پیدا ہوتے ہیں مطلع میں "بجا" کے معنی ٹھکانے کیلئے گئے ہیں۔ یعنی "برجائے خود" دوسرے شعر میں "بجا" نواختن کے معنی پر نظم ہوا ہے تیسرے شعر میں "بجا" درست اور صحیح کے معنی دیتا ہے۔

ابرو کا کوئی مجھ پر اب وار نہ ٹھہرے گا
وہ ترک بھی عاری ہے زنہار نہ ٹھہرے گا

کانٹا ترے تلوؤں کا آنکھوں سے نکالیں گے
کھٹکا ہے نگاہوں میں یہ خار نہ ٹھہرے گا

ٹٹ پونجیوں کا اختر بنجارنے میں دورا ہے
دوکان اٹھا ڈالو بازار نہ ٹھہرے گا

بعض بعض مقام پر رعایت لفظی کو آپ نے صرف کیا ہے لیکن اس میں رعایت معنوی کا خوبصورت پہلو مستتر ہے۔

ساون کی طرح ہجر میں مینہ آنکھوں سے برسا
بجلی کا پڑا وصل میں کچھ نور نظر سا

پایا نہ کوئی جا‌ءِ دفن دیدۂ تر سا
چشموں سے بہت کھینچتے ہیں اشکو نکا چرسا

کس کی نظرِ صاف کی تاثیر ہوئی ہے
اختر کو نہ دیکھا تھا کبھی ہم نے قمر سا

ولہ

ابلق شب کو اگر یار نے موڑا ہوتا
توسن عمر رواں پر مرا کوڑا ہوتا

بیکلی سے ہوا بیکل ترا نازک شانہ
طفل غنچہ کے نہ کانوں کو مروڑا ہوتا

خاص لکھنؤ کی زبان اور محاورات جو بادشاہ کے کلام میں پائے جاتے ہیں وہ بہت معتبر اور مستند ہیں جس موقع پر جو جملہ استعمال کیا جاتا ہے اسی پہلو سے نظم کیا ہے۔ مثلاً

ترانہ گل کا جو پیک صبا نے سکھلایا
چمن میں نغمۂ بلبل کو میں اڑا لایا

پرِ تینگوں کے جلا کر صبحدم گل کر دیا بزمِ عالم میں یہی کیا شمع کا محصول تھا

زندگی تختہ پہ کی مر کے گئے قبر میں شاہ فکر آغاز میں ہوتا ہے یہ انجام نصیب
بدنِ صاف پہ رنگینی دکھاؤ صاحب قول ہارے ہو تو گل پھولنے کھاؤ صاحب
کہیں تارِ نظر بند نہ نزاکت پہ پڑے بال کی اوٹ میں جاتے ہو تو جاؤ صاحب

وہاں چھالے لب پہ ہے دھواں غم کا یہاں دل میں جلے گا چنبرِ گردوں حسینوں ان قرینوں پر
رہتا ہوں مرا اشک ہے قلزم کے برابر خاموش ہوں لیکن ہے تکلم کے برابر

بعض بعض اشعار سے آپ کی طرزِ معاشرت و علوئے ہمت کا پتہ بھی چلتا ہے۔

مذمتِ زر پرستی

بھلتی ہے زنِ حاملہ کی زر جو رکھے دوست تھیلی کا یقیں صاف ہوا مجھکو دفی پہ

نوشتۂ تقدیر

یہ عشق ترے حسن سے قسمت میں لکھا ہے افسوس نہیں چاہیئے ہم کو شدنی پر

نکالوں کس طرح دل سے ترے تیرِ نگہ کو مٹا سکتا نہیں انسان ہاتھوں کی لکیروں کو

غمِ پیری

دل بھی کمہلاتے ہیں جیسا جوں بال ہوتے ہیں سفید بلبلیں بھی سیر ہوں موسم ہے پت جھڑ کا اگر

اے جواز اب ضعیفی ہے ہماری ان دنوں پھینک دیتی ہے ہمیں یادِ بہاری ان دنوں

پابندِ علائق

فقط دل سے ہیں اے اعضائے انسیہ کرے سلطان نہ آزادی کی خواہش

مذمتِ دنیا

ترک ہے دنیائے دوں کنجِ قناعت ہے قبول یہ زنِ قحبہ ہے اختر کیا چھنالوں سے غرض

عیشِ دنیا بزمِ غم اندوز ہے رنج و غم توام مجھے ہر روز ہو

عشق حقیقی

کچھ نہیں اختر مجھے عشقِ مجازی سے حصول
اب تو معشوق حقیقی سے ہے اپنا اختلاط

جو معشوق حقیقی ہے مجھے اسکی غلامی ہے
وہ آقا ہے کہ سرنامہ ہیں جس کا نام نامی ہے

تعریف سخن

یہ شاعری ہے نسخۂ اکسیر سے سوا
اب میں چھپا ہوں خاک ہوا سب میں منکشف

مرے مضمون عروس شب میں زیور سے سجیلے ہیں
وہ مشاطہ ہوں میں میرے سبب سب نکیلے ہیں
اختر یہ فقط زورِ طبیعت ہے دکھانا
اشعار کا انداز ہے نو طرز مرصع

خضوع و خشوع

ہم نمازوں میں جو بے آس کھڑے رہتے ہیں
سامنے چشم کے وسواس کھڑے رہتے ہیں

کیوں نمازوں میں نہ زاہد حسن کا مشتاق ہو
ایسی کب تکلیف دی ہے عشق نے جو شاق ہو

توحید

چشم وحدت میں وہ معشوق جو لاثانی ہے
حلقۂ چشم بھی اک خانۂ سلطانی ہے

شاہد اصلی مجھے مقصود ہے
کعبۂ دل میں وہی معبود ہے

دونوں صفحے ہیں تری وحدت پہ دال
جب دوئی سے ان کو دیکھا فرد ہے

وہ جو معشوق حقیقی حسن میں موصوف ہے
عشق میں عاشق بھی اسکا شہر میں معروف ہے

تجرد

دفتر عالم میں بس وہ فرد ہے
جو مجرد اس چمن میں مرد ہے

مختلف مضامین

مئے رنگیں پہ لاکھوں کا سہرا جو رہوتے ہیں
رُخ ساقی سے ہیلینوش سب مخمور ہوتے ہیں

پردہ نشیں سمائے دل ناشناس میں
آتی نہیں یہ بات ہمارے قیاس میں

تولد بچہ اچھی ہو بد فرزند کے بدلے
اٹھالے باپ کو یارب سعادتمند کے بدلے

رکعتوں میں زاہدا اتنی تجھے تشکیک ہے
وسوسہ موئے میان یار سے باریک ہے
ڈھونڈھ لائیں گے سیہ بختی میں ہم تار نظر
مشعل مضمون سے روشن کو شک تاریک ہے

اگر محراب ابرو بت کی ہو تو آنکھ ساحر ہے
مسلمانی بظاہر ہے مگر باطن میں کافر ہے
کھلے گی تختہ کاغذ پہ سرخی خون شاعر کی
قلم تیغ مضامیں سے یہ سر ہو جائے حاضر ہے

گو یہ گنجینہ جواہر و زواہر شباب کی شاعری کا ایک مختصر انتخاب لآلی گوہر شاہوار سے کم نہیں لیکن اگر زمانے نے مہلت دی تو آئندہ "دیوان قیصر مضموں"۔ "دیوان مبارک" "دفتر ہمایوں"۔ "دفتر پریشاں"۔ "سخن اشرف"۔ "کلیات اختری" کا انتخاب لکھا جائے گا۔

زیادہ تر افسوس کی بات یہ ہے کہ اکثر تصانیف کا قلمی ذخیرہ جس کو سلطان عالم خزینہ زر و جواہر سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ زوال سلطنت کے ساتھ ساتھ سفر میں گم ہو گیا۔

مثنویات میں "سرور خاقانی" ایک ایسی مثنوی ہے جس میں بادشاہ نے اپنی عاشقی کی سرگذشت لکھی ہے اور واقعات کے لحاظ سے بہت دلچسپ ہے۔ ممتوعہ بیگمات کے ابتدائی تعلقات اور متعہ کے قصہ طلب واقعات کو بالتصریح نظم فرمایا ہے۔

افسوس ہے ذی ہنر، قدر دان اہل فن، اکمل دوراں، سخن سنج، عادل، غریب پرور، رحمدل، بادشاہ، گلشن ہند کا بلبل ہزار داستان، لکھنؤ کا راجہ اندر، فریدوں فر جمشید قدر سکندر بخت نوشیروان زماں دفعتہ اپنے تخت و تاج سے جدا ہو کر کلکتے کے "مٹیا برج" میں "امام باڑہ سبطین آباد" کی مختصر قطع زمین پر غربت اور بیکسی کی میٹھی نیند سو رہا ہے جہاں سوائے مصیبت کے کوئی فاتحہ خیر پڑھنے والا نظر نہیں آتا۔ اور یہ کیونکر یقین آئے کہ مرنے کے بعد ان کو دنیا کے تمام جھگڑوں سے نجات ہو گئی اور وہ کنج مرقد میں عیش سے آرام پذیر ہوں۔ کیونکہ ؎

بھلا کیا خاک آئے چین اس کو کنج مرقد میں
رہا ہو جس کے سر کا تکیہ دوش نازنیں برسوں

مشاہیر شعرا کے مزار

میں اہل دہلی کا اس بات میں معترف ہوں کہ ان میں بیداری پیدا ہو چلی ہے وہ اپنے تاریخی روایات کو قایم رکھنا چاہتے ہیں اور پرانی یادگاروں کی قدر کرتے ہیں۔ آج کل لوگوں کو غالب کے مزار کی فکر دامن گیر ہے۔ اور سب طرف سے آوازیں آرہی ہیں بہ خلاف اس کے ہمارے بے فکر لکھنو کو دیکھیے جیسے دنیا و ما فیہا کی کچھ خبر نہیں وہی آزادی وہی بیفکری ہے۔ جو شاہی میں تھی۔ اگر غور کیا جائے تو ایسی یادگاروں کے قایم کرنے کی زیادہ ضرورت لکھنو میں ہے جہاں کی سرزمین پر دہلی کے مایہ ناز شاعر محو خواب ہیں۔ میر انشاء اللہ خاں انشا اسی خاک میں مدفون ہیں خیر ان کے مزار کا پتہ تو اب تک موجود ہے۔ اور ان کی نسل بھی باقی ہے ان کا مزار آئینہ بی بی کے باغ میں ہے۔ انشاء اللہ خاں کے بیٹے ماشاء اللہ خان تھے۔ جن کے پوتے ہدایت اللہ خاں ابھی تک بقید حیات تھے۔ یہ بڑے باکمال منجم اور شاعر بھی تھے۔ فراشخانہ میں رہتے تھے۔ حال میں انتقال ہوا ہے۔

میر تقی ہوس کا مزار بھی اب تک برائے نام موجود ہے اور ان کا دیوان قلمی بھی ان کی نسل کے لوگوں کے پاس دیکھنے میں آیا ہے۔

میر محمدی سوز کے مزار کو میں نے بہت تلاش کیا اور لوگوں سے دریافت کیا مگر اب تک پتہ نہ ملا۔ یہ بھی لکھنو کی سرزمین میں سو رہے ہیں۔ ان کا دیوان مکمل میرے پاس موجود ہے۔ سعادت یار خاں رنگین کے قلمی پانچ دیوان اور کچھ نثر کی کتابیں میری نظر سے گذریں لیکن ان کے مزار کا صحیح پتہ نہ معلوم ہوا۔ نہ اولاد کا پتہ چلا۔ نواب طالب علی خاں بہادر عیشی اردو اور فارسی میں بالکل غالب تھے۔ ان کی نظم اور نثر دیکھنے کے قابل ہے اردو کا دیوان سبحان اللہ دہلی کی شان اور غالب کا رنگ فارسی آمیز۔ فارسی کے دیوان میں نظیری کا رنگ یہ بھی لکھنو میں دفن ہیں۔ مگر مزار نامعلوم جگہ میں ہے۔

شیخ قلندر بخش جراَت دہلی کے مشہور شاعر تھے آخر میں نواب محبت خاں کے مصاحبوں میں نوکر ہوئے تھے اور حضرت عباس کی درگاہ کے قریب رہتے تھے۔ ان کی قبر کا پتہ لگانے

کے لئے میں بہت سرگرداں رہا۔

نواب محبت خاں کے پوتے نواب چندا میاں قمرؔ نے کہا دیکھئے ان کی کچی قبر اسی جگہ پر تھی یہاں ایک کچا مکان تھا جس میں ایک چھپر پڑا ہوا تھا۔ میاں جراتؔ اسی میں رہتے تھے۔ ان کی ایک لڑکی بھی تھی جب ان کا انتقال ہوا تو لڑکی نے اسی مکان میں باپ کو دفن کیا اور دو چار برس کے بعد باپ کے غم میں وہ غریب بھی مر گئی۔ اب نہ قبر ہے نہ نشان قبر نہ مکان ہے نہ چھپر ایک افتادہ میدان ہے۔ لڑکی کی بھی قبر اسی جگہ تھی۔

میر حسنؔ کی قبر کا نشان ابھی تک باقی ہے۔ میر خلیقؔ کی قبر بھی معلوم ہے۔ میاں جرکینؔ بھی دہلی کے رہنے والے اور اپنے رنگ کے اچھے کہنے والے تھے۔ جرکینؔ مصحفیؔ کے زمانے میں موجود تھے "وزیر گنج" میں میاں مخمور شاگرد مصحفیؔ کے پاس آیا کرتے آدمی یار باش اور برجستہ گو تھے۔ حاضر جواب بذلہ سنج ان کے مزار کا پتہ لوگوں نے بتایا ہے۔ گر میں نے ابھی تک نہیں دیکھا۔ ان کا دیوان چھپ چکا ہے۔

سید جعفر زٹلی بڑے مرتبے کے شاعر خاص دہلی کے باشندے بذلہ سنج لطیفہ گو خوش رو چھریرا بدن ظریف اپنے رنگ کے فرد تھے ان کا دیوان چھپ چکا ہے لیکن مزار کا اب تک پتہ نہیں لگا۔ نہ اولاد میں کوئی باقی ہے۔

میر صاحبقران یہ مارہرہ کے رہنے والے سید شریف النسب تھے۔ نواب آصف الدولہ بہادر کے عہد میں لکھنؤ آئے تھے۔ بہت قدر دانی کی گئی۔ دہلی کے مقلد تھے بہت پُر مذاق ہزل گو، ظریف پھبتی برمحل کہتے تھے۔ ان کے ایک نواسے سید حسن عسکری نابینا حکیم زندہ ہیں باوجود تنگدستی و افلاس کے وضع کے پابند حد کے منکسر مزاج مزار کا پتہ اب تک نہیں ملا۔ ان کا دیوان قلمی ملا ہے اور بہت سے دہلی کے مشہور شاعر ہیں جن کا میں بالتفصیل آئندہ ذکر کروں گا۔

اس وقت دہلی کے دو آفتاب و مہتاب کا ذکر کرنا ہے جن کے مزار کا نشان تک کچھ دنوں کے بعد نہ رہے گا۔ اول ملک الشعرا مرزا رفیع السوداؔ یہ سب کو معلوم ہے کہ مرزا سوداؔ دہلی کے روح رواں تھے ان کی نسل میں کچھ لوگ ہیں مگر مجھے پورا حال نہیں معلوم ہوا۔ قبر "آغا باقر" کے امام باڑے میں ہے۔ مگر گمنامی کی حالت میں پڑی ہوئی ہے۔ نہ کوئی کتبہ ہے نہ نشان دوسر ملک الشعرا میر تقی میرؔ دہلوی اکبر آبادی یہ وہ شاعر ہیں جن کا نام تمام ہندوستان میں آفتاب

کی طرح مشہور ہے نازک دماغ شاعر تھے۔ تمام ہندوستان ان کی زبان، ان کے کلام سے فیض اٹھاتا اور انہیں کی زبان پر فصحا کے فیصلے ہوتے ہیں۔ آج ان کا کلام زبان اردو کا قانون ہے۔ نواب آصف الدولہ کے عہد میں تو "مفتی گنج" میں رہتے تھے پھر "میاں الماس" کے امام باڑے میں قیام پذیر ہوئے۔ ان کے ایک فرزند تھے جن کا نام سید حسن عسکری عرف میر کلو تخلص عرش تھا جب مرنے لگے تو اپنے بیٹے سے کہا کہ "تم جانتے ہو کہ ہمارے پاس دولت دنیا میں سے تو کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس پر ہمیں فخر و ناز ہو اور اگر ہوتی بھی تو قابل فخر نہ تھی۔ ہاں کچھ زبان اُردو کے متعلق علم سینہ ہے۔ جو ہمیں بہ مشورہ ماموں سراج الدین خاں آرزو کے خدا نے عطا کیا ہے۔ اور اسی کے بھروسے پر ہم کو ہمیشہ ناز و استغنا رہا اور انہیں معلومات پر شاہی درباروں میں ہماری عزت و تکریم ہوئی۔ میں نے ان کو تمہارے واسطے ایک کتاب کی صورت میں لکھ لیا ہے۔ اس کتاب کا نام "اصول اردو" ہے۔ زبان کی حفاظت کے لئے یہ قواعد کافی ہیں ان اصول پر کاربند ہو گے تو اردو ایک دن بام ترقی پر قدم رکھیگی۔ اور یہ وصیت کرتا ہوں کہ اس کتاب کو بہت حفاظت سے رکھنا۔ مجھے تمنا تھی کہ خدا مجھے پوتا عطا کرتا۔ وہ اب تک پوری نہ ہوئی۔ شاید میرے بعد خدا تم کو بیٹا مرحمت کرے تو اُسے تعلیم دینا اور یہی کتاب یاد کرا دینا۔ ۔۔۔ اور اس کے مطالب سمجھا دینا۔ اور اگر کوئی اولاد نرینہ نہ ہو تو کسی اہل شاگرد کو یہ امانت تفویض کر دینا"

ملک الشعراء کو انتقال کئے ہوئے آج تخمیناً سو برس ہوتے۔ ان کے بعد عرش مرحوم کو بڑی بڑی معرکہ آرائیاں پیش آئیں۔ سب سے پہلے ناسخ مرحوم سے ان سے چوٹ چلی۔ ناسخ کا زمانہ موافق تھا۔ اور تمول حاصل تھا۔ وہ اکثر اپنے دوستوں کو بھی اپنا شاگرد کہہ دیا کرتے تھے۔ یہی سلوک میر صاحب کے ساتھ بھی کیا۔ میر کلو عرش تنک مزاج شاعر تھے۔ ان کو ایسی باتوں کی کہاں تاب تھی۔ ناسخ کے اس کلام سے برہم ہو گئے ہرچند ناسخ مرحوم نے معذرت کی۔ پذیرا نہ ہوئی۔ اس دن سے خانہ نشین ہو گئے۔

ایک شخص ذکی الطبع وجیہ شاگرد ہونے کو آئے ان کا تخلص آنسخ رکھا۔ آنسخ نے ناسخ پر بہت چوٹیں کیں اور بعض اعتراضات کئے جو آج تک زبان زد خلائق ہیں۔ مگر آخر میں آنسخ اعتراضات سے دست کش ہوئے۔ اور آپس میں صفائی ہو گئی۔ لیکن میر کلو عرش مدت العمر نہ ملے۔ افلاس، غریبی، فلاکت جو ان کا میراث پدری تھا۔ ان کو بھی ملا۔ آخر [illegible]

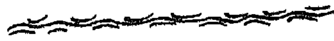
روسا کی صحبت میں افیون پینے لگے۔ انہوں نے ان کو بہت مٹا دیا۔ ناسخ کے کچھ دنوں کے بعد ناسخ کا بھی انتقال ہو گیا۔ ان کے بعد عرش کے چار شاگرد اور تھے میر سرفراز علی قمر۔ شیخ فدا علی عیش۔ منشی فلک۔ شیخ محمد جان شاد پیرو میر لکھنوی

شاد پیرو میر استاد کی بہت خدمت کرتے تھے۔ اور مرد مجرد تھے۔ شاعری کے انتہائی شوق میں آپ نے اپنا عقد نہیں کیا۔ تنک مزاج بہت تھے۔ مہذب انتہا کے میر تقی میر کے آخر وقت میں یہ شاگرد ہونے گئے۔ تو میر صاحب نے ان کو میر کلو عرش کے سپرد کیا۔ میر کلو نے تو ان پر بہت محنت کی اور ان کو بھائی کہتے تھے۔ یہ ہر وقت حاضر باش رہتے تھے۔ جب میر کلو میاں الماس کے امام باڑے سے اٹھ کر "رکاب گنج" میں آئے تو کتاب "اصول اردو" شاد پیرو میر کے سپرد کی اور کہا "میر صاحب قبلہ مرحوم کی نصیحت تھی کہ اس انمول جواہر کو اولاد یا قابل شاگرد کو دینا اولاد تو میں رکھتا نہیں اور شاگرد تم سے زیادہ قابل کوئی نہیں اس لئے کہ لکھنؤ کی زبان سے تمام شاعر متاثر ہوئے مگر تم نے دہلی کے طرز شاعری اور دہلی کی زبان کو نہیں چھوڑا اور میر کے صحیح پیرو تم ہو۔ اب یہ امانت تم کو سونپی جاتی ہے۔ تم کو اختیار ہے اپنے جس شاگرد کو قابل یا لائق دیکھنا اسے دینا۔ کچھ زمانے کے بعد میر کلو عرش کا بھی انتقال ہو گیا اور "رکاب گنج" وال کی منڈی میں دفن ہوئے۔ اس کے بعد ۱۳۱۵ھ میں ہمارے استاد شیخ محمد جان شاد پیرو میر کا انتقال ہو گیا۔ یہ "فاطمین"ؔ میں دفن ہوئے۔

اب کوئی اتنا بتانے والا نہیں ہے کہ میر تقی میر کی قبر کہاں ہے۔ اس کے متعلق مختلف روایتیں ہیں۔ معتبر لوگوں سے اتنا پتہ ملا کہ ایک میدان میں صرف قبر کا کچھ نشان باقی ہے عجب نہیں کہ دس پانچ برس میں یہ بھی مٹ جائے۔ کوئی ان امور کی بابت توجہ نہیں کرتا۔ اردو کی انجمنوں کا فرض تھا کہ ایسے لوگوں کے مزاروں کو قائم رکھیں۔ مگر کسی نے آج تک توجہ نہ کی مجھے اتنی فرصت نہیں ملتی ہے کہ پورا وقت اس تلاش میں صرف کروں صرف اتوار کے روز کبھی کبھی مقابر کی طرف جاتا ہوں اور جن مزارات کے پتے ملتے ہیں اور کچھ کتبے ہوتے ہیں ان کی نقل کر لیتا ہوں۔ اگر مقتدر اصحاب اس طرف توجہ کریں۔ اور اپنے مصارف سے ایک آدمی مقرر کر دیں کہ وہ مشاہیر دہلی کے مقابر ڈھونڈھ کر ان کے مزارات کی تعمیر کر دے

ه لکھنؤ میں درگاہ حضرت عباسؑ کے قریب یہ روضہ واقع ہے

تو مناسب یادگار باقی رہے۔ لکھنؤ میں دہلی کے سیکڑوں غالب دفن ہیں۔ لوگ ایک ہی غالب کو رو رہے ہیں۔ سر دست یہ انتظام ہونا چاہیئے کہ میر تقی میر اور سودا کی قبریں پختہ بن جائیں اور باقی شعرا کے مزار کی تحقیق کی جائے۔ ابھی تو دہلی کے بہت سے شعرا کی قبریں تلاش کرنا ہیں۔ اس کے بعد لکھنؤ کے مشاہیر کی قبروں کو قایم رکھنے کی ضرورت ہے۔ خواجہ آتش مرحوم کی قبر ایک مکان میں شامل کر لی گئی ہے جس کا ملنا اب ذرا مشکل ہے۔ پھر غیر ممکن ہو جائیگا۔







شعرا کے مزار

شہر خموشاں ایک ایسا عبرت خیز اور درد انگیز مقام ہے جس کو دیکھکر بے ساختہ آدمی کا دل بھر آتا ہے۔ اس خاک میں ایسے ایسے نازنین مہ جبین۔ ایسے ایسے ذی وقار بادشاہ ایسے ایسے مدبر وزیر۔ ایسے ایسے عقلمند حکما۔ ایسے ایسے روشن خیال شاعر سو رہے ہیں۔ جن کے نام سے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے جن کا رعب داب بات کرنے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ لیکن آج وہ ڈھیروں مٹی میں سے تپے ہوئے ہیں اور ان کی ہڈیوں تک کو ظالم زمین نے کھا لیا۔ حقیقت میں زمین تو آسمان سے بھی زیادہ ستمگر نکلی۔ وہ غریب تو زندوں کا دشمن ہے اور یہ مردوں سے بدلہ لیتی ہے۔ اور اس قدر گمنام کر دیتی ہے کہ مزار تک کا نشان نہیں رہتا۔

عام لوگوں کو تو جانے دیجئے۔ خاص لوگوں کے مزار کے نشان بھی مٹ چکے ہیں۔ انہیں میں ان لوگوں اور مخصوص شعرا کو لیجئے جو ہندوستان کی زمین پر اپنا ڈنکا بجا گئے ہیں۔ وہ مشاعرے کو درہم برہم کر دیتے تھے۔ جن کی تعریف میں چھتوں کی چھتیں اُڑ جاتی تھیں۔ ہمیشہ مشاعرے جن کے ہاتھ رہتے تھے۔ جو حاصل طرح غزل لکھتے تھے۔ جو ہمیشہ نیا مضمون باندھتے تھے۔ جن کے شعر میں اک نہ اک بات تازہ ہوا کرتی تھی۔ جو مرثیہ گوئی میں سرنام تھے۔ جو منبر پر بیٹھتے ہی لوگوں کو تڑپا دیتے تھے جن کا رقص منبری مطبوع عام تھا جن کی آواز میں لحن داؤدی کا اثر تھا۔ آج ان کے مزاروں کا پتہ لگانا بھی ہم کو دشوار ہے۔

مثل مشہور ہے کہ دنیا مردہ پرست ہے لیکن ہندوستان کی دنیا نہ مردہ پرست ہے نہ زندہ پرست۔ بات یہ ہے کہ ابھی ہندوستانیان میں اپنی مادری زبان کے تحفظ کا ذوق و شوق پیدا نہیں ہوا ہے۔ ورنہ وہ اپنے سلف کے آثار کو اس طرح نیست و نابود نہ کر دیتے۔ مگر جلد ہی ایک زمانہ آنے والا ہے کہ لوگ اپنے سلف کے نشانات ڈھونڈھینگے اور ان کے کارناموں کو ایک ایک سے پوچھیں گے۔ اور کوئی بتانے والا نہ ملے گا۔

جس طرح آج شکسپیر کا ترانہ انگلستان میں ایک ایک فرد کی زبان پر ہے اسی طرح

ہم بھی میر تقی میر مرحوم کے ایک ایک مصرع کو آنکھوں سے لگائیں گے اور ان کی نسل کو ڈھونڈیں گے اور ان کی خاک کے لیے تمام لکھنؤ کی خاک چھانیں گے۔ غضب یہ ہے کہ دلی والوں نے بھی اپنے غربت نصیب مسافروں کو بے وطن ہونے کے بعد نہ پوچھا کہ وہ کیا ہوئے اور کہاں گئے۔ کم از کم یہ تو ہوتا کہ غریبوں کی یادگار میں ان کا مزار بنوا دیا ہوتا۔ لکھنؤ والوں سے یہ شکایت ہی بیجا ہے۔ انہوں نے اپنے وطن کے شاعروں کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ جو غریب الوطن ان سے توقع رکھتے۔ ابھی تک لکھنؤ میں آتش کے دیکھنے والے زندہ ہیں۔ مگر آتش کی قبر کا نشان ان کو بھی معلوم نہیں۔ خلیل لکھنوی کو چار دن مرے ہوئے گذرے۔ اُن کے متعلق ایک ماسٹر صاحب نے بیان کیا کہ اُن کی قبر مراد آباد میں ہے۔ اور ان کا اصلی وطن وہی تھا۔ مراد آباد سے ایک صاحب تحریر فرماتے ہیں۔ یہاں مزار کا پتہ نہیں ملتا۔ زیادہ تحقیق سے ایک میر صاحب نے فرمایا خلیل کو ہم نے دیکھا تھا۔ نواب نادر مرزا صاحب ساکن "نواز گنج"[ع۵] کے داروغہ تھے۔ "مصاحب گنج" میں "ہزارا" کے باغ کے قریب رہتے تھے۔ پوچھا قبر کہاں ہے کہا یہ تو معلوم نہیں۔ مگر غالب گمان یہی ہے کہ لکھنؤ میں ہوگی۔ اب بتایئے اس تحقیق سے کیا کام چل سکتا ہے۔ میرا قصد یہ ہے کہ لکھنؤ دہلی کے اساتذہ کے مزارات کا نشان ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر لکھوں اور اگر خدا مجھے توفیق دے تو ان کے مزاروں کے قیام کی فکر کروں اس لئے میں اپنی تحقیق کو تحریر میں لاتا ہوں۔ اس بحث میں کچھ صحیح صحیح پتہ معلوم ہو جائیگا میں ایسی تحریک میں کسی سے مدد مانگنے کو ہمیشہ سے بُرا سمجھتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ جو کچھ مجھے کرنا ہو خود کروں۔

مصحفی کے مزار کا پتہ غالب گمان یہ ہے کہ "امروہہ[ع۱]" میں ملجائے۔ سنا گیا ہے کہ وہاں ان کی نسل میں دو ایک آدمی موجود ہیں۔ دوسری غرض اس تحریر سے یہ بھی ہے کہ شعرا کے مزاروں کا پتہ تاریخوں میں درج رہے ممکن ہے کہ اس کام کی آرزو ہمارے دل سے نہ نکلی۔ تو دوسرے لوگ اسے پورا کریں گے۔

نواب عاشور علی خاں عاشور "معالیجاں[ع۵]" کی سرا میں رہتے تھے مصحفی کے اچھے

ع۱ امروہہ ضلع مراد آباد

ع۵ یہ لکھنؤ کے محلوں کے نام ہیں۔ جو شاہی میں بہت آباد تھے۔

شاگردوں میں تھے۔ بہت سے لوگ ان کے شاگرد تھے۔ اُستاد گر مشہور تھے۔ ان کی قبر معالیخاں کی سرائے میں "پیر بخارا" کے تکیے میں سُنی جاتی ہے۔

میر تقی ترقی۔ بہت مشہور شاعر تھے۔ دہلی کے رہنے والے تھے۔ نواب آصف الدولہ بہادر کے زمانے میں لکھنؤ آئے تھے۔ "میر" تخلص کرتے تھے لیکن جب ملک الشعراء میر تقی میر لکھنؤ میں آئے اور ان کی شہرت نے ترقی پکڑی۔ تو آپ نے سوء ادب سمجھکر اپنا تخلص بدل ڈالا۔ اور "ترقی" کر دیا۔ آپ کے تین دیوان ضخیم میری نظر سے گذرے۔ پُرگو تھے افسوس ہے کہ ان کا کلام نہیں چھپا۔ ان کی قبر "مصری کی بغیا"[سے] میں ہے۔

میر جعفر علی حسرت۔ اُستاد جرأت ابتدا میں فیض آباد آئے۔ اور نواب شجاع الدولہ بہادر کے ملازم ہوئے۔ اور بہت سے قصیدے ان کی شان میں لکھے۔ اس کے بعد لکھنؤ میں بادشاہ کے ساتھ چلے آئے۔ نواب آصف الدولہ بہادر کی شان میں مشکل ردیف قافیوں میں قصاید لکھے۔ ان کے دو دیوان غزلوں کے اور ایک دیوان قطعات کا۔ ایک دیوان رباعیات کا۔ ایک دیوان قصاید کا۔ ایک مثنوی۔ ایک دیوان مخمس۔ میری نظر سے گذرا۔ قصاید بہت مشکل زمینوں میں لکھے ہیں۔ قصاید میں ان کا مرتبہ مرزا رفیع السودا سے کم نہیں ہے۔ نواب آصف الدولہ بہادر کے دربار میں ان کی بہت عزت تھی۔ صاحب استعداد تھے ۱۲۰۴ھ میں انہوں نے انتقال فرمایا۔ قبر ان کی مفتی گنج میں ہے۔

حشمتی۔ دہلی کے رہنے والے شاعر تھے۔ میر تقی کے پاس دہلی سے آئے۔ ان کے شاگرد ہوئے اور تا زندگی لکھنؤ میں رہے۔ زبان سیکھنے کے لالچ میں استاد کی خدمت کرتے رہے۔

چند اشعار درج ذیل ہیں۔

قد موزوں ہے تیرا رشک شمشاد	کہ جس کا ہے غلام اک سرو آزاد
قفس میں بال و پر باقی ہیں اب تک	بہار آئی ہے اب تو چھوڑ صیاد
دھڑکتا دل ہے یارب خیر کیجیو	کہ اب قاتل نے مجھکو کیوں کیا یاد

تم شوق سے جا بیٹھو اغیار کی صحبت میں	لو ہم تو چلے یاں سے اے یار خدا حافظ
محشر میں یہ بولیں گے سب رند کہ نکلا ہے	حشمتی کے گناہوں کا طومار خدا حافظ

[سے] یہ لکھنؤ کا غیر آباد محلہ ہے۔ شاہی میں بہت آباد تھا۔ اب صرف کربلا اور قبرستان ہے۔ مولف

لکھنؤ میں عہد ناسخ میں انتقال کیا۔ مزار کا کہیں پتہ نہیں ملتا۔

محتشم ایک مشہور شاعر تھے۔ دہلی سے لکھنؤ آئے تھے۔ شاگردی کا حال نہیں معلوم ہوا۔ مگر قرائن سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ سودا کے تلامذہ میں ہونگے۔ اس لئے کہ ان کے کلام میں اضافتیں زیادہ ہیں۔

کیوں نہ پیسے مجھے ہو کر مرا دل دو ٹکڑے — آسیا بنتی ہے ہو جائے جو سل دو ٹکڑے
بیت بجتی ہو یہ ابرو کی کہ بیتے ہو جائے — ہو اگر یار کے رخسار کا تل دو ٹکڑے
اڑ گئے صندل و کافور کے پھائے جلکر — تپش قلب نے کی صبر کی سل دو ٹکڑے

بیت بجتی شاید قدماے دہلی کا محاورہ ہو۔ آج کل لکھنؤ میں بیت بازی بولتے ہیں محتشم کے نام اور مزار کا پتہ نہیں ملا۔

مرزا جعفر علی فصیح۔ مرثیہ گو مشہور تھے۔ دہلی کے رہنے والے تھے۔ لکھنؤ میں عروج پایا۔ اور آخر وقت کربلاے معلی جاکر انتقال فرمایا۔

میاں دلگیر مرثیہ گو پہلے ہندو تھے۔ قوم کے کائستھ لالہ شیو پرشاد کے عزیز تھے۔ ان کے محلے میں رہتے تھے۔ اس کے بعد مسلمان ہوئے۔ مرثیہ گویوں میں سرنام ہوئے ۱۲۶۴ھ میں انتقال کیا۔ رشک نے ان کے انتقال کی تاریخ لکھی

در گلشن خلد با جمیع شہدا — گشتہ پابوس مرثیہ گو دلگیر
تاریخ وفات او نوشتم لے رشک — آہ افسوس مرثیہ گو دلگیر

سنا جاتا ہے کہ لکھنؤ کی کسی کربلا میں ان کی قبر موجود ہے۔

میر ضمیر نامی مرثیہ گو تھے۔ مفتی گنج میں رہتے تھے۔ وہیں انتقال کیا۔ ان کی قبر "مفتی گنج" میں خام موجود ہے۔

میر ببر علی انیس ابن میر خلیق بن میر حسن۔ لکھنؤ کے مشہور مرثیہ گو تھے۔ ابتدا میں غزلیں بہت کہیں۔ سنہ ۱۲۹۲ ہجری میں انتقال کیا۔ شاد پیر نے تاریخ انتقال لکھی ہے۔

مرثیہ گو انیس سحر بیاں — زیں جہاں رفت شد بہشت مقام
بے سر و پا تمام شد بے سال — خود مصرعہ چہ مرثیہ چہ سلام
۱۲ ہجری ۹۲

ان کا مزار بے مرمت موجود ہے۔

مرزا سلامت علی دبیر۔ نامی مرثیہ گو تھے۔ ان کا مزار "مرزا دبیر کی گلی" میں ہے ۱۲۹۲ھ میں انتقال فرمایا۔

سید حسین مرزا عشق۔ مشہور مرثیہ گو تھے۔ "رکاب گنج" میں مکان تھا۔ تھوڑا زمانہ ہوا انتقال فرمایا۔ مزار "رکاب گنج" میں ہے۔

خواجہ محمد علی جوش ابن خواجہ حیدر علی آتش ۱۲۶۴ھ میں انتقال فرمایا۔ رشک نے تاریخ انتقال لکھی ہے ؎

بنزد پدر رفتی افسوس حیف

شاہ یقین۔ دہلی کے پرانے شاعر تھے۔ میر انشاء اللہ خاں کے ہمعصر تھے۔ دہلی سے لکھنؤ میں آئے۔ مظہر کے شاگرد تھے۔ غزل برجستہ کہتے تھے۔ پانچ شعر سے زیادہ غزل کبھی نہیں کہی۔ ایک مطلع درج ذیل ہے۔

کون کر سکتا ہے۔ اس خلاق اکبر کی ثنا
نارسا ہے شان میں جس کی پیمبر کی ثنا

لکھنؤ میں انتقال کیا۔ مزار کا پتہ نہیں ملتا۔

شیخ غلام علی راسخ عظیم آبادی شاگرد میر تقی میر۔ مدت تک لکھنؤ میں رہے۔ آخر عظیم آباد واپس گئے۔ پیر کے دن ۲۰ تاریخ جمادی الاول ۱۲۳۸ھ میں انتقال فرمایا۔ اور وہیں دفن ہوئے۔

شاہ مظلوم۔ دہلی کے شاعر تھے۔ میر کے شاگرد تھے ۱۲۵۶ھ میں انتقال فرمایا۔ قبر کا نشان نہیں معلوم کسی نے تاریخ انتقال کہی ہے۔

ہائے افسوس وائے مظلوم است

میرزا تقی خاں ہوش۔ دہلی کے مشہور شاعر تھے۔ ابتدائے شاعری میں لکھنؤ چلے آئے تھے۔ یہاں نام پایا۔ "مفتی گنج" میں رہتے تھے۔ وہیں انتقال کیا۔ قبر ان کی "مفتی گنج" میں ہے۔ اور بعض ان کے خاندان کے لوگ موجود ہیں۔

محشر ریختی گو دہلی کے رہنے والے۔ دبلے پتلے نازک اندام۔ خاندان شاہی سے تھے۔ شعر خوب پڑھتے تھے۔ اور سامعین کو ہنسا دینا اور رلا دینا۔ ان کا ادنےٰ سا کام تھا۔ ایک شعر ان کا لکھا جاتا ہے ؎

محل میں بھیجتے ہیں، ماں، بہن کو بھیا نکٹے
زبانی شیخیاں محشر ہیں اونچی ناک والوں کی

لکھنؤ میں بہت دنوں تک قیام رہا۔ شیخ فدا علی عیش اور منشی دیاکرشن ریحاں کے جلیس تھے لیکن متفکر اور کبیدہ خاطر رہتے تھے۔ آخر نہ معلوم کس طرف نکل گئے۔ اور کہاں انتقال ہوا۔

نواب مرزا شوق۔ لکھنؤ کے رہنے والے مشہور شاعر تھے۔ ان کی چار مثنویاں مشہور ہیں۔ لکھنؤ میں انتقال کیا۔ مزار کا پتہ نہیں معلوم ہوا۔

شیخ فضل احمد کیف شاگرد میر وزیر صبا و خواجہ آتش "سبزی منڈی"ؔ میں رہتے تھے اور مرد مجرد تھے۔ لکھنؤ میں انتقال فرمایا۔ "عیش باغ"ؔ میں دفن ہوئے۔ ان کا ایک مطلع ہے۔ ؎

بت پرستی پہ جو اپنا دل ناشاد آیا
سنگریزوں میں نظر حسنِ خداداد آیا

قبر کا نشان موجود ہے۔

عیسیٰ خاں تنہا۔ دہلی کے رہنے والے۔ لکھنؤ میں مشہور ہوئے اور یہیں انتقال کیا۔ قبر کا نشان نہیں ملتا۔

امیر علی خاں ہلال شاگرد میاں برق "یار" میں رہتے تھے۔ اور "جلاجل" نواز تھے شعر بہت اچھا کہتے تھے۔ لکھنؤ میں انتقال کیا۔ قبر گئو گھاٹ پر بتائی جاتی ہے۔

میر فائق۔ شاگرد عرش مرحوم مشہور شاعر تھے۔ حال میں انتقال کیا۔ لکھنؤ کی کسی کربلا میں دفن ہوئے۔ ایک مطلع درج ہے ؎

دل تپاں ہے برین دلبر کا مکاں ملتا نہیں
طائر قبلہ نما کا آشیاں ملتا نہیں

؎ لکھنؤ میں چوک کے پاس یہ محلہ ہے۔ مؤلف

؎[1] لکھنؤ میں نواب آصف الدولہ بہادر نے یہ باغ بنوایا تھا۔ ساون میں مشہور میلے ہوا کرتے تھے۔ ادنیٰ طور پر اب بھی ہوتے ہیں۔ یہ باغ ویران ہو کر قبرستان کی صورت میں اب بھی موجود ہے۔[12] ؎[2] دریا گومتی کے کنارہ یہ گھاٹ مشہور ہے۔[12]

سید سرفراز حسین قمر لکھنوی تلمیذ عرش مرحوم لکھنؤ میں انتقال فرمایا۔ قبر کا نشان نہیں معلوم ہوا۔ ایک مطلع درج ہے۔

دلِ وارفتہ ڈوبا جو دریائے محبت میں
حصارِ عافیت گرداب کو سمجھا مصیبت میں

آغا حیدر افسوس۔ رئیس لکھنؤ شاگرد اسیر "آغا میر کی ڈیوڑھی" پر رہتے تھے۔ باوضع رئیس تھے تخمیناً بتیس برس ہوئے انتقال فرمایا لکھنؤ میں دفن ہوئے۔ قبر کا نشان نہیں معلوم۔ ایک مطلع درج ہے۔

جیسے جاتا ہے کوئی غیر کے گھر بھولے سے
کاش آجائے مرا یار ادھر بھولے سے

میر برشتہ شاگرد ذوق مرحوم۔ بہت اچھا کلام تھا۔ اسیر کے زمانے میں لکھنؤ آئے تھے۔ دعوے ہمہ دانی بہت تھا۔ مشہور ہے کہ آپ نے کسی اعتراض کی وجہ سے ہیرے کی انگوٹھی چبالی۔ لکھنؤ میں سنا جاتا ہے۔ کہ پیر جلیلوں کے تکئے پر دفن ہوئے۔ ایک مطلع سننے میں آیا ہے۔

مہندی جو وہاں پر کفِ قاتل میں لگی ہے
یاں آگ ہمارے جگر و دل میں لگی ہے

آغا ہجو ہندی مشہور شاعر تھے۔ لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ اور یہیں دفن ہوئے "بوستانِ خیال" کا ترجمہ اردو انہوں نے کیا تھا۔ مزار کا پتہ معلوم نہیں ہوا۔

غیور تخلص دلی کے رہنے والے میر تقی کے شاگرد لکھنؤ میں آئے سب سے پہلے ایک بنئے سے ملاقات ہوئی۔ اس نے کہا۔ میرے یہاں پندرہ روپیہ ماہوار آپ کو ملسکتا ہے اور کھانا اور موٹا کپڑا۔ آپ نے کہا کہ میری گذر اس میں نہ ہوگی۔ اس نے کہا۔ اچھا آپ قیام کیجئے میں کسی سے آپ کی سفارش کر دوں گا۔ دو مہینے تک قیام کیا۔ کوئی صورت پیدا نہ ہوئی۔ آخر بنئے کی ہجو میں ایک مثنوی لکھی۔ جس کے چند شعر لکھے جاتے ہیں "جگل کشور" بنئے کا نام تھا۔

عجب ایک منحوس نقال تھا غرض صاحب ملک اور مال تھا
کوئی نام نحس اس کا لیتا نہ تھا بجز گالیاں اس کو دیتا نہ تھا

بخیلی میں مشہور تھا اس قدر — کہ قارون کی جوتی تھی اور اس کا سر

۱۲۱۲ھ کا یہ واقعہ ہے۔ آپ لکھتے ہیں)۔ میں نے بنئے سے ملاقات کی اس نے کہا

ہمارے یہاں دال روٹی تو ہے — جو پوشاک پہنوگے موٹی تو ہے
اگر پانزدہ روپیہ ہوں قبول — تو ہر ماہ میں مجھ سے ہونگے حصول

آپ نے جواب دیا۔

کرونگا بھلا اس میں کیونکر معاش — مگر اور کہیں اب کروں گا تلاش

اس نے کہا آپ میرے یہاں مہمان رہئیے میں کہیں کام دلوا دوں گا۔ آپ وہاں کئی مہینے تک رہے۔

رہا اس کی امید پر چند ماہ — بحال پریشاں بحال تباہ

نتیجہ یہ ہوا کہ آپ وہاں سے خفا ہو کر چلے آئے۔ اور اس کی ہجو لکھی۔ بعد چندے مرزا جعفر صاحب کی شان میں ایک قصیدہ کہہ کر پیش کیا۔ وہاں سے کچھ وظیفہ مقرر ہوگیا اگلے زمانے کے شعرا میں یہ صفت تھی کہ ذرا سی بات پر ہجو لکھ ڈالتے تھے۔ اور وہ زمانہ بھی قدردانی کا تھا۔ لوگ نازک مزاجیاں اٹھاتے تھے۔ ورنہ ایک بنئے کا اردو زبان کی خدمت کے لئے کچھ روپیہ صرف کرنا قابل تقلید امر ہے۔ مگر غیور نے اس کی بھی قدر نہ کی انتقال لکھنؤ میں ۱۲۴۶ھ میں ہوا۔ مزار کا کہیں پتہ نہیں ملا۔ غالب گمان یہ ہے کہ "اصفی گنج" میں ہوگا۔ کیونکہ نواب آصف الدولہ بہادر کے زمانہ میں یہ لکھنؤ آئے تھے۔ اور اس وقت کے تمام شعرا اصفی گنج میں زیادہ رہتے تھے۔ آج کل مغربی لکھنؤ ویران ہو رہا ہے۔ اس لئے وہاں کی قبروں کا نشان ذرا مشکل سے ملتا ہے۔ سچ ہے۔

اسیر فاتحہ پڑھنے کوئی کہاں آئے
مزار ہے نہ نشانِ مزار باقی ہے

آغا تخلص نام مرزا علی محمد عرف منے آغا صاحب۔ لکھنؤ سرائے میوہ میں رہتے تھے۔ جوانی میں مدقوق ہوگئے۔ علاوہ عربی فارسی کے انگریزی بھی جانتے تھے۔ ۴ ذیقعدہ ۱۳۱۶ھ بارہ بجے دن کو طویل علالت کے بعد انتقال فرمایا۔ امام باڑہ غفران مآب میں دفن ہوئے۔ اولاد میں پانچ لڑکے اور ایک لڑکی چھوڑی لوح مزار پر میر اعجاز حسین صاحب اعجاز لکھنوی کی یہ تاریخ کندہ ہے۔

چل رہا ہے خزاں کا جھونکا آہ — گل ہوئے ہیں چراغ کیا کیا آہ
ہائے کس کس کا سنئے صدما آہ — سور میں چھپ گئیں ہیں صدما آہ
بس چلے کیا قضا کے ہاتھوں سے — دق ہوئے ہیں جو ان رعنا آہ
دیکھو نیرنگ گلشن فانی — ہے طلسم جہاں تماشا آہ
شیعہ خالص برادر مومن — بے نظیر اور حسین رعنا آہ
دوپہر، پیر، چودھویں ذیقعد — ہوئی خالی سرائے دنیا آہ

مصرعہ سال ہو گیا اعجاز
ہائے صد حیف سنئے آغا آہ

۱۶ ۱۳ھ

مولوی عبدالرحیم صاحب کلیم لکھنوی نے بھی تاریخ وفات لکھی جو انکے مطبوعہ دیوان میں موجود ہے

نحس خالی کی چودھویں تھی کلیم — ہائے مشفق مرے کہاں گئے آج
کہا ہاتف نے سال ہجری میں — سنئے آغا سوئے جناں گئے آج

۱۶ ۱۹ھ

افسوس کہ آپ کا کلام دستیاب نہ ہوا۔ صرف چند اشعار نوحہ جات کے انتخاب میں آئے۔ مرحوم غزلیات بہت کم کہتے تھے۔

بانو کہتی تھیں باآہ و زاری رن کو جاتی ہے شہ کی سواری
بن میں لٹتی ہے دولت ہماری رن کو جاتی ہے شہ کی سواری
ہائے سنتے نہیں میرے اصغر تم تو سوتے ہو جھولے کے اندر
ماں یہ کہتی ہے رو رو تمہاری رن کو جاتی ہے شہ کی سواری

واری کس سے کہوں اب میں جا کر کوئی باقی نہیں میرے سر پر
ظلم بے حد کریں گے یہ ناری رن کو جاتی ہے شہ کی سواری
ننھے ہاتھوں میں لے لو سپر کو چھوڑو تنہا نہ اپنے پدر کو
اٹھو بیٹا تمہارے میں واری رن کو جاتی ہے شہ کی سواری
شہ تو جنت کو آغا سدھارے رو کے کہتے ہیں سب انکے پیارے
کون لیگا خبر اب ہماری رن کو جاتی ہے شہ کی سواری

بین زینب یہ کرتی تھیں رن میں کارواں لٹ گیا میرا بن میں
منتظر ہو گی صغرا وطن میں کارواں لٹ گیا میرا بن میں

زینب نے کہا لاشۂ سرور سے لپٹ کر لے میرے برادر
کفناؤں میں کیوں کر تمہیں رکھتی نہیں چادر لے میرے برادر
آنکھوں کو ذرا کھول کے دیکھو تو میں واری میت پہ تمہاری
روتے ہیں علی اور ہیں زہرا بھی کھلے سر اے میرے برادر

مشتاق تخلص نام مرزا بہادر علی عرف چھٹن صاحب خلف منے آغا صاحب آغا مرحوم لکھنوی پہلے ان کا تخلص جوہر تھا۔ پھر زار اختیار کیا۔ آخر میں مشتاق تخلص پسند آیا قلمی دیوان انکے خاندان میں موجود ہے۔ ہر صنف شاعری پر قادر تھے۔ اُن کی تصنیف سے تاریخیں رباعیاں مثنوی، قطعات، مخمس، مسدس، سب موجود ہیں۔ سید بندہ کاظم صاحب جاوید لکھنوی کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ دلالی محلے میں ماہواری مشاعرہ کی بنیاد بھی قایم کی تھی درسیات فارسی میں فارغ التحصیل تھے۔ انگریزی میں بھی کافی قابلیت تھی۔ مدقوق ہو کر عین شباب میں ۱۴۔ ذیقعدہ ۱۳۱۹ھ دس بجے شب کو انتقال فرمایا۔ اور کربلا کے تال کٹورہ میں۔ دفن ہوئے۔ اولاد میں دو لڑکیاں اور ایک لڑکا مسمی مرزا صادق علی عرف مچھن جس کی عمر صرف ایک ماہ ستائیس دن کی تھی۔ اپنی یادگار چھوڑا۔ باپ کی وفات سے گیارہ برس بعد لڑکے نے بھی مدقوق ہو کر ۱۳۔ صفر ۱۳۳۰ھ ہجری پانچ بجے صبح کو انتقال کیا۔ اور کربلائے عظیم اللہ میں دفن ہوا۔ مشتاق مرحوم بہت منکسر مزاج خوش خلق آدمی تھے۔ افسوس کہ لوح مزار پہ کوئی قطعہ کندہ نہیں ہے۔ چند اشعار درج ذیل ہیں۔

لکھا ہے وصف اکثر خال روئے شاہ ذیشاں کا   نکیوں ہر نقطہ دُرِ بے بہا ہو میرے دیواں کا

بپا حشر ہو تو یہ ارمان نکلے   کسی کا ہو ہاتھ اور دامن کسی کا

نہ ہوا آئیگی تربت میں نہ روزن ہوگا   شمع روشن سے نہ روشن مرا مدفن ہوگا

زیر دیوار جگہ تھوڑی سی رہنے دیجیے — یاں کبھی آپ کے جانباز کا مدفن ہوگا

واہ دل کو مرے بیٹھے ہیں سنبھلنے نہ دیا — کوئی پہلو ترے ناوک نے بدلنے نہ دیا

نہ مجھے زمیں دباتی نہ کبھی فشار ہوتا — پس مرگ آسماں پر جو مرا مزار ہوتا
نہیں منصفی سے کہہ دو تمہیں کیوں دل اپنا دیتا — اگر اپنے دل پہ کچھ بھی مجھے اختیار ہوتا

اٹھا ہے جھوم جھوم کے ابر بہار آج — لا ساقیا پلا دے مئے خوشگوار آج

تری نگاہ نے بسمل کیا زمانے کو — یہ تیغ وہ ہے کہ جس کی کہیں پناہ نہیں
تمہاری گردش چشم سیہ نے مارا ہے — فقط ہمیں گردش قسمت ہی سے تباہ نہیں

خطا پہ ہے تمہارا تیر دیکھو — نگہ پڑتی ہے سینے پہ تقدیر دیکھو

بیکسی بعد فنا میری لحد پر مشتاق — رو کے کہتی ہے کہاں چھوڑ گئے تم مجھ کو

سر بالیں وہ بیٹھے ہیں ہمارا دم نکلتا ہے — ٹھہر جا اے اجل اس وقت ان کا جی بہلتا ہے
خبر پاتا ہے اس ظالم کے آنے کی جو فرقت میں — تو رعب حسن سے مشتاق دل ہاتھوں اچھلتا ہے

اڑا رہی ہے صبا خاک جن مزاروں کی — وہ تربتیں ہیں تمہارے ہی خاکساروں کی
ابھی تو سینکڑوں کے دل لئے ہیں منہ کر کے — حضور لیجیے گا جان بھی ہزاروں کی

خار صحرا رہ گئے جب ٹوٹ کے — پاؤں کے چھالے بھی روئے پھوٹ کے
رہزنان عشق اے مشتاق آج
لے گئے اسباب راحت لوٹ کے

آہ کی باہم رسائی دیکھ لی — قسمت اپنی اور پرائی دیکھ لی
آپ کا مشتاق پیتا ہے شراب — خوب اس کی پارسائی دیکھ لی

دل لئے جاتا ہوں نذرِ یار جانی کیلئے — اس سے بہتر اور کیا شے ہے نشانی کیلئے

نکالو عاشقوں کی حسرتِ دیدار تھوڑی سی — ہٹا دو روئے روشن سے نقاب اے یار تھوڑی سی
خوشا قسمت زہے طالع اگر مشتاق لیتا جا — کفن میں خاک پائے احمدِ مختار تھوڑی سی

میرے کوچے سے اگر نکلے سواری آپ کی — اک نظر پھر دیکھ لوں صورت وہ پیاری آپ کی

شدتِ دردِ جگر کو بھی دوا سمجھیں گے — بے خودی میں نہ قضا کو بھی قضا سمجھیں گے
تم اگر زہر بھی دوگے تو دوا سمجھیں گے — دستِ نازک سے مجھے ساغرِ مے دے بھی چکو
ساتھ لے جائینگے مشتاق تخلص اپنا
اب نہ بدلیں گے اگر لاکھ برا سمجھیں گے

داغ تخلص نام مرزا سجاد علی عرف لڈن صاحب ابن منے آغا صاحب آغا مرحوم لکھنوی سرائے میوہ لکھنؤ میں رہتے تھے۔ درسیات فارسی میں فارغ التحصیل تھے۔ انگریزی میں اچھی قابلیت تھی۔ ہندی میں اچھے ماہر تھے۔ عربی میں بھی کسی قدر دخل تھا۔ خوشنویسی کا بہت شوق تھا۔ ہمیشہ علمی مذاق کا شغل رہتا تھا۔ شاعری کا بہت شوق تھا۔ نثر بھی کبھی کبھی لکھتے تھے۔ عکسی تصویر بنانے کا کام جانتے تھے۔ ٹیلیگراف کا کام بھی جانتے تھے۔ لکھنؤ جنکشن (چارباغ) اسٹیشن پر بعہدہ ٹکٹ کلکٹری ملازم تھے۔ اس اثنا میں اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر کی جگہ پر ہردوار (یا کسی اور جگہ) تبادلہ ہوگیا۔ انہوں نے لکھنؤ کی جدائی منظور نہ کی اور مستعفی ہوگئے۔ عین شباب میں دفعتہً تپ دق میں مبتلا ہوئے۔ ڈھائی تین مہینے علیل رہ کر یکم جون ۱۹۱۰ء بدھ کے دن ساڑھے بارہ بجے دن کو انتقال فرمایا۔ اور کربلائے عظیم اللہ خاں میں دفن ہوئے۔ عمر تخمیناً ۲۴ یا ۲۵ سال کی تھی۔ ان کا کلام اکثر مختلف رسائل میں شائع ہوچکا ہے اپنا کلام جمع کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ اسی وجہ سے بہت زیادہ کلام ضائع ہوگیا۔ چند

غزلیں قلمی موجود ہیں۔ انتخاب کلام درج ذیل ہے۔

گلہ نہ آپ کا شکوہ نہ کچھ زمانے کا
سزا ہے پیار کی بدلہ ہے دل لگانے کا

کبھی کبھی رہے مشقِ ستمگری بھی ضرور
طریقہ بھول نہ جاؤ کہیں ستانے کا

بہانہ ساز، دغا باز، فتنہ گر، عیار
چھٹا ہوا ہے وہ داغ ایک ہی زمانے کا

آیا تھا شب کو دھیان جو بوس و کنار کا
اترا ہوا ہے منہ سحر وصل یار کا

اٹھ اٹھ کے اسکی بزم میں بیٹھا ہزار بار
یارب برا ہو اس دل بے اختیار کا

خاک اس لئے اڑاتے ہیں وہ میری قبر کی
مطلب یہ ہے نشاں بھی مٹا دیں مزار کا

آئینہ لے کے دیکھ لو گر دوسرا نہ ہو
مغرور اپنے حسن پہ اسے مہ لقا نہ ہو

ہیں بے قرار ہو کے جو لپٹا شب وصال
شرما کے بولے دیکھو کوئی دیکھتا نہ ہو

سمجھی تو کھو لئے مرے پہلو میں دل نہیں
دیکھوں تو میں یہ شوخی دزدِ حنا نہ ہو

کہتے ہیں لے کے کیا کروں افسردہ دل ترا
کس کام کا جو شوخ نہ ہو چلبلا نہ ہو

بلبل سمجھ کے کچھ پر پرواز کھولتا
پھیلا ہوا ہے دام بھی گلزار کے قریب

اعجاز ہر ادا نے تمہاری دکھا دیا
کشتہ کیا نگاہ نے لب نے جلا دیا

اقرار میں یہ لطف نہ ملتا کبھی داغ
انکار وصل نے مجھے جیسا مزا دیا

صبح شب وصل آہ نظر تک نہیں ملتی
نیچی ہے نگہ اور وہ شرمائے ہوئے ہیں

تاثیر دکھائی کشش دل نے پس مرگ
سینے سے وہ تربت مری لپٹائے ہوئے ہیں

بڑھ گئی نام خدا ایسی محبت تیری
کہ اب آنکھوں میں پھرا کرتی ہے صورت تیری

وصل میں ہاں ان سے جو لپٹا تو کہا ہنس کے داغ
خیر ہے خیر ہے کیا آئی ہے شامت تیری

مجھ کو اسے چرخ کیوں کیا برباد کیا میں نے آخر ترا کیا کیا تھا

پردے میں ان بتوں کے یہ ہے کون جلوہ گر کس کے نیاز مند ہیں اے بے نیاز ہم

نوحہ گر کچھ یہ نہ جب کوئی ہوا میرے بعد روئی تربت پہ بہت میری قضا میرے بعد

جب یہ سنتا ہوں یار آتا ہے دل کو کچھ کچھ قرار آتا ہے
لاکھ سمجھاؤ پھر نہیں سنتا جب دل بے قرار آتا ہے

شمع روئی نہیں یاد و دو پریشاں نہ رہا اے فلک کون ترے ہاتھ سے نالاں نہ رہا
لیجئے حضرت دل شوق سے چلیے اٹھو غیر محفل سے نکالے گئے درباں نہ رہا
اک زمانے سے یہی عشق میں ہوتا آیا دست وحشت مجھے کیا غم ہو گریباں نہ رہا
تھی جوانی ہی پہ موقوف بتوں کی الفت دل وہی ہے مگر اب دل میں وہ ارماں نہ رہا

پوچھوں گا پردے پردے میں ملگئے اگر تم کو بھی کچھ خبر مرے درد نہاں کی ہے

ہے غم حسین میں یہ اشک باری اسے دریغ
وقف آل حیدر کرار آنکھیں ہو گئیں

افسوس میر شبیر علی ابن میر علی مظفر خاں داروغہ توپخانہ شاگرد میر حسین علی حیران دہلوی۔ افسوس لکھنؤ میں ہمیشہ رہے۔ اور ان کی شاعری کو شہرت نہیں ہوئی۔ مرنے کے بعد نشان قبر بھی نہیں ملتا ہے

اس کی صورت کے تئیں یاد دلا دیتا ہے
بیٹھے بیٹھے مجھے یہ گل تو رلا دیتا ہے

میر اکبر علی اختر پہلے انجم تخلص کرتے تھے مصحفی کے شاگرد تھے۔ ایک زمانے میں مصحفی کا دل شاعری سے ایسا سرد ہو گیا کہ غزل کہنا ایک قلم ترک کر دیا۔ شاگردوں کو جواب دیدیا کہ مجھ سے غزلیں نہیں بنتیں۔ اختر سے بھی یہی کہا مگر اس نے بہت مجبور کیا تو ایک آدھ غزل پر

اصلاح دیکر ٹال دیا۔ شاگرد نے پوچھا پھر میں کس سے اصلاح لوں۔ کہنے لگے جرأت سے
اصلاح لیا کرو۔ آخر جرأت کے پاس غزل لے کر آئے۔ آپ نے نام پوچھا تخلص پوچھا
شاگردی کا حال پوچھا۔ اس نے کہا مصحفی کا شاگرد ہوں۔ انہوں نے شاعری ترک کر دی
ہے۔ آپ کی خدمت میں بغرض اصلاح آیا ہوں۔ اُستاد نے بھیجا ہے۔ فرمانے لگے سنو بھئی
مصحفی میرا دوست ہے۔ میری اس کی مخالفت نہیں ہے میں تم کو اصلاح نہیں دے سکتا
اگر تم ان کی تحریر لاؤ تو مضائقہ نہیں۔ آخر مصحفی نے خط لکھ دیا۔ کہ آپ ان کو اصلاح دیا
کیجئے۔ جب جرأت کے شاگرد ہوئے تو تیس برس کی عمر تھی۔ لکھنؤ میں انتقال کیا خدا
جانے کہاں دفن ہوئے ؎

شمشیر جو کھینچے ہے قاتل اسے کہتے ہیں　　تڑپے ہے جو میرا دل بسمل اسے کہتے ہیں

بقا شیخ بقا اللہ خلف لطف اللہ عشق پہلے تمکین تخلص کرتے تھے۔ شاہ حاتم کے
شاگرد ہوئے کلام اچھا تھا۔ طبیعت شوخ تھی۔ لکھنؤ میں رہے اور یہیں انتقال کیا۔

آستیں حشر کے دن خون سے تر ہووے گی
یہ یقیں جانیو دل سے مرا قاتل ہے وہی

نواب مہربان خاں رند دہلوی جاہل تھے۔ اور تلفظ بھی درست نہ تھا۔ مرزا قتیل کے
ساتھ لکھنؤ رستم نگر میں رہتے تھے۔ لکھنؤ میں انتقال کیا۔ حاجی نصرت کے تکیہ میں دفن ہوئے
مرزا غلام حیدر مجذوب ان کو سودا نے اپنا بیٹا بنایا تھا۔ لکھنؤ میں انتقال کیا۔
منتظر شیخ نور اسلام امروہوی شاگرد رشید مصحفی۔ ان کو استاد نے اپنا شاگرد
رشید مانا ہے۔ اور لکھا ہے فن شعر سے خوب آگاہ ہے۔ لکھنؤ میں انتقال کیا۔ اور
وہیں دفن ہوئے ؎

ہر دم خیال یار جو پیش نظر رہا
ہجراں میں بھی وصال مجھے میسر رہا

شیخ الٰہی بخش معروف شاگرد رشید شاہ نصیر اپنا سن شعور سے لکھنؤ میں
آ گئے۔ شاہ نصیر کے شاگرد رشید تھے۔ بہت اچھا کلام تھا۔ صاحب دیوان تھے لکھنؤ
میں انتقال کیا اور گؤگھاٹ میں مدفون ہوئے۔
اختر غلام اشرف لکھنوی تلمیذ میر حسن دہلوی۔ لکھنؤ میں انتقال کیا۔ نشان

قبر نہیں ملتا۔

ہوئے نصیب جلد کہیں وصل یار کا
احوال بے طرح ہے دل بے قرار کا

اسمیں جن شعرا کا کلام درج ہے انکے کلام کا انتخاب گویا عطر سخن ہے۔ مجھے اس بات کا بہت افسوس ہے کہ بہت سے شعرا کے حالات باوجود بسیار کوشش کے بھی دستیاب نہ ہوسکے۔

فغاں۔ اشرف علی خاں عرف کوکا خاں احمد شاہ بادشاہ دلی کے کوکا تھے۔ اور ندیم دہلوی کے شاگرد تھے۔ لکھنؤ میں آ گئے تھے۔ پھر خدا جانے کس طرف چلے گئے۔ پرانے شاعر تھے۔ زبان بہت اچھی تھی۔ میر و میرزا کے ہمعصر تھے۔

یکرنگ۔ غلام مصطفےٰ نام دہلی کے پرانے شاعر خوشگو میر و مرزا سے بھی پہلے کے شعرا میں خدا جانے کس کے شاگرد تھے۔ شاہ عالم بادشاہ کے دربار میں نوکر تھے۔ لطیفہ گوئی اور حاضر جوابی میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے۔ صاحب دیوان تھے۔ اور اچھا کہتے تھے۔ ایک دفعہ لکھنؤ آ گئے تھے۔ پھر دلی چلے گئے۔

شاکر ناجی۔ دہلی کے پرانے شاعر محقق تھے۔ دلی میں رہے اور وہیں انتقال کیا۔ بہت مشہور شاعر صاحب دیوان تھے۔

افسوس۔ میر شیر علی دہلوی شاگرد رشید سودا بہت مرنج آدمی تھے ابتدائی شاعری ہی سے لکھنؤ میں چلے آئے۔ کسی سے ملتے نہ تھے۔ مشاعروں میں بہت کم شریک ہوتے تھے۔ غزل خوب کہتے تھے۔ مدت العمر لکھنؤ میں رہے۔ اور یہیں انتقال کیا۔ آغا باقر کے امام باڑے میں دفن ہوئے۔ ان کا سنہ وفات ۱۲۲۰ھ ہے۔ دیوان مختصر غیر مطبوعہ دیکھا گیا۔ اولاد کا پتہ نہیں ملتا۔

کسو کے قتل پہ جو کمر اپنی وہ کستا ہے — ہمارا زخم دل بے اختیار اس وقت ہنستا ہے
تجھے مرے لہو کی ہے قسم جلدی سے لا ساغر — گھٹا اٹھی ہے ساقی کوئی دم میں مینہ برستا ہے
طریق کعبہ و بتخانہ ہے کیا حیرت زاہد — میانہ راہ چل ہر دو خدا سے یہ جدا رستا ہے

آپکا خط بھی پہ اس ناز کا اظہار ہے — ایک اپنے سے کہیں ہم سے وہی تکرار ہے
کوتہ اندیشی کا ان دامن دراز و سکا ہے تنگ — ہاتھ کاٹے گئے جو زخم دامن دار ہے

پھر منا لیوینگے اسکے روٹھنے کا ڈر نہیں   گر خفا ہے کیا ہوا موزوں ہمارا یار ہے

ہوتا ہے عشق ظاہر یوں آہ و سدم سے   جیسے نشان لشکر معلوم ہو علم سے

اسی طرح دہلی کے ہزارہا شاعر لکھنؤ کی سرزمین میں سو رہے ہیں جن کی قبر کا بھی پتہ نہیں ہے۔

آبرو نجم الدین عرف شاہ مبارک نبیرہ شیخ محمد غوث گوالیاری بہت خوشگو تھے۔ سراج الدین خان آرزو کے شاگرد تھے۔ آپ ایک چشم تھے۔

ایک شاعر ان کی ملاقات کی غرض سے بہت دور دراز مقام سے آیا۔ غریب بہت کثیف الحال تھا۔ آپ نے کچھ التفات نہ کیا اس نے مسکرا کر کہا شاہ صاحب ہم غریبوں سے بھی تین آنکھ کیجئے۔ اس برجستہ گوئی پر سب ہنس پڑے اور شاہ صاحب نے معذرت چاہی۔ بہت جستجو کی مزار کا پتہ نہ ملا۔ ایک شعر درج ذیل ہے۔

دل تو دیکھ آدم بے باک کا
عشق سے بھرتا ہے پتلہ خاک کا

میر جیون افگار دہلوی۔ آپ نے مناقب بہت لکھے اور آخر وقت میں کربلائے معلی چلے گئے۔ اور روضہ مقدسہ پر قرآن خوانوں میں ملازم ہو گئے۔ لنگر خانے سے خیراتی شلہ کھانے کو ملا۔ خادم روضہ کو خواب میں بشارت ہوئی کہ ہمارے عزیز جیون کو طعام خاص دیا کرو۔ اس معجزے سے میر صاحب کی بہت تکریم کی گئی اور وہیں دفن ہو گئے۔

علی کا سپاہ ایسا تیگا تھا
شب معراج جس کا ٹیکا تھا

حیران میر حیدر علی دہلوی زندگی بھر لکھنؤ میں رہے۔ سروپ سنگھ دیوانہ کے شاگرد تھے۔ حاجی نصرت کے تکیے میں دفن ہو گئے۔

اپنے جانیکا وال دن کو نہ ہے رات کو ڈھب
دیکھئے کیسی بنے آن پڑی بات کا ڈھب

میر جعفر زٹلی دہلوی ہزل گو تھے پہلے رئیسوں کی مدح کرتے تھے جب ان سے کچھ وصول نہ ہوتا تو ہجو لکھتے ہزل گوئی میں بہت مشہور رہے تھے۔ اعظم شاہ کی مدح میں ایک مطلع

کہا تھا۔ جو بہت پسند ہوا۔ اور بیش بہا انعام حاصل کیا سے

نگین سعادت کہ نا شدہ بود

ہمیں اسمِ اعظم بہ دو گشتہ بود

ایک مرتبہ مرزا عبد القادر کی ملاقات کو گئے۔ مرزا اس وقت متفکر تھے۔ آپ نے پوچھا کیا کچھ فکرِ سخن میں ہو کہاں۔ کہنے لگے ہیں ہی سوں کتنے شعر کہے ہیں مرزا نے کہا ایک مصرع اچھا ہے مگر دوسرا مصرع بہم نہ پہنچا وہ مصرع یہ ہے

لالہ در سینہ داغ چوں دارد

آپ کہنے لگے واہ یہ بھی کوئی مشکل بات ہے۔ لکھ لو سے

جو یکے سبز زیر کون دارد

مرزا ہنسنے لگے اور کچھ دے کر ان کو رخصت کر دیا۔ دہلی سے جب آگئے۔ تو فیض آباد میں رہے۔ پھر لکھنؤ میں آصف الدولہ کے عہد میں چلے آئے اور یہیں انتقال کیا۔ نشان قبر نہیں ملتا۔

مقدمۂ کتاب

خواجہ عشرت کا نام علمی دنیا میں تو کسی تعارف کا محتاج نہیں لیکن عام آگاہی کے واسطے میں نے چاہا کہ کچھ واقعات لکھوں جب خواجہ صاحب سے خاندانی حالات دریافت کرنیکا موقع آیا تو آپنے آبدیدہ ہوکر فرمایا مجھے استخوان فروشی ناپسند ہے۔ میں نے عرض کی آپکا فرمانا صحیح ہے کہ خاندانی فضائل بیان کرکے اپنے اعزاز کا خواہاں ہونا ضرور خلاف عقل ہے لیکن اہل جوہر کو اپنے خاندانی جوہر کا اظہار واجبات سے ہے یاقوت ایک ایسا جوہر ہے جو اپنی خوبیوں میں بینظیر ہے۔ مگر جب ایک جوہری اس بات کو ثابت کردیتا ہے کہ یہ رمانی ہے تو نگاہِ مبصر اسکی خوبیوں کو اور اضافہ کردیتی ہے لعل خود نفیس جوہر ہے مگر بدخشانی اضافت اسمیں اور بھی چار چاند لگا دیتی ہے اس نسبت سے اگر کوئی نامی مستند باکمال اپنے نسب کے حالات بیان کرے تو اسکی عالی نسبی اسکے کمال کو اور بھی چمکا دیتی ہے اس لئے فائدہ عام کے واسطے ضرور ہوا کہ شاعر اپنے خاندانی حالات بھی لکھے اگر وہ جوہر علم کے ساتھ جوہر شرافت بھی رکھتا ہے تو اسکے اخلاق بھی وسیع ہونگے اور شرفا کو اُس سے فیض پہونچیگا اور اسکی صحبت حاصل کرنے کے متمنی ہوں گے۔

شکر کا مقام ہے کہ میری استدعا نے زیور قبول پہنا اور مجھے بعض دلچسپ حالات بھی معلوم ہوے خواجہ محمد عبدالرؤف عشرت کے والد ماجد کا نام نامی خواجہ محمد عبدالشکور مرحوم تھا دادا کا نام خواجہ محمد وجیہ الدین پردادا کا نام محمد علی خان بہادر سکڑدادا عبدالشکور خان بہادر نام کیساتھ خان کا لفظ خطابی ہے جو بادشاہ اودہ سے عطا ہوا تھا۔

عبدالشکور خان والی بلخ کے خلف اصغر تھے جب اُنکے والد ماجد کا انتقال ہوگیا تو بھائیوں میں نااتفاقی اور دشمنی پیدا ہوگئی اور ہر شخص سلطنت کا دعویدار ہوگیا۔ قریب تھا کہ ایک بہت بڑا کشت خون ہو خاندان کی بیوفائی سے دل برداشتہ ہوکر آپ سنہ ۱۱۸۰ھ میں اپنے گھر سے بی بی کو ہمراہ لیکر شب کو تنِ تنہا نکل کھڑے ہوے اور سفر کے مصائب جھیلتے ہوے دہلی آئے اسوقت دہلی تباہ ہوچکی تھی شاہ عالم بادشاہ قید ہوچکے تھے وہاں سے فیض آباد آئے نواب شجاع الدولہ بہادر سے ملے نذر پیش کی نواب شجاع الدولہ بہادر نے انکی بہت عزت کی اور انکو قلعہ داری الہ آباد کا خلعت

مرحمت ہوا اور خطاب خان بہادر کا عطا ہوا آٹھ برس کے بعد ۱۱۸۸ھ مین نواب شجاع الدولہ بہادر نے انتقال فرمایا اور نواب آصف الدولہ بہادر مسند نشین صوبہ اودھ ہوئے اور لکھنؤ کی آبادی زیادہ ہونے لگی اسوقت عبد الشکور خان بہادر الہ آباد کے قلعہ دار تھے اور مع اہل و عیال وہین سکونت رکھتے تھے چنانچہ وہان ایک خضری دروازہ انھین کا بنوایا ہوا ہے اور ایک بہت بڑا بازار اپنے بیٹے محمد علی خان کے نام سے بنوایا ۱۱۹۰ھ مین انکا انتقال ہوگیا۔ اور الہ آباد قلعہ مین شہ نشین کے وسط مین مدفون ہوے۔ اور نواب آصف الدولہ بہادر کے حکم سے اُنکے بیٹے اُنکی جگہ پر قلعہ دار مقرر ہوئے ۱۲۱۲ھ مین جب نواب آصف الدولہ بہادر کا انتقال ہوگیا اور اُنکے بیٹے وزیر علی خان مسند نشین ہوئے اور بعد چندے وہ بھی سلطنت سے معزول ہوکر کلکتہ بھیجدیئے گئے تو گورنمنٹ نے نواب سعادت علیخان بہادر سے سلطنت اودہ کے بارے مین ایک نیا معاہدہ کیا اور اُسمین قلعہ الہ آباد کے تخلیہ کا بھی فیصلہ ہوگیا ہے اور گورنمنٹ نے نواب سعادت علی خان سے اس امر کا ایک حکم نامہ لکھوا کر محمد علی خان کے پاس بھجوا دیا کہ تم قلعہ الہ آباد کو بجنسہ گورنمنٹ انگریزی کے حوالہ کرکے فورًا ہمارے پاس چلے آؤ محمد علی خان نے جدید بادشاہ کے حکم کی تعمیل کی اور قلعہ مین اپنا اسباب اور شاہی اسلحہ و دیگر اسباب اور اپنے مکانات چھوڑکر اپنے خاندان کو ہمراہ لیکر بادشاہ کے حضور مین حاضر ہوے۔ اُنکا خیال تھا کہ تخلیہ عارضی کسی بدگمانی کی وجہ سے ہوا ہے انکا تصفیہ بادشاہ سے رودررو ہوجائیگا نواب سعادت علی خان کو یہ بات معلوم ہوئی کہ میرے بارے مین نواب بہو بیگم صاحبہ گورنمنٹ سے تصفیہ کرچکی تھین اب اگر مین گورنمنٹ سے کوئی نیا معاہدہ نہ بھی کرتا اور الہ آباد کا قلعہ وغیرہ نہ دیتا جب بھی سلطنت مجھے ملتی تو انکو اسکا بہت افسوس ہوا اور محمد علی خان صاحب کی طرف متوجہ نہوئے یہ خود نازک مزاج تھے لکھنؤ محلہ احاطۂ خانساماں مین سکونت اختیار کی اور خانہ نشین ہوگئے گورنر جنرل نے کلکتہ سے لکھا کہ تم یہان چلے آؤ تین سو روپیہ ماہواری پنشن مقرر کی جاتی ہے مگر اُن کی والدہ نے اس مفارقت کو منظور نہ کیا ناچار اپنے بہنوئی کے نام پنشن دلوادی وہ کلکتہ مین اسی پنشن سے اپنی بسر اوقات کرتے رہے الہ آباد کے بازار اور عمارات پر کسی غیر آدمی نے محمد علی خان کا وارث بنکر قبضہ کرلیا مگر محمد علی خان نے اپنی زندگی نہایت عیش و عشرت سے لکھنؤ مین بسر کرتے رہے تھے اور انکے پاس بہت دولت تھی مرغ بازی کا بہت شوق تھا۔

اودہ مین آکر اُنھون نے اپنے لڑکون کی شادی اہل کشامرہ مین کی اور نواب ظہیر الدولہ بہادر

وزیر اودھ سے قرابت کا سلسلہ قائم ہوا

عبدالشکور خان اور محمد علی خان دونون علاوہ علوم کے عامل تھے اور مشہور ہے کہ اُن کے پاس جن تحصیل علوم کو آتے تھے۔

خواجہ صاحب کے نانا مولوی عطا حسین عرف مولوی گدائی صاحب فارسی کے بے مثل استاد تھے اور انکے پرنانا عبداللہ خان صاحب لاہور کے سفیر تھے اور وہان انکی عمارات عالیہ اور مکانات تھے بعد انتقال کے کوئی لاہور نہ گیا اس سبب سے وہ املاک تلف ہوگئی۔ مولوی عطا حسین صاحب بادشاہ کے یہان بیت الانشا مین منشی تھے۔

دادا وجیہہ الدین بھی بہت اچھے خوشنویس تھے شاہی مین اپنے گھر کی دولت صرف کردی تھی آپ کے والد ماجد آخری بادشاہ کے عہد مین آغاز جوانی مین سولہ برس کے سن مین نواب گنج ضلع گونڈہ کے تھانہ دار ہوگئے تھے۔ مگر کچھ دن کے بعد غدر کا سامان ہوگیا اور اُنکے مکان کا تمام مال و متاع لوٹ لیا گیا غدر کے دس برس کے بعد ١٨٦٦ء مین آپکے والد خواجہ عبدالشکور صاحب نے شادی کی اور ١٨٦٨ء یوم دوشنبہ ماہ ربیع الاول کی چھٹی تاریخ صبح صادق کے وقت خواجہ صاحب پیدا ہوئے

تعلیم

ابتدائی تعلیم آپکی مولوی امید علی صاحب قدوائی سے شروع ہوئی اور قرآن شریف کریما مامقیما تک انسے پڑھی مولوی صاحب صبح دس بجے سے مکان پر آتے تھے اور چار بجے تک پڑھاتے تھے۔

اسکے بعد آپکے ماموں مولوی مہدی حسن صاحب جو فارسی کے مشہور استاد تھے آپکو تعلیم دینے لگے اور انکے فیض صحبت سے آپکو فارسی مین بہت جلد مہارت ہوگئی جب مولوی صاحب کا انتقال ہوگیا تو بعض کتابین آپنے ابو الحسنات حاجی حافظ خواجہ قطب الدین احمد صاحب مالک مطبع نامی سے پڑھین اور مولوی فتح محمد صاحب لکھنوی اور مولوی فریاد حسین صاحب مرادآبادی سے عربی کی صرف نحو کی چند کتابین ختم کرکے شرح جامی شروع کی تھی آپکے والد کی صحت اچھی نہ رہتی تھی اسلئے گھر کے کامون کا بار آپکے ذمہ آپڑا اور تعلیم کا سلسلہ موقوف ہوگیا لیکن اسوقت تک آپ فارسی کی درسی تہائی کتابین مختلف اُستادون سے پڑھکر درہ نادرہ تک ختم کر چکے تھے عربی مین کافی دستگاہ حاصل نہوئی۔

اُسی زمانے مین آپکو شاعری کا شوق ہوا سب سے زیادہ مسن شاعر شیخ محمد جان شاد پیرو میر تھے آپ اُنکی خدمت مین حاضر ہوئے اُنھون نے حدائق البلاغت اور رسالہ قافیہ ملا قاسم گنابادی پڑھایا اور انکے متروکات سمجھائے اور میر تقی میر دہلوی کے قواعد اصول اردو ذہن نشین کئے اور اسکے بعد غزل گوئی کی اجازت دی ابھی سال بھر اس مشق کو نہ ہوا تھا کہ پیرو میر زیارت کربلائے معلے

کو ہمراہ راجہ امیر حسن خان والی محمود آباد جانے لگے تو آپ سے پوچھا میں آپکی عدم موجودگی میں کس سے صلاح لوں فرمایا تمکو احتیاج اصلاح نہیں ہے تم خود اسقدر اتنا خیال رہے کہ شعر بامعانی بامحاورہ کہا کرو اور زمانے کی موجودہ روشنی کی تقلید نہ کرنا سال بھر کے بعد زیارت سے واپس آئے تو بھی کلام پر اصلاح بہت کم دیتے تھے خواجہ صاحب کہتے ہیں کہ مجھے استاد نے کبھی ایک مصرعہ پورا اصلاح میں نہیں دیا اور زبان اُردو کا لغت لکھنے کی ہدایت کی۔

مطالعہ کتب مطالعہ کتب کا آپکو بہت شوق ہے۔ فارسی میں دیوان حافظ جامی خسرو صائب خاقانی شوکت بخاری طالب آملی مخلص کاشی کے دیوان آپنے بار بار مطالعہ کئے۔

تاریخ ہندوستان کی اکثر تاریخیں آپکے مطالعہ میں رہیں۔

اردو نثر مرزا رجب علی بیگ کی نثر آپکو بہت پسند ہے مولانا شبلی کی نثر بھی پسند ہے غالب اور شمس العلما نذیر احمد اور سرسید کی تالیف بھی زیر نظر رہی۔

نظم آپکو میر تقی میر کے کلام سے عشق ہے۔ اُنکے بعد مرزا تقی ہوس کا کلام بہت پسند ہے اور اُنکی شاعری کے دلدادہ ہیں سودا اور غالب کے کلام کا بعض حصہ مطبوع خاطر ہے آتش صبا خلیل ناسخ برق رشک کا کلام بھی مطالع میں رہتا ہے امیر داغ جلال کے کلام کو آپ پسند کرتے ہیں اور محاورے کی سند میں جلال کو زیادہ مستند مانتے ہیں۔

قصائد قصیدے میں سودا اور حسرت کو استاد اول مانتے ہیں منیر کے قصیدے زیادہ پسند ہیں۔

مراثی مرثیوں میں میر انیس میر وحید اور مرزا دبیر کی تصنیف کو پسند کرتے ہیں

شاعری شاعری میں میر کے رنگ کی تقلید کرتے ہیں اور فرماتے ہیں اردو میں رعایت لفظی کی بھرمار کرنا اضافتوں کا زیادہ لانا فارسی تراکیب سے استعارات بعیدہ غزل میں لانا مجھے پسند نہیں شعر صاف ہو سلجھا ہوا ہو معنوی پہلو کمزور نہوں دل پر اثر کرتا ہو با محاورہ ہو۔

دیوان آپکا مرتب ہوچکا ہے۔ تاریخیں کم کہیں رباعیاں بھی کم لکھیں مخمس دو چار لکھے قصیدے کم کہے مسدس دو ایک لکھے قطعات اکثر کہے نیچرل نظموں میں ایشیائی شاعری کی نزاکتیں پیدا کیں مرزا ہمایوں بخت جگر مرحوم کے مشاعروں میں اکثر شریک ہو لئے اور اب مشاعروں کی شرکت اور غزل گوئی قطعاً ترک کردی ہے جونپور میں ایک مشاعرہ حفیظ جونپوری نے محلہ سپاہ میں بہت شاندار کیا تھا اسمیں آپ شریک ہوئے شہزادہ مرزا قیصر بخت فروغ نے بیحد تعریف کی اور اپنے دولت کدہ پر بلکے کلام سنا اور سنایا۔

ادبی صحبت مولانا شبلی جناب جلال لکھنوی جناب تسلیم لکھنوی جناب شمشاد لکھنوی منشی سجاد حسین سے اکثر ملاقات کا موقع ملتا رہتا تھا۔ جناب ریاض مولانا شرر جناب انجم جناب فصاحت جناب افضل حکیم کوثر بریلوی مرزا محمد ہادی جناب کلیم جناب قمر وغیرہ سے زیادہ اتفاق ملاقات رہتا ہے

مشاغل آپکو شاعری کے ساتھ ساتھ نثاری کا بھی شوق پیدا ہوا اسسبب سے پہلے آپنے کتبخانہ جمع کیا جس میں صدہا دیوان فارسی قلمی اور صدہا اردو قلمی موجود تھے اسکے علاوہ واسطے ہوشیاری جدید و قدیم کی اکثر کتابیں تھیں۔

آغاز شاعری میں آپنے لغت لکھنے کی بنیاد ڈالی محاورات کا لغت مع امثلہ جمع کیا دوسرا حصہ افعال مفرد کا لکھا تیسرا حصہ افعال مرکب کا چوتھا حصہ مصادر مفردہ کا پانچواں حصہ مصادر مرکبہ کا چھٹا حصہ مفرد الفاظ اسما کا ساتواں حصہ اسماے صفات کا آٹھواں حصہ حروف روابط کا نواں حصہ محاورات بیگمات کا لکھا لغات کی تصنیف کے درمیان میں ایک کتاب متروکات الفاظ و محاورات کی اصلاح زبان اُردو کے نام سے لکھی اور دوسری کتاب قواعد صرف ونحو میں زبان دانی کے نام سے لکھی وہ طبع ہوکر اسقدر مقبول ہوئیں کہ پہلا اڈیشن دونوں کتابوں کا آٹھ مہینے میں ختم ہوگیا اس درمیان میں لکھنؤ میں شدت کی بارش ہوئی یا یوں کہیے کہ طوفان عظیم آیا جسمیں ہزارہا مکانات منہدم ہوگئے آپکے کتبخانے کا مکان گر گیا اور تمام تصنیف شدہ لغت کی جلدیں مع کمیاب کتبخانے کے ضائع ہوگئیں جسکا آپکو سخت رنج ہوا لیکن کسی سے ذکر نہیں کیا اور پھر تصنیف و تالیف میں مشغول ہوگئے اسی زمانے میں لکھنؤ کے مستند مشاہیر شعرا کی سعی سے لکھنؤ میں تحفظ زبان اردو کی غرض سے انجمن اصلاح سخن قائم ہوئی اسکے آپ سیکریٹری مقرر ہوئے آپکے مضامین سے شاید ہندوستان کا کوئی رسالہ یا اخبار خالی رہتا ہو تو رہتا ہو تاریخ اودھ کے بیشمار مضمون لکھے اُردو زبان کے تحفظ میں پر زور مضامین سب سے زیادہ آپنے لکھے اور اسی کوشش کا یہ اثر ہے کہ حیدرآباد میں عثمانیہ اُردو یونیورسٹی قائم ہوگئی اور ہندوستان میں مختلف انجمنیں اُردو کی حفاظت میں قائم ہوئیں باوجود افکار معاش اور تفکرات دنیاوی کے آپ اردو کی خدمت میں اسیطرح سرگرم ہیں جسطرح کوئی دنیادار فکر روزی میں مبتلا ہوتا ہے۔ اسوقت بھی روزانہ کچھ نہ کچھ تالیف و تصنیف کا سلسلہ جاری رہتا ہے اُردو کی بیشمار مستند صرفی و نحوی قاعدے آپکے اختراع کیے ہیں دعا ہے کہ خداوند کریم آپکی عمر میں ترقی دے اور دلی مقاصد میں کامیاب کرے کتاب خمخانۂ عشرت آپکی اُن نیچرل نظموں کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً آپنے تحریر فرمائی ہیں مجھے امید ہے کہ یہ کتاب بھی آپکی جملہ تصانیف کی طرح مقبول عام ہوگی اور اہل نظر اسے آنکھوں سے لگائینگے فقط

احقر قیصر لکھنوی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خمخانۂ عشرت

کوئے یار

اے کوئے یار تیرا کیا راستہ کٹھن ہے
ہر ہر قدم پہ جسمیں اک ایک راہزن ہے

دشمن رقیب اپنے بد ہیں نصیب اپنے
کانٹے بھرے ہیں جسمیں ایسا یہ اک چمن ہے

بلبل کو شاخ گل پر آتا ہے چین لیکن
گلچیں کو دشمنی ہے صیاد کو جلن ہے

دونوں اسی ہوس میں کیا کیا بھٹک رہے ہیں
دیر و حرم کے اندر زاہد ہے برہمن ہے

ہر ایک جا پہ تیری طرفہ بہار دیکھی
بلبل کا تو چمن ہے آہو کا تو ختن ہے

آوارگی یہاں تک پرواز کر چکی ہے
غربت نصیب والے صدقے کیا وطن ہے

پایا نہ ہمنے لیکن خوش فکر کوئی تجھ میں
جو ہے وہ سینہ زن ہے جو ہے وہ نعرہ زن ہے

اک بھیڑ سی لگی ہے اس میکدہ کے در پر
ساقی وہی پرانا ہے بھی وہی کہن ہے

کوئے صنم کا نقشہ پاتے ہیں ہر جگہ ہم
کہتے ہیں جسکو جنت حوروں کی انجمن ہے

دل کہہ رہا ہے بیدل تجکو اسی گلی میں
رونق فزا جہاں پر وہ غیرت چمن ہے

اس کے بغیر کیونکر دل کو قرار آئے
پروانہ ہوں میں گویا وہ شمع انجمن ہے

موسیٰ سے بات کی ہو کیونکر یقین آئے
مشہور تو جہاں میں معشوق کم سخن ہے

اے کاش اُس گلی میں تربت بنائے کوئی
جس سرزمیں کی مٹی میرے لیے کفن ہے

اے کوئے یار تجھمیں کیوں پیچ ہیں ہزار دل
ہے پھیر راستہ کا یا زلف کی شکن ہے

اے قوم کے جوانوں اب خواب سے تو چونکو
گر آگئی ہمتوں کا کچھ خون جوش زن ہے

ہمت اگر ہو کوئے مقصود دور کیا ہے
غربت کی شب میں دیکھو تاباں رخ وطن ہے

مشکل نہیں ہے کوئی آسان جو نہ ہوئے
دو روز کی ہے زحمت دو روز کا محن ہے

نزدیک کوئے جاناں پاؤ نہیں اپنے طاقت
افسوس غیر ہم پر اُس پر بھی طعنہ زن ہے

ہمت مدد کرے کچھ غیرت دکھائے آنکھیں
گو کاہلی گلے میں باندھے ہوئے رسن ہے

یاد ایام بہار

راحت افزائے جگر ہے آمدِ فصلِ بہار
دستِ شبنم کر رہا ہے روئے گل پر آبشار

ہے نسیم صبح میں اعجاز عیسیٰ کا اثر
صحت جسمی اُڑا لائی ہے اپنا راہوار

گلعذاران چمن کی گشت وہ رشک بہشت
توبہ زاہد کی دکھاتی ہے جسے روئے فرار

کشت غم کو ابر رحمت نے کیا بالکل تباہ
طفل غنچہ خواب راحت سے ہوا ہے ہوشیار

لالہ و گل کی یہ کثرت ہے کہ صحن باغ میں
گل کے سینہ پر قدم رکھکر صبا پاتی ہے بار

نو عروس باغ نے پہنا لباس سرخ ہے
ناچتے ہیں مور بلبل گا رہے ہیں سب ملار

کالی کالی وردیاں پہنے ہوئے بادل اُٹھے
حبشیوں کی فوج یا جاتی ہے سوئے کوہسار

کھیت کی مینڈوں پہ کیا بشاش بیٹھے ہیں کسان
سبز مخمل کا بچھونا دیکھتے ہیں بار بار

کہتے ہیں آپس میں پھر چلنے لگی پُروا ہوا
وہ برستے آتے ہیں بادل دھڑ ادھڑ ہوشیار

ٹھنڈی ٹھنڈی وہ ہوائیں جو جگر کے پار ہوں
ننھی ننھی بوندیاں سلکِ گہر جن پر نثار

سبزۂ خودرو ہے یا تخت زمرد ہے بچھا
آگ جنگل میں لگی ہے یا کھلا ہے لالہ زار

ہے دماغ جاں کو فرحت بخش پھولوں کی مہک
خود بخود یا کھلگیا ہے نافہ مشک تتار

ساقی و میخانہ یاد آتا ہے ایسے وقت میں
اچھے اچھے متقی ہو جاتے ہیں بے اختیار

ہے ادھر بیلا مہکتا اسطرف جوہی کھلی
اک پیڑی سو رہے ہیں ہے اک پیڑی سے پیسار

چھائی ہے کالی گھٹا کیسی اندھیری رات ہے
بجلیاں چمکیں کبھی جگنو نے دکھلائی بہار

گرتے ہیں غنچوں سے یہ شبنم کے قطرے صبحدم
یا ہیں یزدانِ عالم رو رہے ہیں زار زار

یہ کسی معشوق کا جوبن ہے گدرایا ہوا
کچے پکے چھوٹے چھوٹے یا لٹکتے ہیں انار

یتیم بچوں کی عیدی

در در پہ کھا رہے ہیں ٹھوکر یتیم بچے
آوارہ پھر رہے ہیں گھر گھر یتیم بچے

روٹی نہیں میسر کپڑا نہیں بدن پہ
زندہ رہیں جہاں میں کیونکر یتیم بچے

ماں ہے غریب بیکس پردہ نشین عفت
کیا باندھیں پیٹ پر اب پتھر یتیم بچے

عادت گداگری کی پڑ جائے گی جو انکو
ہو جائینگے بھکاری بڑھ کر یتیم بچے

فاقہ کشی سے عاجز ہوتے ہیں جب نہایت
بنجاتے ہیں مسیحی اکثر یتیم بچے

ہندوستان میں بالکل ہمدردیاں نہیں ہیں
بے زر ہے قوم ساری بے پر یتیم بچے

ہر ایک کی نظر میں خوار و ذلیل یہ ہیں
مثل سرشک غم ہیں ابتر یتیم بچے

مذہب نے کی ہے ہمکو تاکید شد و مد سے
بچوں سے ہیں تمہارے بہتر یتیم بچے

انکا نہ دل دکھاؤ بے باپ کے ہیں بچے
ایسا نہ ہو کہ کوسیں رو کر یتیم بچے

ہلتا ہے عرش اعظم روتے ہیں جس گھڑی یہ
چرخ مراد کے ہیں اختر یتیم بچے

کچھ مدرسے بناؤ جسمیں یہ پرورش ہوں
پھرتے ہیں مارے مارے دربدر یتیم بچے

امیدیں ہیں بہت سی وابستہ انکے دم سے
ہیں درج آرزو کے گوہر یتیم بچے

وہ خود غریب بیکس فاقے سے مر رہی ہے
پھر پرورش کرے کیا مادر یتیم بچے

پیدا کریں کسی کو اسوقت رو رہے ہیں
دل میں چبھو رہے ہیں نشتر یتیم بچے

[illegible] ہیں انکے دم سے [illegible] کے فوائد
ہیں ان آفتوں سے مضطر یتیم بچے

[illegible]
[illegible] ہیں سب سر یتیم بچے

افسوس ایسی زندگی پہ [illegible]
[illegible] اکثر یتیم بچے

بیوائیں رو رہی ہیں شوہر کو یاد کر کے
اور کچھ بلک رہے ہیں گھر گھر یتیم بچے

یہ جان دینے والے اسلام پر مٹے ہیں
یوں ہو رہے ہیں اُن کے ابتر یتیم بچے

دینی حمایتوں میں سر بیچ کر لڑے ہیں
اب چھوڑ کر گئے ہیں تم پر یتیم بچے

یعنے وہ جانتے تھے جتنے ہیں کلمہ گو سب
خود پرورش کریں گے آ کر یتیم بچے

ہم دین پر مٹے ہیں وہ ہمپہ جان دینگے
ہم ہوں نہوں رہیں گے خوشتر یتیم بچے

دنیا میں اہل ایماں اسوقت ہیں کروروں
کیا وہ نہ پال لیں گے مل کر یتیم بچے

دست کرم بڑھا کر ان کو سنبھال لو تم
دہشت سے کانپتے ہیں تھر تھر یتیم بچے

بیوہ غریب بیکس بھوکی پڑی ہوئی ہے
کچھ چھوڑ کر گیا ہے شوہر یتیم بچے

آنکھوں کی روشنی تھے ماں باپ کی جو کل تک
وہ آج کھا رہے ہیں ٹھوکر یتیم بچے

لو رو رہے ہیں انکو اب گود میں اُٹھا لو
برسا رہے ہیں دیکھو گوہر یتیم بچے

سب عید کی خوشی میں اترا رہے ہیں کیا کیا
مایوس ہو رہے ہیں بے زر یتیم بچے

بچوں کا اپنے صدقہ عیدی کچھ اُن کو دیدو
منھ تک رہے ہیں ہے ہے لاغر یتیم بچے

ناظورہ امید

دل رُبا یا نہ ہے امید اشارا تیرا
کام آتا ہے ہر اک وقت سہارا تیرا

سچ یہ ہے جانب دنیا بھی ہمیں تو لائی
باغ ہستی کی ہوا تیرے کرم سے کھائی

کوئی لالچ تھا کہ ہم کنج عدم سے چلکر
آئے اس دھر میں تفریح کو بے زاد سفر

شوق دیدار ادھر حسن پرستی کا مزا
یک بہ یک عالم عنصر میں ہمیں لے آیا

اب یہاں سے ہمیں حوروں کی خیالی صورت
کھینچ لیجائے گی اک روز میان جنت

باغ جنت کے وہ حالات سنائے تو نے
شوق فردوس کے کچھ ایسے دلائے تو نے

قصد کرتے ہیں کہ اک روز وہاں بھی جائیں
ہے ارادہ کہ وہ گلشن بھی ذرا دیکھ آئیں

توہی افسردہ دلوں کو ہے ہنسانے والی
عیش مایوسوں کیں کام ہے آنے والی

وحشت وہ دشت نظر ٹھوکریں کھاتی ہو جہاں — تو معاون ہوئی غربت زدہ مفلس کی وہاں
تیرے وہ عزم ہیں آتا نہیں کچھ جسمیں خلل — تیری امداد سے طے ہوتے ہیں سب دشت وجبل
دامن ہمت الجھ جائے وہ خارستاں ہے — ساتھ اس دشت میں تو صورت جسم وجاں ہے

کوئی جیتا ہے تو امید اسے ہے اتنی — وصل اک وعدہ فراموش سے حاصل ہو کبھی
یعنی معشوقہ ہر اک دل کی ہے تو اے امید — تیرے ہی نام کے سب مرتے ہیں زندہ جاوید
نامرادوں سے کیا کار مسیحا تو نے — حسرت مردہ کو سینے میں جلایا تو نے
ڈگمگاتے ہوئے پاؤں کا سہارا تو ہے — اونچی چوٹی پہ چڑھانے کا اک آلا تو ہے
بے ترے عیش وطن ہمکو ہے مشکل جینا — شام غربت میں ترے دم سے ہے کھانا پینا
بستر مرگ پہ بے حس جو پڑے ہیں مطلق — تیرے ہی نام سے چہرے پہ ہے انکے رونق
ہجر کی شب کی گھٹا ٹوپ بھیانک صورت — دم قدم سے ترے ہو جاتی ہی فوراً چھپت
تو جو اک بیوہ کو تسکین دیا کرتی ہے — ننھے سے بچے کو وہ پال لیا کرتی ہے
ضعفا ایسے کہ وارث نہیں جنکا کوئی — ان غریبوں کی تو ہی کرتی ہی کچھ دلجوئی
کامیابی کا ستارا ہے بہت دور مگر — چشم امید سے دیکھو تو ہے نزدیک نظر
ساری دنیا سے ترقی کی عمارت ہے بلند — کام دیتی ہے وہاں صرف تیری ایک کمند
تو ہی ہر رنج میں مونس ہے الم میں ہے رفیق — تو ہی افلاس میں ہے دوست مصیبت میں شفیق

کونسا کام تھا جس میں نہ مدد کی تو نے
جو بلا آئی زمانے میں وہ رد کی تو نے

قصیدہ

عید میں آج عید آئی ہے — یہ مسرت مزید آئی ہے
خوشی کی کلید آئی ہے — ساعت نو سعید آئی ہے
ہے یہ ہنگام گرم جوشی کا
جشن ہے شہ کی تاجپوشی کا

لو وہ انگلینڈ سے جہاز چلا — نام اقدس مدینے سے ترکیں کا
باب مندب پہ جس گھڑی پہنچا — ترکیوں نے سلام کر کے کہا
ہے یہ ہنگام گرم جوشی کا
جشن ہے شہ کی تاجپوشی کا

رونما ہے سعید کا بندر — آئے خدمت میں اہلی کچہر
مصریوں نے کہا یہ خوش ہو کر — زندہ باشید قیصرہ قیصر
ہے یہ ہنگام گرم جوشی کا
جشن ہے شہ کی تاجپوشی کا

ہر طرح کی جہاز میں ہے بہار — تار برقی ہوا کی ہے تیار
روز خبر و نکے ہوتے ہیں انبار — روز چھپتا ہے اک نیا اخبار
ہے یہ ہنگام گرم جوشی کا
جشن ہے شہ کی تاجپوشی کا

اب عدن میں جہاز آ پہونچا — پیشوائی کو جمع ہیں اُمرا
عربی گیت بینڈ میں وہ بجا — ہے شمالی زبان کا گانا
ہے یہ ہنگام گرم جوشی کا
جشن ہے شہ کی تاجپوشی کا

بمبئی تک بخیریت آئے — حق تعالےٰ نے دن یہ دکھلائے
خیر مقدم کو کیوں نہ دل جائے — سب نے مقصود اپنے بھر پائے
ہے یہ ہنگام گرم جوشی کا
جشن ہے شہ کی تاجپوشی کا

فخر دہلی کو یہ ہوا حاصل — ہند کا بادشہ ہوا داخل
عید میں عید یہ ہوئی شامل — بڑھ گئے خیر خواہ ہونگے اب دل
ہے یہ ہنگام گرم جوشی کا
جشن ہے شہ کی تاجپوشی کا

مغربی بادشاہ کا آنا — اہل مشرق میں جشن فرمانا

دعوتیں دیکے سب کو بلوانا اس کرم کا ہر اک ہے دیوانا
ہے یہ ہنگام گرم جوشی کا
جشن ہے شہ کی تاجپوشی کا
اس ادا کا ہر ایک شیدا ہی شاہ سے خوش بہت رعایا ہی
خلق یہ حاکموں میں عنقا ہی ایسی باتوں کا ہند جویا ہے
ہے یہ ہنگام گرم جوشی کا
جشن ہے شہ کی تاجپوشی کا
شاہ نے آکے سرفراز کیا دل رعیت کا خوب شاد ہوا
اب یہاں جوبلی کا ہو جلسا دل کا یہ مدعا بھی ہو پورا
ہے یہ ہنگام گرم جوشی کا
جشن ہے شہ کی تاجپوشی کا
شاہ کیسا رعایا پرور ہے عدل گستر ہے داد گستر ہے
اوج پر ہندیوں کا اختر ہے آج عشرت نوید گھر گھر ہے
ہے یہ ہنگام گرم جوشی کا
جشن ہے شہ کی تاجپوشی کا

دنیاوی کایا پلٹ

غور سے ڈالو اگر اجزاے دنیا پر نظر تو بہت تبدیلی اور کایا پلٹ ہے بیشمار
دیکھئے جس چیز کو اُس میں تغیر ہے شریک ہے تلون پر ہر اک ایجاد کا دار و مدار
ایسی شے کم ہے کہ جو آغاز سے انجام تک ایک ہی شکل و شمائل پر رہی ہو برقرار
آدمی کی انتہا و ابتدا کو دیکھئے اول اول ایک بچہ نا سمجھ تھا شیر خوار
اور حرکت بھی نہ دیسکتا تھا اعضا کو ذرا ہر گھڑی رہتا تھا اپنی ماں کی گودی میں سوار
پھر تو کچھ کچھ ہاتھ پاؤں بھی نکالے اسقدر گھٹنیوں چلنے لگا نا فہم تھا جو شیر خوار
مقتضائے سن سے اعضا نے بھی کی نشو و نما آگئی اس باغ میں آخر جوانی کی بہار

خود جو تھے محتاج وہ ہیں دوسروں کے دستگیر
جو کہ تھے مجبور پہلے اب ہوئے با اختیار

دو قدم جو چل نہ سکتے تھے وہی ہیں پہلوان
گرتے تھے جو دو قدم چلکر وہی ہیں شہسوار

تیسرا دور اور بھی اس کے مخالف آگیا
آکے پیری نے جوانوں کو کیا زار و نزار

بازوؤں میں کچھ رہی طاقت نہ پاؤں میں سکت
رعشہ اعضائے بدن میں ڈالتا ہے انتشار

جسنے دیکھا ہے جوانی میں انہیں با کر و فر
دیکھکر یہ شکل رو دیتا ہے وہ بے اختیار

اُس وسیع اور پُر فضا جنگل پہ ڈالو اب نظر
جسمیں جز خودرو درختوں کے نہیں کچھ زینہار

جھاڑیاں جھنکاڑیاں ٹھنڈی ہوا ٹیسو کے پھول
قدرتی خودرو نباتات اور نخل سایہ دار

لیکن اُس کی اگلی اور پچھلی اگر تاریخ پر
کچھ نظر ڈالو تو ہو جائیں تغیر آشکار

ہو چلے ہیں اسکے بھی کتنے زمانے دہر میں
اک عمارت تھی کبھی اک قلعہ تھا یہ پائدار

آج یہ جنگل ہے کل تھا باغ پہلے تھا کچھ اور
پھر خزاں کا دور آیا پھر ہوئی داخل بہار

ہے سحر کا وقت پھولی ہے شفق افلاک پر
دوسری جانب سفیدی ہو رہی ہے آشکار

کسقدر اٹکھیلیوں کی چال چلتی ہے نسیم
آشیانوں میں چمن کے نغمہ آرا ہے ہزار

کیا نگاہوں میں کھپی جاتی ہے سبزے کی لہک
اور پھولوں کی مہک سے ہوگیا دل بے قرار

یکایک حدت مہر منور نے تمام
دے دیا باد سموم دہر کو سب اختیار

اُن عمارات لطیفہ پر ذرا ڈالو نظر
دستبرد دہر سے جو ہو گئیں زار و نزار

ایک دن وہ تھا کہ اس املاک عالیشان کو
خوشنمائی دلکشی نے کر دیا تھا پائدار

ایکدن یہ ہے کہ اس کہنہ محل کی اینٹ اینٹ
اپنے صناعوں کی حالت پر ہوئی ہے اشکبار

جس مکاں میں گرم رہتی تھیں ہمیشہ صحبتیں
مرجع خلق خدا جو آستاں تھا آشکار

آج اس قابل نہیں وہ سر زمیں افسوس ہے
اک گھڑی کا ماندہ مسافر دم کے دم پائے قرار

کل جہاں پر تھے حسینانِ جہاں کے قہقہے
آج اُلّو بولتا ہے اُس محل پر بار بار

ہائے وہ نازک قمر طلعت حسیں کیا ہو گئے
کیسے کیسے نازنیں ہیں زیب افزائے مزار

دور کیوں جاؤ اسی ہندوستاں کو دیکھ لو
گزرے ہیں عہد سلف میں کیسے کیسے ذی وقار

آج دنیا میں کہیں نام و نشاں باقی نہیں
فاتحان تیغ زن ہیں اور نہ انکے جاں نثار
ہو بجئے نیچر کے ان تازہ کرشموں پر فدا
کیسی کیسی صورتیں بن بنکے بگڑیں بار بار

کرشمۂ انتظار

معشوق کے کرشمے ہیں سب انتظار میں
لیتا ہے چٹکیاں یہ دل بے قرار میں

لیکن خدا کرے نہ یہ چسکا کسی کو ہو
ایسی تو آرزو نہ کسی آدمی کو ہو

وہ دشت وہ جبل جنھیں انسان دیکھ لے
تو ڈر سے اسکے پست ہوں سب لکے چھوٹے

کوئی سرا وہاں ہے نہ منزل کا نام ہے
صحرائے ہولناک خطر کا مقام ہے

آباد یہ ہیں سب انہیں آوارہ گرد سے
نکلے جو انتظار کے دشت نبرد سے

وہ پرخطر پہاڑ کی دشوار گھاٹیاں
منطق کی طرح جسمیں نظر آئیں گتھیاں

ان میں وہی تو ٹھوکریں کھاتے ہیں بار بار
جنکی کمر کو کس کے اٹھاتا ہے انتظار

صحرا میں ریگ کے ہیں جو ٹیلے کھڑے ہوئے
دام فریب و آز ہیں گویا بچھا رہے

جاسوس انتظار کا ہے اک لگا ہوا
جو انکو کھینچ کھینچ کے ہے انہیں لا رہا

وہ خار جو ببول سے گر کے زمین پر
بکھرے ہوئے ہیں صورت لخت دل و جگر

ان دامنوں سے آج ہیں لپٹے پڑے ہوئے
جو چاک ہو کے ساتھ گریباں کا دیتے تھے

پرپیچ دشت صورت گیسوئے مشک فام
بھولے سے بھی سلجھنے کا لیتے نہیں ہیں نام

پھرتے ہیں انمیں بس وہی حرماں نصیب آج
تسکین جنکو دیتا ہے یہ پوچھکر مزاج

وہ ہولناک سطح سمندر کہ الاماں
جنکی نہ ابتدا ہو نہ ہو انتہا بیاں

کھائیں تھپیڑے آہ جہاز اسکے بار بار
جنمیں ہیں انتظار کے مارے ہوئے سوار

ہے انتظار نام سکوت اور سکتے کا
جنہیں خیال کر دیں لیتا ہے دلفزا

پہلو میں نازنیں کیطرح گدگداتا ہے
یہ کیفیت مزے کی نہایت دکھاتا ہے

امید انتظار کے پہلو میں ہے پلی
ہے دل ہی کو آرزو و استادہ ہر گھڑی

بیتاب دل جو ہو تو تسلی یہ دیتی ہے
بےچین ہو ذرا تو یہ گودی میں لیتی ہے

اسکا سکوت دلکو مزے وہ دکھاتا ہے — دلچسپیاں جہاں کی بشر بھول جاتا ہے
ہے قاعدے کی بات جو ہوتی ہے چیز دور — ہوتا ہے اسکے ملنے کا دل میں بہت وفور
کہتا ہے شوق پاس ہمارے چلی یہ آئے — یا ہمکو پاس اپنے ابھی کھینچکر بلائے
یہ نیلے نیلے رنگ کا ہے گول آسمان — یہ تارے جگمگا کے دکھاتے ہیں اپنی شان
افشا نکی طرح وہ جو جھلکتی ہے کہکشان — درد جگر کی طرح چمکتی ہیں بجلیاں
یاقوت لب کیطرح شفق میں ہے کیا بہار — بادل یہ جھوم جھوم کے آتے ہیں باربار
یہ کیوں ہمیں بہار دکھاتی ہیں اسقدر — یہ اسلیئے کہ دور ہیں سب بلکہ دور تر
کیا اچھی وہ گھڑی تھی کہ جب دلکو تھا فراغ — تھے انتظار میں کسی گلرو کے باغ باغ
پہلو میں اُسکی یاد تھی ہر وقت ہمنشیں — رہتا تھا اپنی چشم تصور میں نازنیں
ایسا یہ انتظار تھا اک جس سے تا حیات — امید کچھ نہ تھی کہ ملیگی ہمیں نجات
لیکن ہمارا جوش جوانی جو گھٹ گیا — پر وہ تمام دلکی اُمنگوں کا ہٹ گیا
جب پختہ کاریوں کو ملا وقت کام کا — دلکی توجہ اور طرف پھیر دی ذرا
جسکی یہ ہے غرض کہ بنو نوحہ خوانِ قوم — اُٹھ بیٹھو خواب جہل سے اب اے جوانِ قوم
پچھلی ترقیوں کو کرو آج اپنی یاد — بیٹھو سنبھل کے اور کرو دلکو شاد شاد

کوشش کرو کہ پھر کے بہار آئے باغ میں
کچھ تیل چاہئے ہے ابھی اس چراغ میں

آثار قدیمہ

کیا مٹائے ہیں زمانے نے پرانے آثار — نہ ہیں شاہانِ الوالعزم نہ اُنکے دربار
وہ قدامت کے کتابے وہ عماراتِ لطیف — شہر آراستہ پیراستہ مینا بازار
اعلیٰ اعلیٰ شعرا ناظم جادو تقریر — کیسے کیسے فصحا بلغ و دانا ہشیار
اُڑ گئے سب یہ قدامت کے کچھ ایسے پردے — کہ نظر تک نہیں آتے ہیں کسی کے آثار
نذر کھڑاتی ہوئی چلتی تھی جہاں رہ نسیم — اب ہیں وہ باغ کہاں اور کہاں اُنکی بہار
اگلی دنیا کا اگر نام و نشاں باقی ہے

تو وہ ٹوٹی ہوئی قبریں ہیں پرانی دو چار

خواب نوشیں کا مزا لیتے ہیں سونے والے — چین سے سوتے ہیں مرقد میں صغار اور کبار
جب کبھی گورِ غریباں کی طرف جا نکلے — انکو دیکھا کہ ہیں سب منتظرِ روزِ شمار
فاتحہ پڑھنے کو جب ہاتھ اُٹھایا ہم نے — دیکھکر دیدۂ عبرت سے یہیں اور بسیار
دل بھر آیا وہیں اور آنکھوں سے آنسو ٹپکے — بیکسی اُنکی محافظ تھی الم جو کیدار
نیست نابود ہوئے سیکڑوں کہنہ تکئے — لوحِ تربت کا پتہ ہے نہ کہیں نقشِ مزار
بعض قبروں کو زمانے نے مٹایا تو بہت — مٹ سکیں وہ نہ مٹانے سے کبھی آخر کار

درحقیقت ہیں زمانے میں وہی خوش تقدیر
نام مرنے پہ بھی مٹتا نہیں جنکا زنہار

دیکھئے کھول کے اوراق لقاویم کہن — ذکر کچھ اہل وفا کا ہے جہاں حسرت بار
ہیں وہاں بعض ستم کیش بھی ایسے ایسے — نقدِ جاں جن سے بچانا تھا جہاں کو دشوار
سچ اگر پوچھئے تو واقعی آثارِ قدیم — جتنے برباد ہوئے اُتنے ہیں عبرت آثار
کہنہ قصوں میں جو ہے لطف اسے کیا کہئے — اگلے بڈھوں کے تقاریر ہیں دُرِ شہوار

عشرت ان کہنہ عمارات کو دیکھے کوئی
منہ سے کہدیتی ہے سب حال شکستہ دیوار

چاند اور اس کی روشنی

اے چاند تیری روشنی کس نور سے معمور ہے — آنکھوں میں ٹھنڈک جس سے ہے فرحت سے دل مسرور ہے
کس باغ کا تو پھول ہے کس بزم کی قندیل ہے — شعلہ ہے یا بجلی ہے تو یا نار ہے یا نور ہے
یہ فیض تیرا سب پہ ہے ہو دوست یا دشمن کوئی — یکساں ہے تیری روشنی نزدیک ہے یا دور ہے
شیشہ ہے تو کس جام کا تو ہے نگیں کس نام کا — کس سوز کا تو ساز ہے کس زخم کا ناسور ہے
آئینہ ہے کس ماہ کا نقشِ قدم کس راہ کا — تو قرص ہے کس خوان کا یا تو وہ کافور ہے
کس حور کا رخسار ہے کس دل کا تو دلدار ہے — یا آنکھ کی پتلی ہے تو یا نرگسِ مخمور ہے
بیشک خدا کا نور ہے پردے میں تیرے جلوہ گر — دم سے ترے ہر اک مکاں مانندِ کوہِ طور ہے

پہلو میں ترے اے قمر تارے نہیں ہیں جلوہ گر — نخل تمنا کے ثمر یا خوشۂ انگور ہے
سینے پہ تیرے داغ ہیں کس ماہوش کے ہجر کا — عاشق ہے کس محبوب کا وہ کون رشک حور ہے
تو خود حسین ہے عشق کا کیوں روگ اپنے سر لیا — یہ بوجھ تجھ سے اٹھ سکا عاشق ہے یا مزدور ہے
وہ کونسا معشوق ہے کچھ نام تو اسکا بتا — کیا وصل اس دلدار کا تجھکو نہیں منظور ہے
تارے ہیں یا آنسو ترے یا قطرۂ خون جگر — یاد میں تیرے زخم ہے یا کوئی یہ ناسور ہے
میری سی حالت تری ہے تیری سی حالت مری ہے — میں ہوں ستمدیدہ اگر تو بھی بہت رنجور ہے

عاشق کو ملتا ہی نہیں راحت سے رہنا ایک شب
یہ امر ناممکن سا ہے یہ بات تو مشہور ہے

بادل

تیرے احساں کے ممنون ہیں سب اے بادل — خار صحرا ہوں کہ گلہائے چمن سرو جبل
کھیت کے کھیت ہیں سیراب تری بارش سے — مخملی فرش بچھا دیتے ہیں سوکھے جنگل
تو گرجتا ہوا آتا ہے تو ہوتا ہے گماں — بھر کے لایا ہے کوئی کا نوار تھی گنگا جل
کاشتکاروں کا ترے دم سے ہے مرنا جینا — خشک سالی سے تجھے رہتی ہے ہر روز جدل
تو نہ آئے تو خزاں انکا نہ قدم جائے کبھی — تو نہ آئے تو چمن میں بھی نہ پھوٹے کونپل
سبز بانات کے ہیں پھول لگے اوراق شجر — پھول درختوں میں کہ فانوس میں روشن ہیں کنول
آشیانوں میں پرندوں کے بھرا ہے پانی — باغ میں بارش باراں سے پڑی ہے ہلچل
بوند پانی کو جہاں روتے تھے دن رات کسان — ایکدم بھر میں ندیاں بھر دیئے تو نے جل تھل
گھاس پر دیکھ کے شبنم کو یہ ہوتا ہے گماں — موتی ٹانکے ہیں کسی نے لب فرش مخمل
ابکی بارش میں انہیں جینے کی امید ہوئی — ورنہ مایوس تھے دہقاں تو اول اول
زرد پتے تھے ابھی سوکھے ہوئے باغوں میں — کیسا برسات کے آتے ہی گیا رنگ بدل
اس قدر لاتا ہے اے بادل کہاں سے پانی — کہ جو بھر دیتا ہے دم بھر میں تمامی جل تھل
بھر کے لے آتا ہے پانی جو سمندر سے کبھی — تو زمیں کہتی ہے مہاراج پلا دو ہمیں جل
شام کو وقت کھلا ہے جو برس کر پانی — ورق چرخ پہ چسپاں ہے سنہری جدول

پیٹ بھرتا ہے زمیں کا ترے مشکیزے سے
سینچنے سے تو یہ عقدہ کبھی ہوتا نہیں حل

تو نہوتا تو ابھی قحط سے مرجاتے سب
تو نہوتا تو زمانہ میں نہ ہوتا کوئی پہل

بے ترے حکم ہے بیکار زمینداروں کا
بے ترے نظم زراعت میں زجاجات خلل

نیرنگئ فلک

یہ مثل سچ ہے نہیں ظالم کو ملتا ہے قرار
اے فلک گردش تجھے بھی ایک ہی حالت میں ہی

اس پہ بھی جور و جفا سے باز تو آتا نہیں
آہ ظالم ظلم کرنا کچھ تری خلقت میں ہی

حکمراں تو عرصۂ گیتی کے ہر گوشے پر ہے
دبدبے میں دبدبہ صولت تری صولت میں ہی

دامنِ دولت میں تیرے گو نہیں ہے کچھ کمی
بخل قارونکی طرح لیکن تری خصلت میں ہی

یہ نہیں کہتے کہ رکھا اثر پھر تو نے خراب
آج عزت جسکو دی تو نے وہ کل ذلت میں ہی

اس تلون سے ترے گھبرا گئے ہیں سب کے سب
تو نہو اب ہم وہاں جائیں یہی نیت میں ہی

عہد تیرا ایک بھی ہمنے نہ پایا استوار
سر چڑھا کر پھر گرا دینا تری طینت میں ہی

تجھمیں سب انداز ہیں بدعہدئ معشوق کے
جھوٹ تو ظالم ہمیشہ سے تری قسمت میں ہی

ظلم چاہے جسقدر کرلے تجھے ہے اختیار
جان تو جان آفریں کے قبضۂ قدرت میں ہی

چمکے افشاں تو ستاروں کی نکلتا ہے تو کیا
سب یہ کہتے ہیں کہ یہ صورت کسی صورت میں ہی

ونکو ہے خورشید سے شبکو مخاطب چاند سے
اک نیا معشوق تیرے پاس ہر خلوت میں ہی

لیکن ان دونوں سے بھی اچھے نہیں تیرے سلوک
اک اگر غربت میں ہے تو دوسرا ذلت میں ہی

پھر بھلا کس بات سے تیری زمانہ خوش رہے
اک ستمگاری کا شیوا تیری ہر جدت میں ہی

ایک دن وہ تھا کہ یوسف پر زلیخا تھی فدا
ایکدن وہ ہی کہ مسکین قید کی حالت میں ہی

تیری اک گردش میں عالم کا بدلجاتا ہی رخ
کوہ کو اک کاہ کر دینا تری عادت میں ہی

اوّل اوّل تو نے دارا سے کیے کیسے سلوک
آخر آخر جاہ اسکندر کی وہ ہیبت میں ہی

ذکر کسرا ہے نہ وہ جمشید کا ہے جامِ جم
ذکر جنکا آجتک ہر ایک کی صحبت میں ہی

یاد ہے ہمکو کہ ہندستان کبھی سرسبز تھا
آج ہر فرد و بشر جسکا بہت نکبت میں ہی

کیا ہوئے دہلی کے وہ مشہور شاہانِ سلف نام جن کا آج تک سطوت میں ہے شوکت میں ہے
خاک میں تو نے ملایا آہ کس کس نام کو
آج ہم اٹلی کو روئیں یا قصورِ شام کو

پانی نہیں برستا

اب ہوگی خشک سالی پانی نہیں برستا ہیں کاشتکار خالی پانی نہیں برستا
تحصیل اور پولس نے بے ڈھب ستا رکھا ہے لیکن جناب عالی پانی نہیں برستا
بید خلیوں کے چرچے ہر سمت ہو رہے ہیں پھیلی ہے بدخیالی پانی نہیں برستا
بالے میاں کا میلا کس طرح ابکی ہوگا بھوکے ہیں سب قوالی پانی نہیں برستا
باغوں میں جو شجر ہیں وہ نخلِ بے ثمر ہیں روتے ہیں سارے مالی پانی نہیں برستا
گل خار ہوگئے ہیں غنچوں میں بو نہیں ہے سوکھی ہے ڈالی ڈالی پانی نہیں برستا
گو موسمی رپوٹر کرتے ہیں مطمئن اب لیکن ہیں پیٹ خالی پانی نہیں برستا
اضلاع میں مویشی بیمار ہو رہے ہیں روتی ہے دودھ والی پانی نہیں برستا
کچھ ٹڈیوں نے لوٹا کیڑوں نے کچھ مٹایا ہر جا ہے قحط سالی پانی نہیں برستا
بے چارہ گائے بھینسیں فاقوں سے مر رہی ہیں کرتی ہیں سب جگالی پانی نہیں برستا
ابکی جوار آخر کچھ سوکھ سی چلی ہے
مرجھا گئی ہے بالی پانی نہیں برستا

برسات کی بہار

رحم بارش کا نہ ہوگا جو گنہ گاروں پر اوس پڑ جائیگی امسال زمینداروں پر
کیمپ سرکار کا آتا ہے جو دورہ پہ کبھی ظلم ہوتا ہے رسد کا انہیں بیچاروں پر
غلہ درخواست گرانی کی کیا کرتا ہے قحط سالی جو چڑھی آتی ہے دلواروں پر
ابر گھر گھر کے جو آتا ہے کبھی ساون میں لوٹتے ہیں وہیں اقبال سب انگاروں پر

وہ برستا ہوا آتا ہے وہ بادل دیکھو — رحم فرما ہی دیا ہم سے سیہ کاروں پر
کیا تکلف ہے کہ برسات نے رکھا جو قدم — مخملی فرش بچھائے گئے کہساروں پر
خوش یہ پانی سے زمیندار ہیں اللہ اللہ — آب رحمت کا برستا ہے گنہگاروں پر
لہلہاتے ہیں چمن کھیت ہیں سیراب تمام — پانی تالاب میں ہے سبزہ ہے دیواروں پر
بولتے ہیں کہیں مینڈک کہیں بگلوں کا ہجوم
ٹوٹے پڑتے ہیں خریدار خریداروں پر

مرثیہ قیصر ہند

یہ ستم کیسا ہوا ہے گردش گردوں سے آہ — اُٹھ گیا سر سے ہمارے اک معظم بادشاہ
وہ شہ اڈورڈ ہفتم خسروِ خورشید جاہ — چین سے سوتے تھے جسکے عہد میں شام و پگاہ
وہ رعیت کا نگہبان گوشۂ تربت میں ہے
موت تیرے ہاتھ سے ہر ایک کس ذلت میں ہے
ملکۂ وکٹوریہ کا لخت دل کیا ہو گیا — جو ہمارے دل میں اپنا تخم الفت بو گیا
جاگ کر اپنا مقدر دفعتہً کیوں سو گیا — جو کوئی آیا ہماری بیکسی پر رو گیا
قیصر ہند آپکو ہم سے جدا ہونا نہ تھا
اسقدر جلدی رعیت سے خفا ہونا نہ تھا
شاق ہے ساری رعیت پر جدائی آپ کی — معترف ہے عدل پر ساری خدائی آپ کی
اللہ اللہ اسقدر بے اعتنائی آپ کی — آہ اتنی جلد آخر موت آئی آپ کی
آپکی فرقت میں ہے محزون رعایا ہند کی
آپکی فرقت میں ہے مجنون رعایا ہند کی
یہ الم ہم ہند والوں کے واسطے کچھ کم نہیں — موجزن دریا ہیں گویا دیدۂ پرنم نہیں
بیکسی کی بیکسی ہے انتہائے غم نہیں — زخم یہ وہ ہے کہ جس کا حشر تک مرہم نہیں
آہ اے عشرت، شہ عادل ہمارا اُٹھ گیا
ملکۂ وکٹوریہ کے دل کا پارا اُٹھ گیا

کلجگ کتھا

شریفوں میں باقی شرافت نہیں ہے — رئیسوں میں شانِ ریاست نہیں ہے
گلے کاٹے جاتے ہیں اہلِ غرض کے — کہاں گرم بازارِ رشوت نہیں ہے
عدالت میں ہے پنچ قوموں کو منصب — شرافت کی کچھ قدر و قیمت نہیں ہے
خطابوں کے لالچ میں بنتے ہیں لیڈر — انہیں قوم کی کچھ بھی غیرت نہیں ہے
کہاں قدر دانیِ اہلِ ہنر ہے — کمالات کی قدر و عزت نہیں ہے
تجارت میں مکر و دغا کا چلن ہے — یہ ٹھگ بدیا ہے تجارت نہیں ہے
مسلمان مذہب سے منھ پھیر بیٹھے — کسی کو لحاظِ شریعت نہیں ہے
زمانہ تو ہے معتقد ڈاکٹر کا — طبیبوں کی چلتی طبابت نہیں ہے
یتیموں کا پرساں نہیں آہ کوئی — کہیں رانڈ بیوہ کی حرمت نہیں ہے
یہی دھن ہے بچوں کو انگلینڈ بھیجو — کہ ملکی زباں کی ضرورت نہیں ہے
بہت کفر و الحاد پھیلا ہوا ہے — کہیں ذکر توحید و وحدت نہیں ہے
اٹھی جاتی ہے رسم پردے کی بالکل — کہ اب ڈولی ڈنڈے کی حاجت نہیں ہے
تکبر کے پتلے ہیں عالم یہاں کے — بری چیز کیا کبر و نخوت نہیں ہے
گرانی سے مفلس کو مشکل ہے جینا — کوئی پیٹ بھرنے کی صورت نہیں ہے
ہوئی جب سے تقسیم بنگالہ واپس — شدیشی کا وہ زور و قوت نہیں ہے
خطاباتِ شاہی تو ملتے ہیں اکثر — مگر رسم تنخواہ و خلعت نہیں ہے
نئی صورتیں ہیں نئی پوششیں ہیں — پرانا طریق طبیعت نہیں ہے
جو زرخیز تھا ہند مشہورِ عالم — وہ مفلس ہے اب اس میں دولت نہیں ہے
سمجھ رکھیں تعلیم نسواں کے حامی — کہ پردے پہ حملے کی حاجت نہیں ہے
صفایا کیا چار ابرو کا ہم نے — مگر لاٹ کرزن کی صورت نہیں ہے
خدا لیگ کو دیرپا زندہ رکھے — کہ سر آغا خان کی صدارت نہیں ہے
محبت کا نام و نشاں اب کہاں ہے — کہ بھائی کو بھائی سے الفت نہیں ہے

شرابیں اڑاتے ہیں مسجد میں مُلّا
بڑی ڈاڑھی والوں کو غیرت نہیں ہے
دغا سے کسی شخص کا مال کھانا
یہ ہے پالسی کچھ خیانت نہیں ہے
اڈیٹر جو اخبار کے دام مانگے
تو لکھتے ہیں ہم کو ضرورت نہیں ہے
یہی کاشتکاروں کا رونا ہے ہر دم
کہ اب فائدہ دِہ زراعت نہیں ہے
ہر اک اپنے مذہب کی پیچ کر رہا ہے
تعصب سے خالی ریاست نہیں ہے

نصیحت سے مملو ہے عشرت کا لکچر
ہنسے آپ کیوں کچھ ظرافت نہیں ہے

عید کا چاند

خوشی عید کے چاند کی کسقدر ہے
جسے دیکھئے آسماں پر نظر ہے
نگاہوں کے ڈورے فلک کھینچتے ہیں
طنابیں فلک کی ملک کھینچتے ہیں
لگائے ہوئے سب کے سب ٹکٹکی ہیں
ہر اک سمت کو آدمی آدمی ہیں
کسی کوٹھے پر چند بوڑھے جواں ہیں
کہیں چند لڑکے کہیں لڑکیاں ہیں
کسی ماہتابی پر اک نازنیں ہے
کہیں سوے گردوں لگی دوربیں ہے
کہیں اک ضعیفہ کے عینک لگی ہے
وہ موٹی نظر سے اُدھر تک رہی ہے
بغل میں کوئی اپنے قرآن دبائے
کوئی آئینہ ہاتھ میں ہے اٹھائے
دلہن کوئی گھونگھٹ اُٹھائے ہوئے ہے
نگہ آسماں سے لڑائے ہوئے ہے

کوئی ہے گلوگیر ضعف بصارت
کسی کو ہے تقدیر سے کچھ شکایت
نگاہیں فلک سے لڑاتا ہے کوئی
سیاہی کے لکے دکھاتا ہے کوئی
گھرا آج بادل سے سب آسمان ہے
نظر سے ہلال اس سبب سے نہاں ہے
خدا سے ہے اگر چاند کی دیکھیں صورت
کہاں ایسی عزت کہاں ایسی قسمت
نصیبوں سے یہ سال آیا ہے ایکی
خدا ہی نے یہ دن دکھایا ہے ایکی
شفق سُرخ سے ہے عیاں آسماں پر
کہ دریائے خوں ہے رواں آسماں پر
ہے کیوں اسقدر نیلگوں آسمان یہ
کسی ماہ نے لی ہیں کیا چٹکیاں یہ

گھڑی دو گھڑی کو جو چھٹ جائے بدلی
تو مہتاب کی شکل دکھلائے بدلی
نگہ کی تو کچھ جوت کمتی نہیں ہے
نظر لیکن اسوقت جمتی نہیں ہے
ابھی کچھ چکاچوند سی ہو گئی ہے
نگہ دیکھتے دیکھتے کھو گئی ہے
ذرا دیکھنا تو یہ کیا سامنے ہے
منور یہ کچھ بال سا سامنے ہے
یہ ناخن تو اک ماہوش کا نہیں ہے
ذرا لیکے آنا کہیں دوربین ہے
نظر سے ابھی ہو گیا کوئی اوجھل
بڑا گھر کے آیا ہے اسوقت بادل
اشارے سے کوئی یہ کہتا ہے خوش ہو
ذرا دیکھو وہ چاند ہے سامنے کو
دعا پر دعائیں کوئی مانگتا ہے
کوئی شکر اللہ کا کر رہا ہے
یہ اک عید کے چاند کی یہ خوشی ہے
مگر قوم ادبار میں پھنس گئی ہے
خدا کے لیے قوم کے نوجوانو
کبھی قوم کے چاند کو بھی تو ڈھونڈو
تم اپنی فلاحت کا مہتاب ڈھونڈو
تم اپنی ترقی کے اسباب ڈھونڈو
کچھ اب عید کا لطف تم کو نہیں ہے
کہ افلاس میں ہند کی سرزمین ہے
اگر عید چاہو ترقی کرو تم
کسی قوم سے اب نہ پیچھے رہو تم
تمھاری وہی عید ہے یاد رکھو
کہ جس روز پھل اپنی محنت کا چکھو
یہ کس خواب راحت میں تم سو رہے ہو
عبث عمر غفلت میں تم کھو رہے ہو

ہلال اپنی عزت کا ڈھونڈو کہاں ہے
جہالت کی ظلمت میں شاید نہاں ہے

اگلی دلچسپیاں

کچھ ایسی نہ تھیں اگلی دلچسپیاں
جنھیں بھول جائے کوئی مہرباں
بتاؤ تو اے اختران فلک
ان آنکھوں نے دیکھا ہے کیا کیا سماں
تمھاری تو صورت کہے دیتی ہے
کہ سب دیکھ ڈالا ہے تم نے جہاں
جھپکتی نہیں ایک پل بھی پلک
رہا کرتے ہو رو دق آسماں
خصوصاً وہ حیرت بھری رات ہے
قوی کہ جب اپنے اس دور کے درمیاں

تمھیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے آنکھ سے — گذر جاتی ہے شب، پرانے نشاں
سحر تک چھپ جاتی ہیں پاس سے — تمھاری وہ آنسو بھری آنکھڑیاں
عجب لطف کی ہے نسیم سحر — قیامت کی ہیں اسکی اٹھکھیلیاں
مگر جب وہ افسردہ دل کی طرح — چلی ڈھونڈنے اگلی سرسبزیاں
تو اُجڑے ہوئے پائے ایسے چمن — کہ جو رونقِ دہر تھے بے گماں
وہ اگلے مورخ جو طے کرتے تھے — ترقی میں نہ کرسی آسماں
قیامت کا ہوتا ہے اسمیں اثر — سُناتی ہے جو حال اُنکی زباں
وہ عالی منش بادشاہاں دہر — وہ اُنکی سواری وہ تخت رواں
وہ طلاب دن رات محنت سے جو — لگاتے ہیں امید کی سیڑھیاں
مبارک تھیں شایستہ وہ محفلیں — مبارک تھی وہ بزم اسپیکراں
وہ نکھری ہوئی صحبتیں کامیاب — جو وحدت پرستی کی تھیں نردباں
وہ علم الٰہی کے اجلاس پاک — مجالس مدارس کے وہ قدرداں
وہ اگلے پیادہ روی کے سفر — وہ فاقے کی سوکھی ہوئی روٹیاں
سمندر اولوالعزمیوں نے تھے پر — انہیں ہمتوں نے تھے دریا رواں
جہازوں کے وہ نامور ناخدا — وہ اہرام مصری کی صناعیاں
وہ بڈھے مقدس وقایع نگار — وہ سچ بولنے والے پیر و جواں
جب اقبال کی چل رہی تھی ہوا — جب ادبار کا تھا نہ نام و نشاں
منور تھی تہذیب کی انجمن — شجاعت دکھاتی تھی بدمستیاں
نہ تھی قحط سالی نہ طاعون تھا — بہشت بریں تھا یہ ہندوستاں
زباں سے جو کہدیں وہ کرکے دکھائیں — نہ افسوس دولت نہ افسوس جاں
کہاں تک کہے جائے یہ کتھا — مزے کی ہے حسرت بھری داستاں
یہ نقش طلسمی زمانہ نے سب — مٹائے مٹا کر گئے رائیگاں
نہ وہ اگلی باتیں نہ وہ اگلے لوگ — مگر اُنکی باقی ہیں دلچسپیاں
بس اب خواب غفلت سے بیدار ہوں — جو موجود ہیں قوم میں نوجواں
کریں ایسی کوشش کریں ایسے کام

زمانہ پس مرگ ہو قدرداں

امر بالمعروف و نہی عن المنکر

ہو فرضناک علیگڑھ کے عقاید ہیں ضعیف | اور یہ فرقہ کا فرقہ سبھی ہے گمراہ
گو کہ بنتے ہیں مسلماں یہ مسلماں نہیں | بلکہ ہیں دین محمدؐ کے یہ دشمن بدخواہ
فلسفہ انکے عقاید کو مضر ہے بیشک | سب ہیں برگشتۂ اسلام عیاذاً باللہ
نہ نماز انکے لیے فرض نہ روزہ لازم | نہ ادا امر نہ منا ہی فقہ کی پروا
بے وضو روز ادا کرتے ہیں مسجد میں نماز | انکے ہاتھوں سے بہت دین کی حالت ہے تباہ
نفع دنیا کیلئے دین یہ کھو دیتے ہیں | نور ایماں نہیں کچھ قلب ہیں ان سبکے سیاہ
علماء آپکو غصہ نہیں لازم اتنا | آپ تبلیغ سے منھ پھیرتے ہیں خواہ مخواہ
دین اسلام کی دعوت انہیں فرمائیں آپ | شاید آجائیں کبھی راہ پہ یہ سب گمراہ
انکے جلسوں میں ذرا لائے حضرت تشریف | انکے اقوال پہ فرمائیے دشمن کی نگاہ
انکی اصلاح پہ ہمت کی کمر بندھ جائے | انکو دکھلائیے دنیا کے سفید اور سیاہ
یہ اگر اندھے ہیں تو آپ بتائیں رستہ | یہ کنویں میں جو گریں آپ پہ ہوتا ہے گناہ

یا تو یہ نام نہ لینگے کہ مسلمان ہم ہیں
یا ہدایت پہ یہ آجائینگے انشاء اللہ

ظ

اسلامی ڈیپوٹیشن

اہل اسلام کی طرف سے حضور | ہے گذارش یہی بصد زاری
سلطنت معدلت پہ ہے مبنی | ہے رعیت مطیع سرکاری
خوار ہیں آج کل مسلماں سب | جان سے ہو رہے ہیں بھاری
گو کہ تعلیم کی نہیں ہے کمی | آج ہیں از فضل ایزد باری
اسپہ بھی نوکری نہیں ملتی | منحرف انسے سب ہیں درباری

ان سے لڑتے ہیں اسطرح اغیار جیسے یونانیوں سے بلغاری
مٹے جاتے ہیں سب حقوق انکے زخم دل پر لگے نہ کیوں کاری
کشتی انکی پھنسی ہے دلدل میں کوئی کرتا نہیں ہے اب یاری
کوئی سنتا نہیں ہے کانوں کان چیختے ہیں اگرچہ اخباری
انتخاب انکے واسطے ہے مضر سخت ہے اس میں انکو دشواری
آفسوں میں اگر یہ جاتے ہیں کوئی کرتا نہیں مددگاری
منھ بنا کر یہ کہتے ہیں لالہ توند دولت سے جنکی ہے بھاری
نہیں دفتر میں ہے جگہ خالی آجکل ہے یہ سخت دشواری
بھرتی ہو جاتے ہیں مگر ہندو لکھنے پڑھنے سے خواہ ہوں عاری
ہر جگہ ہم ذلیل ہوتے ہیں ہے کوئی حدِ ذلت و خواری
اس سے افلاس بڑھتا جاتا ہے پھیلتی جاتی ہے یہ بیماری
کوئی دیتا نہیں دوا ہمکو نہ کوئی کرتا ہے خبرداری
مفلسی اور قحط سالی سے چھین لی ہے زری نے زرداری
کچھ تجارت بھی اب نہیں چلتی بھوکے مرتے ہیں سارے بیوپاری
دشمن اہل زمانہ ہیں اپنے ناموافق سپہر زنگاری
وجہ یہ ہے کہ اب تعصب کی غیر قوموں نے کی ہے تیاری
وقت یہ ہے کہ سلطنت اٹھکر چونٹیوں کی کرے خبرداری
پیس ڈالیں نہ فیل مست انہیں کیونکہ سب منھ چڑھے ہیں سرکاری
اب مسلماں بھی خواب سے چونکے ان میں پیدا ہوئی ہے بیداری
آج تک یہ انہیں بھروسہ تھا فیض سرکار سب پہ ہے جاری
مگر اب حالت زمانہ نے نوجوانوں کو دی ہے ہشیاری
اس خموشی کو جسمیں نقصان ہو وہ سمجھتے نہیں وفاداری
ہوکے مجبور اس ضرورت سے عرض کرتے ہیں یہ بناچاری
انتخاب مجالس ایسا ہے ہند کے بھس میں جیسے چنگاری
بات یہ ہے کہ جسقدر سرکار دے سکے انکو نوکری بھاری

ملک میں ایسے لوگ ہیں موجود — علم و تہذیب سے نہیں عاری
ڈسٹرکٹ بورڈ اور مینو سپل — ابتدائی یہ عہدے سرکاری
ہم سے خالی ہیں صاف وائے نصیب — قوم کی کس طرح ہو غمخواری
ہم مسلمانوں کے پوزیشن کی — آپ کو چاہئے ہے دلداری
آج کونسل میں بھی نہیں کوئی — اک مسلماں مشیر سرکاری
اتنی سرکار سے ہے استدعا — انتخاب اس طرح کا ہو جاری
آج جو ملک میں معزز ہیں — اور تعلیم سے نہیں عاری
اُن مسلمانوں کے ہو شوراے سے — طرز اس انتخاب کا جاری
ہائی کورٹ میں چیف کورٹ میں — کب مسلمان کی آئیگی باری
شکوہ ہمکو نہ ہے شکایت کچھ — عرض ہے ازرہِ وفاداری
دیر میں ہمنے کی گذارشِ حال — اس خطا کے ہیں آپ اقراری
منھ سے کہدیتے ہیں جو دل میں ہے — جس قدر دیتی ہے زباں یاری
پر بغاوت کی بو نہیں ہم میں — خیر خواہِ قدیم سرکاری
نہ کوئی بادشاہِ غیر اپنا — نہ کوئی ہے شریک بازاری
کوششیں ہم کریں تخالف میں — یہ تو کہتی نہیں نمک خواری
سلطنت کی اگر شکایت میں — کوئی کلمہ زباں پہ ہو جاری
کاٹ کر اُس زباں کو رکھدو — یہی کہتی ہے ہم سے جیداری
حق ہمارے مٹائے دیتی ہیں — غیر قومیں ز راہِ عیاری
اس لیے آپ سے گذارش ہے — اب تو فرمایئے مددگاری

دوستاں را کجا کنی محروم
تو کہ با دشمنان نظر داری

کشمیری بہار و خزاں

نہ ہوئے پر نہ ہوئے خواب سے کاشو بیدار / ہوگیا وقتِ خزاں آہ یہ قومی گلزار
اس چمن میں وہ شگفت کے کہاں گل بوٹے / علم کی انمیں نہ خوشبو ہے نہ دولت کی بہار
عندلیبِ چمن و علم و ہنر تھے جو لوگ / سوتے ہیں وہ تو بہشت چمن اب زیرِ مزار
اور موجودہ مسلماں جو کچھ باقی ہیں / انکو رفتارِ زمانہ سے نہیں کچھ سروکار
علم سے انکو نہ بہرہ نہ تجارت کا ہی شوق / چمنِ جہل مرکب کے ہیں خوش لہجہ ہزار
نہ رسومات کی اصلاح کی تجویز ہے کچھ / نہ فروعات نہ بدعات سے نفرت انکار
انجمن انکے مقاصد کی نہیں ہے کوئی / صنعتوں کے نہیں ہوتے کبھی انمیں افکار
گھر سے نکلیں تو تجارت کا چلے کام کوئی / چھوڑ سکتے نہیں افسوس مگر یہ گھر بار
سوشیل حالتیں افسوس خراب انکی ہیں / انکی سوسائٹیاں ہیں اپنی جہالت پہ نثار
پالسی اپنی بدلتے نہیں اب کیا ہوگا / فرسِ جہل پہ دن رات یہ رہتے ہیں سوار
وہ مسلمان ہیں کشمیر میں جن کی عزت / اسقدر ہے کہ پکڑ جاتے ہیں سارے بیگار
انکے اجداد کبھی رکھتے تھے اعلیٰ رتبے / فخر کرتا تھا نہیں لوگوں پہ مغلیہ دربار
علم اور فضل کا کشمیر کبھی مرجع تھا / بالخصوص اپنی یہ صنعت میں تھے مشہور دیار

ستم ایں است کہ کشمیر بہ خواب آمدہ است
ستم ایں است کہ کشمیر نہ گردد بیدار

ہمارا قومی راگ

ہوئے ہیں آجکل بیکار لوٹتے خار کشمیری / کبھی تھے ہند میں جو رونقِ گلزار کشمیری
تجارت انسے چھوٹی ہے زراعت سے ہی بیزاری / ہوئے ہیں زندگی سے کس لیے بیزار کشمیری
نہ آتی ہے کوئی صنعت نہ موجودہ ترقی ہے / رہے تعلیم میں بھی زیرِ استغفار کشمیری
نہ علم و فن سے بہرہ ہے نہ کچھ سائنسدان انمیں / نہیں ہے کوئی لیڈر لائقِ دربار کشمیری

زمانہ کی ہوا سے منھ کو اپنے پھیر کے بیٹھے ہیں — بنے ہیں خود غرض اور موجد تکرار کشمیری
نہیں ملتی ہے انکو نوکری کیا سبب قوموں میں — یہ کیوں بیٹھے ہوئے ہیں آجکل بیکار کشمیری
زمانہ کا اگر رخ دیکھکر کوشش کریں یہ بھی — تو ہو جائیں ابھی دو دن میں سب زردار کشمیری
یہ کیا اندھیر ہے قومی حمیت کھو گئی بالکل — بہت دنیا میں تھے مشہور عزت دار کشمیری
بڑھائیں اپنی معلومات سے ملکی تجارت کو — ذرا یورپ کی نکلیں سیر کو دو چار کشمیری
جہالت اور خود غرضی کی پالیسی بدل ڈالیں — کریں کچھ باہمی جھگڑوں سے اب تو عار کشمیری
ضرورت ہو کہ اب تعلیم نسواں پر بھی راغب ہو — بنائیں عورتوں کو بھی سلیقہ دار کشمیری
کریں اک عام جلسہ منعقد پنجاب میں اپنا — اٹھیں اس کام کو دو چار غیرت دار کشمیری
خدا جسکو یہ دے توفیق وہ پہلے قدم رکھے — خدا کے فضل سے ہیں صاحب ایثار کشمیری
کوئی کشمیر میں پیدا ہو سر سید الٰہی اب — بہت ہیں انتہائے رنج سے ناچار کشمیری

بہت کچھ حال ہم کو قوم کا کہنا ہے اے عشرت
مگر ملتا نہیں ہے ایک بھی غمخوار کشمیری

جد و جہد

سعید بختو نہیں ہو کیوں اے کشمیرو رنجور — کجا شد آں ہمہ مستی بادۂ انگور
وہ دن بھی کیا تھے کہ بادشاہ بخیر جب تم تھے — ہر ایک تھا علم و ہنر کے لباس میں مستور
کہاں گئیں وہ تمہاری ترقیاں آخر — کہاں گئی وہ تمہاری حکایت فغفور
تمہارے کسب و فن ہنر پہ شاہد ہیں — قدیم حسن تجارت کا آج ہے مذکور
تمہارے علم و فضیلت کی آج شہرت ہے — تمہارے اگلے تمدن جہاں میں ہیں مشہور
تمہارے خط و کتابت کی خوشنویسی پر — جھکا چکا سر عجز و نیاز نیشاپور
وہی ہو تم کہ بٹھاتے تھے لوگ آنکھوں پر — کہ ہر کہ دور شد از دیدہ باشد از دل دور
وہی ہو تم کہ تمہارا نہیں وہ رنگ رہا — تمہارے نام سے سب بھاگتے ہیں کوسوں دور
طبیعتوں میں کجی نے کیا ہے اپنا گھر — ز عقل و علم نفور و بشوق فسق و فجور
نہ علم تم میں نہ اخلاق ہے نہ خلق حسن — نہ زور ہے نہ ہے زر ہے جہاں میں تم مقہور

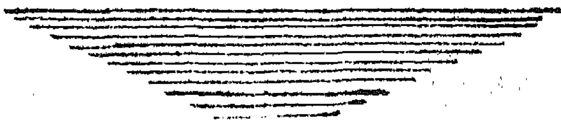
زمانہ روز ترقی کی فکر کرتا ہے — یہ فکر ہے کہ ملیں اب پڑھے لکھے مزدور
بغیر علم کے ممکن نہیں ترقی اب — کہ عقل و علم ہے شمع رخِ شبِ دیجور
نکل کے گھر سے ذرا سیر دیکھو عالم کی — ترقیوں کے لیے سر بسجدہ ہیں جمہور
نہ ہاتھ پاؤں ہلاؤ گے تو خسارہ ہے — بنے رہو گے ہمیشہ اسی طرح مجبور

خدا کے واسطے کوشش کرو بہت جلدی
خدا کا حکم یہ ہے ان سعیکم لشکور

تصویر تواضع

تواضع کہتے ہیں جسکو وہ بزم عیش افزا ہے — بُرا سمجھے جو سب سے اپنے کو وہ سب سے اچھا ہے
جو رتبہ میں فروتر ہے نہ اسکو جانئے کمتر — کہ دنیا میں ہر انساں اک نجس قطرہ سے پیدا ہے
کوئی گر دولت دنیا سے مالامال ہے تو کیا — غریب اپنی غریبی میں بہت بشاش رہتا ہے
امیر ونکو زیادہ تر غریبوں کی ضرورت ہے — کہ دولتمند حاجتمند کا محتاج ہوتا ہے
فروتن جو جہاں میں ہیں مددگار ہیں سب انکی — تواضع واقعی گنجینۂ درج تمنا ہے
تواضع ہے وہ دولت جسکو سارق لے نہیں سکتا — فزوں ہوتا ہے رتبہ جسقدر انسان جھکتا ہے
جو خادم قوم کا ہو بس وہی ہے قوم کا سید — تواضع قوم کے سردار کو ہر طرح زیبا ہے
مقابل میں حقیر اپنے کو کہنا عین عزت ہے — بزرگی نیکنامی کا یونہیں دروازہ کھلتا ہے
غرور انسان کو زیبا نہیں ہے ایک ساعت بھی — جو دولتمند ہے اسکے لیے تو اور بیجا ہے
فروغِ چہرۂ دانش چراغِ دیدۂ بینش — تواضع جسکو کہتے ہیں وہ اک روشن ستارا ہے

جو اسکے نشہ میں سرشار ہو وہ سر جھکاتا ہے
نہ اسکو حاجتِ ساغر نہ کچھ پروائے مینا ہے



شاہ کابل کی آمد

سنائی دیتی ہے کانونکو آج وہ آواز ۔۔۔ خدا سے جسکے لیے تھی دعا بہ عجز و نیاز
سراج ملتہ والدین شہ حبیب اللہ ۔۔۔ امیر کابل عالی مناقب و ممتاز
ہوئی جو آپکو مد نظر سیاحت ہند ۔۔۔ پروگرام کے چھپنے کا ہو گیا آغاز
بہ عز و جاہ پشاور میں جب قدم رکھا ۔۔۔ تو اُس جلوس کو خوش دیکھکر ہوئے ممتاز
پھر آگرہ کا وہ دربار تھا شکوہ کے ساتھ ۔۔۔ کہ جسمیں جمع تھے سب خاص خاص محرم راز
کلام آپ نے جو کچھ کیا وہ تھا پر مغز ۔۔۔ قبول گوش خلائق تھی آپ کی آواز
جو بات منھ سے نکالی وہ دل میں بیٹھ گئی ۔۔۔ یہ سحر تھا کہ فسوں تھا کہ تھا کوئی اعجاز
مدبر و نکیں تدبر ہے آپ کا مشہور ۔۔۔ معززین کے مجمع میں آپ کا اعزاز
مطیع امر خدا و مطیع امر رسول ۔۔۔ قضا ہوئی نہ کبھی اس سفر میں ایک نماز
کلوں کی دید کی آمادگی جو فرمائی ۔۔۔ تو کانپور میں تشریف کا ہوا تک و تاز
علی گڈھ آئے وہاں سے حضور والا جاہ ۔۔۔ ٹرسٹی جمع سٹیشن پہ تھے مثال ایاز
جنچی تلی ہوئی باتیں ہر ایک سے یوں کیں ۔۔۔ کہ جیسے تیر لگاتا ہو کوئی تیر انداز
جواب وہ دیا قربانیوں کے بارے میں ۔۔۔ کہ ہندوؤں نے کہا "عمر شاہ بادو دراز"
ہنود اور مسلماں کا ہر اک فرقہ ۔۔۔ سمجھ رہا ہے سخی رحمدل غریب نواز
یہ دوستی جو ہوئی ہے ملک معظم سے ۔۔۔ ترقیوں پہ رہے اسکا روز و شب انداز
یہ اتحاد رہے برقرار ما بین ۔۔۔ یہ اتحاد حقیقی بنے اگر ہو مجاز
اس اتحاد کے ہاتھوں ہو روش کو زحمت ۔۔۔ اس اتحاد سے نقصان اُٹھائیں سب غماز
دکھائی ہمکو نصیبوں نے آپ کی صورت ۔۔۔ ہم اہل ہند کو کچھ کم نہیں ہے یہ اعزاز

منم کہ دیدہ بدیدار دوست کردم باز
چہ شکر گویمت اے کارساز بندہ نواز

میزبانی مہمانی

آپ نے کابل سے جو تکلیف فرمائی حضور
ہندیوں کے سر پہ ہے یہ سخت احسان آپ کا

بادشاہوں کے ہوا کرتے ہیں ایسے حوصلے
آج ہر ہندو و مسلمان ہے ثنا خوان آپ کا

ہر قدم پر اطلبوں کے صیغہ کی گردانی ہے
اپنے نفع کیلئے کرتے ہیں نقصان آپ کا

آگرہ میں زر فشانی کی جو مسجد کے لیے
ہر موذن نے ٹٹولا نورِ ایمان آپ کا

لارڈ منٹو کو مسرت آپ کے آنے سے ہے
دست اطفال علیگڈھ میں ہے داماں آپ کا

خانقاہوں کے مجاور آپ کے تھے منتظر
کیونکہ وقفِ عام تھا اک گنج پنہاں آپ کا

مسجدوں کے ہر موذن کی اسی پر تھی نگاہ
کھولدے بخشش کا در دست زر افشاں آپ کا

سہ پہر کو آپ نے دربار فرمایا حضور
دیدنی تھا جلوہ روز عید قرباں آپ کا

جس جگہ پہونچے وہاں پر دیکھے آئے آپ کچھ
ہند کے افلاس نے کھینچا گریباں آپ کا

بات یہ اپنی سمجھ میں آگئی ہے اسقدر
آپ مہماں ہند کے ہیں ہند مہماں آپ کا

تہنیت خیر مقدم

اے خوشا قسمت پرنس آف ویلز کے آئے قدم
لیکن ایسے وقت میں جب ہند تھا محتاج آش

قحط اور افلاس کے ہاتھوں تہیدستی نصیب
دانہ گندم کیصورت سب کے دل تھے پاش پاش

رو رہے تھے ہند کی بربادیوں کو رات دن
کر رہے تھے مدتوں سے چارہ گر کی سب تلاش

تین پیسہ روز کی اوسط کی آمد پہ گذر
ننگے رہتے تھے تو ملتا پیٹ بھر کھانے کو کاش

قحط سے کوئی کوئی طاعون سے برباد تھا
فکر جانوں کی کہیں پر تھی کہیں رنج معاش

گھر سے بھوکے کیا پھٹے حالوں نکلتے سیر کو
ہو نہ جاتا اپنے آبائی شرف کا راز فاش

شغل بیکاری سے آخر ہو گئے یہ مضمحل
رات دن گنجیفہ و شطرنج چوسر اور تاش

خیر مقدم ایسی حالت میں کوئی کرتا تو کیا
کہہ رہی تھی انکی حالت دور باش و دور باش

پھر بھی اے شہزادۂ عالی نصب والا گہر — نذر اقدس کیلئے ہمنے بہت کچھ کی تلاش
فرش بھی کوئی نہ تھا آنکھیں بچھانے کے سوا — خود چنے ملتے نہ تھے لاتے کہاں سے تیل ماش
ہاں مگر پھر تصدق لائے ہیں ہم سب غریب — نقد آہ آتشیں و نالہائے دلخراش

ہدیۂ ما تنگدستاں را بچشم کم مبیں
از مروت بر سر خوان تہی سرپوش باش

مایوسی

مایوسی تو نام ہے تیرا — دل کو ستانا کام ہے تیرا
ناکامی کی گود پلی ہے — آغوش مصیبت میں بڑھی ہے
مرجع ہے تو اہل صفا کی — مرکز ہے تو اہل وفا کی
دنیا تو ہے باغ کی شیدا — تو ہے دل کے داغ کی شیدا
ناکامی کی اکلوتی بیٹی — زحمت کی منہ بولی سہیلی
مجلس میں ہیں ڈھنگ نرالے — محفل میں ہیں رنگ انوکھے
تیرا پیکر روح مجسم — تیری صورت فکر مسلسل
بانکی ٹیڑھی ہیں تیری ادائیں — آنکھوں سے جو دل میں سمائیں
دلکش ہے برسات کا موسم — سبزہ ہے یا جان عالم
چلتے پھرتے کالے بادل — گنگا جمنی بجلی کی چہل پہل
ننھی ننھی بوندوں کا جوبن — ہیرے موتی کے کنگن
موروں کی دلدوز صدائیں — ہنسوں کی مستانہ ادائیں
سبزے پر اک بیر بہوٹی — فیروزے پر یاقوت کی کشتی
باد صبا کا چھپرتا چلنا — چشموں سے پانی کا ابلنا
ہیں یہ نظارے ایسے گہرا — جن پر سب کا دل ہے شیدا
لیکن جو ہیں یاس کے خوگر — انکو یہ خوش آئیں کیونکر
انکے لیے غم عیش ہے گویا — رنج و الم کے وہ ہیں شیدا

سوتوں کو چونکانے والی
تاروں کی گنوانے والی

گوشہ پسندی کام ہے تیرا　　رنج و مصیبت نام ہے تیرا
عزلت کی سرکار تو ہی ہے　　دنیا سے بیزار تو ہی ہے
یہ دنیا کا بھیڑ بھڑکا　　یہ عالم کا ٹھاٹ نرالا
یہ خواہش کے دلچسپ تماشے　　یہ ہوا و حرص کے میلے
یہ امید اور بیم کا غوغا　　یہ میلوں کا جوشش تمنا
ارمانوں کا دل میں آنا　　امیدوں کا رنگ جمانا
شادی کے نایاب وہ جلسے　　بھیڑ کے دلچسپ تماشے
یہ یاروں کی مہر و مروت　　حاسد کا وہ شغل عداوت
شام کی کلفت صبح کی عشرت　　اٹھتی جوانی زور طبیعت
محفل رنگین بزم احبا　　نالہ موزوں نغمۂ زیبا
سب کے دلوں پہ انکا اثر ہے　　سب کے دلوں میں انکا گذر ہے
کون ہے جو مخمور نہیں ہے　　اس مے سے مسرور نہیں ہے
لیکن تیرے سرشار کو کیا ہے　　وہ تو ساری دنیا سے جدا ہے
یاس کی عینک آنکھ پہ رکھ لی　　دنیا ہے اک اجڑی نگری
یاس کی قوت قوت رستم　　یاس کی طاقت طاقت ضیغم
خون کے دریا تونے بہائے　　خون کے آنسو تونے رلائے
تیرے ہاتھوں جان گنوائی　　زہر کو سمجھے لوگ مٹھائی
در کی تیرے خاک جو چاٹے　　آپ گلا وہ اپنا کاٹے
صبر و تحمل تونے سکھایا　　حرص ہوا کو تونے بھگایا
تونے وفا کا عقدہ کھولا　　تونے حسد کا کھوج مٹایا
اب وہ ہوس کا زور نہیں ہے　　اب وہ حسد کا شور نہیں ہے
علم و ادب ہے صبر و سکوں ہے　　جہل و حسد کا حال زبوں ہے
دل میں تیری یاد ہے باقی　　اجڑے گھر کی تو ہے ساقی

بادۂ ہمت بھر دے ایسا لب   کام وہ ہو جو مرد کہیں سب

عزت پر کچھ حرف نہ آئے

جان تو جائے بات نہ جائے

افسانۂ غم

ایکدن وہ تھا کہ ہم تھے مخزن فضل و کمال   مشفق تھے متحد تھے حوصلہ مردانہ تھا

دین کی دولت بھی شامل دنیوی اعزاز میں   وضع کے پابند تھے ہم عزم بھی شاہانہ تھا

فلسفی و منطقی و نحوی و صرفی تھے ہم   عقل و ذہن و علم و فن دولت ہمیں کیا نہ تھا

دین کے ارکان کرتے تھے ادا دنرات ہم   بارگاہِ حق میں ہر دم سجدۂ شکرانہ تھا

شرع کی پابندیوں سے تھے نہ ہم باہر کبھی   مسجد و مکتب سامنے کو ساقی و میخانہ تھا

رہتی تھی مدِ نظر پابندیِ صوم و صلوٰۃ   دل ہمارا رجع بیت اللہ پہ پروانہ تھا

معرفت کے جام پیتے تھے اگر پیتے تھے ہم   ساقی اپنا خلق تھا اور عاجزی پیمانہ تھا

پھر یکایک پھر گیا ہم سے زمانہ اسقدر   دوست جسکو ہم سمجھتے تھے وہی بیگانہ تھا

جس چمن میں روز چلتی تھی ہوائے پُرخزاں   باغ وہ اجڑا ہوا گلزار وہ ویرانہ تھا

آج دنیا میں نہیں ہمسا کوئی نااہل آہ

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

نئی تہذیب

رخنہ اندازی بہت مذہب میں اب ہونے لگی   یہ نئی تہذیب ساری آبرو کھونے لگی

کوئی دوزخ کا ہے منکر کوئی جنت کا مخل   فلسفی اور مولوی سے اب بہت بڑھنے لگی

اکثروں نے سیکھ لیں انگلش باتیں اور سیکھے لباس   جامۂ تہذیب کی پھر شکست [illegible] ہونے لگی

رفتہ رفتہ تھی محبت پہلے ہم میں کس قدر   دیکھ کر ہم مفلسی [illegible] رونے لگی

ہندیوں نے جب کوئی تدبیر سوچی رزق کی   ساتھ انکی بدنصیبی بھی تھی انکے سونے لگی

اُسکی رحمت سے بنے موتی جو آنسو گر پڑے
اشکباری اپنی جرمِ معصیت دھونے لگی
خوابِ غفلت میں رہے جبتک معصیت ساتھ تھی
آنکھ اپنی کھل گئی بد قسمتی سونے لگی

عہدِ جدید

کس قدر اس عہد میں آزاد ہر انسان ہے
جو ہے اپنے وقت کا فرعون ہے ہامان ہے
مذہب و ملت کے قصوں کا یقین آتا نہیں
یہ بھی اہلِ شرع کا باندھا ہوا طوفان ہے
آج اسلامی تمدن میں خزاں کا دور ہے
گو عمل باقی نہیں لیکن وہی قرآن ہے
شادی و غم کو نہیں ہے دخل اپنے شہر میں
جس جگہ رہتے ہیں ہم بستی وہی ویران ہے
شورش جمعیت میں موجزن ہے آجکل قومی نفاق
صلح جو بحر جہاں میں سر بسر طوفان ہے
تفرقہ اندازی گیتی سے رہنا ہوشیار
چار دن کے واسطے مہمان ساری شان ہے
دل ہی اسکا جانتا ہے جس پہ گذرا ہو یہ حال
مرد اگر ستر کو نہیں کوئی ہے تو وہ سلطان ہے
یہ زمیں ہے بیوفا یہ آسمان بے مہر ہے
ہر مسافر اس سرا میں چار دن مہمان ہے
حیرت آبادِ تماشا جلوہ گاہِ تازہ ہے
عارضِ امید پہ رنج و الم کا غازہ ہے

چند پند

ہند میں ہے ہم مسلمانوں کی آبادی قلیل
اور اس قلت پہ کچھ کم ہے اب تعلیم بھی
اس مرض کی ہے ہمارے حق میں یہ کافی دوا
ہم نصابِ کہنہ کچھ اپنے کریں ترمیم بھی
علم تو حاصل کریں محنت کریں دل کھول کر
اجتماعی قوتوں کی ساتھ ہو اسکیم بھی
کر دیا از کار رفتہ جہل نے کتنا ہمیں
ایک تو کڑوا کریلا اور اسپر نیم بھی

ایضاً

زر لاؤ شرافت تو کوئی چیز نہیں ہے — تہہ کر کے رکھو لُنگی میں اب چال چلن کو
حاصل ہے قناعت تو ہے آرام بہت کچھ — منھ دھو کے لگے بہ باد نہ کر اپنے سخن کو
تعلیم جدیدہ نے سکھائی ہیں شوخی — آخر یہ بگاڑے نہ کہیں چال چلن کو
ہیں ناشتہ کرنے کی ہوا فکر میں مشغول — کہنے لگے صاحب کہ ہوئی دیر کفن کو
گھر پھونک کے دکھلائیں تماشا یہ مسلمان
کوڑی نہ کبھی پاس رکھیں اپنے کفن کو

ایضاً

ملا ایک پیر کہن راہ میں — خمیدہ نظر سوئے فرشِ زمیں
نہ گھٹنوں میں طاقت نہ آنکھوں میں نور — گریباں دریدہ پھٹی آستیں
قدم اُٹھتے ہیں لڑکھڑاتے ہوئے — ہر اک دم ہے گویا دم واپسیں
جو پوچھا کہ گردن جھکائے ہو کیوں — یہ کس فکر میں تم ہوا اندوہگیں
تو کہنے لگا تم تو معذور رہو — تواضع کے پتلے بنے ہیں ہمیں
بجا شیخ سعدی کا یہ قول ہے
نہد شاخ پُر میوہ سر بر زمیں

کفایت شعاری

جو بن جائیں ہم سب کفایت شعار — کریں عادت جزرسی اختیار
نظر آمد و خرچ پر گر رہے — رہے یوں نہ فاقہ کشی برقرار
بچھڑا ہے ہم سب کو اسراف نے — بنایا ہے قلاش و بے روزگار

زیادہ بہت خرچ آمد سے ہے
نئی چال کرتے ہیں کیوں اختیار

پھنسے غیر ملکوں کی اشیا میں ہم
ہوئے ظاہری شان پہ کیوں نثار

پرزیشن کو اپنے بڑھاتے ہیں ہم
غریب اپنے بھائی ہیں فاقہ سے خوار

سنبھالیں اگر اپنی حالت کو ہم
تو اس طرح ذلت نہ ہو بار بار

یہ طرز کفایت شعاری ہے خوب
کریں آمد و خرچ کا انحصار

فضول اور اسراف سے دھو کے ہاتھ
بچت کا طریقہ کریں اختیار

انگریزی لباس

کچھ دنوں سے عام رغبت ہے یہی
سیکھئے یورپ کا طرز زندگی

کھانے پینے کا وہی انداز ہو
سوٹ تازہ ہو پرانا ساز ہو

کوٹ ہو پتلون ہو نکٹائی ہو
ہیٹ بھی عمدہ نئی بنوائی ہو

خاص کر مرغوب ہے انگلش لباس
بس اسی تقلید میں ہیں بدحواس

ہوتا ہے برباد اتنا روپیا
ہوش مسٹر کے نہیں رہتے بجا

پڑھکے جو اوقات سے کرتے ہیں کام
مفلسی پھر جھک کے کرتی ہے سلام

ہند ان باتوں سے غارت ہو گیا
جو کمایا چار دن میں کھو گیا

پڑھکے جب اسکول سے فرصت ملی
مل گئی قسمت سے انگلش نوکری

ماہواری تو مقرر ہیں پچاس
لیکن انکو رہتی ہے رشوت کی آس

اسپہ فرنیچر ہو اور انگلش لباس
تا نہ آئے عمر بھر غم آس پاس

باپ بھائی کو تو اک کوڑی نہ دی
اپنی ہی پوری نہیں پڑتی کبھی

کمپنی کے بل چلے آتے ہیں روز
دھوبی نائی ہاتھ پھیلاتے ہیں روز

خانساماں آکے کرتا ہے سلام
دیجئے انعام تو بنجائے کام

پھر بڑے دن کا جما ہے کچھ سرور
ڈالیاں جائیں گی صاحب کو ضرور

ٹھاٹ اپنے بھی ہوں کچھ ایسے عیاں
سب کو ہو ڈپٹی کمشنر کا گماں

ایسا بنگلہ بھی ہو رہنے کے لیے
دیکھکر ہر شخص دل مسٹر کے

مختصر سا اک پڑا ہو سائباں
اور نوکر پہنے ہوں سب وردیاں

گھر کی دولت خرچ جس دم ہوگئی
آخر آخر قرض کی نوبت ہوئی

سمجھے بیٹھے تقلید حاکم دل لگی
کھائی جب ٹھوکر تو یہ حکمت کھلی

تمکو صاحب بنکے رہنا ہے اگر
روپیہ بھی تو کماؤ اُس قدر

مختصر یہ ہے کہ چھوٹا آدمی
عیش و راحت کی نہ ڈھونڈھے زندگی

پاؤں چادر سے نہ پھیلائے سوا
جو نہ مانے گا وہ چکھے گا مزا

ملک کی پوشاک کافی ہے اسے
یہ خس و خاشاک کافی ہے اسے

وضع اپنے ہند کی چھوڑو نہ تم
منھ پرانی چال سے موڑو نہ تم

قوم میں پہلے جو تھے ریفارمر
کنبہ پرور ہوتے تھے وہ کسقدر

موٹی روٹی پر قناعت کرتے تھے
نام پر اتنا نہ اگلے مرتے تھے

سادہ پوشاکو تھیں ان پر نور تھا
کام کرنے میں ہر اک مزدور تھا

ورد تھا انکے دلوں میں غیر کا
شوق تھا انکو جہاں کی سیر کا

ہو محلے میں کوئی بیکس اگر
ہر گھڑی لیتا انہیں اس کی خبر

وقف دولت تھی یتیموں کے لیے
صرف ہمت تھی یتیموں کے لیے

آپ کھاتے تھے بقدر لایموت
دل تھے روشن لب پہ تھی مہر سکوت

انکی عزت صرف ہمدردی سے تھی
سب سخاوت انکی بیغرضی سے تھی

وہ پھٹے کپڑوں میں بھی سردار تھے
راضی اُنسے سارے رشتہ دار تھے

آج کل یہ ذہن میں ہر اک کے ہے
لندنی پوشاک ہے عزت کی شے

اپنی آمد کا نہیں کرتے خیال
طرز انگلش اُنکے حق میں ہے وبال

روپیہ بھی خرچ ہوتا ہے فضول
اور بدنامی بھی ہوتی ہے حصول

فاقے مرتے ہیں عزیز و اقربا
انکو کچھ پروا نہیں ہوتی ذرا

کہتے ہیں یہ اصل عزت ہے لباس
عمدہ کپڑے ہوں ضرور انسان کے پاس

رشوتیں اسکے واسطے کھاتے ہیں یہ
کپڑے انگریزی ہی سلواتے ہیں یہ

قرضداری پھر ستاتی ہے انہیں
خوب مکاری سکھاتی ہے انہیں

بدچلن ہو جاتے ہیں خانہ خراب
کرتے ہیں آخر علین وہ بے حساب
یہ کرامت ہے اسی پوشاک میں
ایسی عزت ہے اسی پوشاک میں
تمکو کچھ درکار ہے عزت اگر
چاہتے ہو دولت و حشمت اگر
نیک چلنی کی طرف رغبت کرو
نیک ہو جو اس کی تم عزت کرو
حکمرانی کرتی ہے دل پہ یہی
جمع کر دیتی ہے زر در کو زر یہی
حیثیت سے بڑھ کے پہنو کم لباس
نیک چلنی کو رکھو تم اپنے پاس

افسانۂ عالم

زمانے کی اُلٹی ہوا ہو رہی ہے
غریبوں پہ سختی سوا ہو رہی ہے
مذاہب کی ہر وقت جنگ و جدل ہے
مریضوں کی اُلٹی دوا ہو رہی ہے
بہت ناز تھا جس پہ ہندوستان کو
وہ روحانیت اب فنا ہو رہی ہے
مٹی جاتی ہیں مشرقی سب زبانیں
جہالت مزاج آشنا ہو رہی ہے
نصاب مدارس میں گتھی پڑی ہے
گورنمنٹ عقدہ کشا ہو رہی ہے
تمدن کی حالت دگرگوں ہوئی ہے
ترقی بھی ہم سے خفا ہو رہی ہے
سب اخلاق اب خواب دوشیں بنے ہیں
کہ تقلید مغرب سوا ہو رہی ہے
شریفوں کو افلاس نے یہ مٹایا
کہ اب زندگی بے مزا ہو رہی ہے
کوئی قحط سالی کا ہو نظم کامل
گورنمنٹ سے التجا ہو رہی ہے
جہاں میں ہے اجلاف کا دور دورا
انہیں کی تو نشو و نما ہو رہی ہے
گرانی غلہ سے ہیں لوگ عاجز
کہ عنقا نوید غذا ہو رہی ہے
ادھر جنگ یورپ میں پھیلی ہوئی ہے
ہر اک جان وقف قضا ہو رہی ہے
یہ آتش بہت جلد ہو سرد عشرت
یہی اپنی ہر دم دعا ہو رہی ہے

آزادیِ نسواں کی آئندہ خوشخبری

اک معزز یورپین سے ایک ہندی نے کہا
عورتوں کو بند رکھیں ہم خزانہ کی طرح
انکو پڑھنے بھیجدیں ہم نارمل اسکول میں
چاردیواری میں انکو قید رکھیں رات دن
گھر سے جانیکی اجازت ہو نہ انکے واسطے
انکے جلسے منعقد ہر سال ہوں ہر شہر میں
لیکچر ہوں یہ زنانی محفلوں میں اس طرح
ہر نمائش گاہ میں انکے قدم جائیں ضرور
کیا ہر اک جلسے کے پہلو میں ہوں پردیکے قریب
اسکے ہر پہلو پہ پہلے غور فرمائیں حضور
ہنسکے فرمایا ولایت میں رہو تم کچھ دنوں
آج بے پردہ ہے جو قوم اسکی حالت دیکھلو
واقعوں کو اسکے دو تطبیق اپنے حال سے
بات یہ ہے منہمک ایسے ہیں ہم تقلید میں
چل رہی ہے اسقدر الٹی ہوا تقلید کی
بنگئے ہیں آجکل وہ قوم کے ریفارمر
آہ اے قوم اسقدر تجھمیں ہوئیں تبدیلیاں
سو رہے ہیں آجکل سارے مسلمان قبر میں

آپکی کیا رائے ہے پردہ کی بابت اے جناب
یا انہیں گھر گھر پھرائیں شکل زرد آفتاب
اپنے گھر میں یا پڑھائیں اک مسائل کی کتاب
حسن کی انکے دکھائیں یا ہر اک کو آب و تاب
یا پئے تفریح اپنے ساتھ ہوں وہ بے نقاب
ناچ گھر انکے لیے تیار ہوں با آب و تاب
سنکے جسکو سر دھنیں پردیکے باہر شیخ و شاب
فائدہ تحقیق علمی سے اٹھائیں بے حساب
ہر مقرر کی نئی تقریر سے ہوں فیضیاب
بعد اسکے دیجئے عقلی دلائل سے جواب
تم کو ملجائیگا خود ہی ان سوالوں کا جواب
اتنی تحقیقات میں کیوں اسقدر ہے پیچ و تاب
فیصلہ پھر عقل کامل آپکا کردیگی شتاب
ہیں پسندیدہ اسی سے سبکے فعل ناصواب
اب وہی اچھی ہوئیں باتیں جو پہلے تھیں خراب
جنکو ممنوعات سے بالکل نہیں ہے اجتناب
آہ اے قوم اسقدر تجھمیں ہوا ہے انقلاب
اور سمجھے اسلام کی باتیں ہیں اوراق کتاب

پردہ داری میکند بر قصر کسریٰ عنکبوت
چغد نوبت میزند بر گنبد افراسیاب

سچی آزادی

کام مذہب سے نہ ملت سے غرض ہے کوئی
ساتھ وکٹوریہ پارک میں ہو و الفت ہر دم

وہ پری زاد ہو پہلو میں بٹھا سکیں لیکن
پیچھے سائیس ہو اسٹپر ہو سبک رو کم کم

باتیں کچھ پیار محبت کی بہم ہوتی ہوں
قوم کی مرثیہ خوانی ہو پئے جاہ و حشم

وہ مہذب ہو تو میں بھی ہوں [illegible] لیڈر
صرف پوشاک پہ صورت پہ نظر ہو ہر دم

فوٹو لینا ہو تو ازرہ احسان کہیں
ایسی تصویر ہو [illegible] رکھنے کا جدا ہو البم

کبھی جھگڑا ہو تو پا جائے وہ جنگ جدل
لازمی ہے کہ روا نہ کریں الٹی میٹم

الیکشن ہو مقرر کہ کریں تحقیقات
اک وزیر ہو معاون کہ کرے جوش کو کم

چاہتے ہو ریل اپنا کہ فیشن ایبل ہوں
وہ یہ درخواست کریں ہم ہیں مہذب بیگم

ہیں کہوں میں نے فلاں جگہ دیا ہے لکچر
وہ کہے میرے مضامین ہیں تو انہیں ضم

فیصلہ اپنے موافق کرے جج آخر کو
پھر کہیں بغلیں بجا کر سر اجلاس یہ ہم

فاش می گویم و از گفتہ خود دلشادم
بندۂ عشقم و از ہر دو جہاں آزادم

جو گھٹے ہیں زیادہ وہ بڑے کم ہیں

ہم نے مانا کہ مدا ہے سودیشی تحریک
بابو صاحب مگر اس وقت بہت برہم ہیں

[illegible]
دل ہی بے چین ہے آنکھیں بھی [illegible] ہیں

[illegible]
اس لیے ہم ہمہ تن کیفیت ماتم ہیں

[illegible]
غیر کھاتے [illegible]

[illegible] انقلاب
ہم تو مغموم ہیں پر غیر بہت خرم ہیں

[illegible] ہوں نصیب اعدا
غیر کھا جاتے ہیں دولت جو کما سکتے ہم ہیں

[illegible] اپنی دولت
[illegible]

صنعتیں سیکھیں گے سب اپنی ضرورت کیلئے
جس قدر ردی ہیں وہ سب غیرت جام جم ہیں

اپنے آئینے میں منہ آپ ہی دیکھیں اپنا
آج سے متفق اللفظ ہی باہم ہیں

کرسیاں ہند سے ہو جائیں روانہ فی الحال
ٹاٹ کے فرش پہ قالین ہیں یا جاجم ہیں

لیکن اک بات مری یاد رہے یاد رہے
جو کھرے ہیں زیادہ وہ بہت کم ہیں

ہندوستان کی غپ شپ

ہند میں سب ہو رہے ہیں آجکل زیر و زبر
گہ بیاید دانہ خشک و گہ زفکر آب تر

ایک روتا ہے کہ ناقص ہے یہ اصلاحی سکیم
دوسرا ہنستا ہے اپنی قوم کے اعزاز پر

کانگرس کے لیڈروں کی ہوتی ہے تقریر کچھ
اور مسلم لیگ میں ہوتی ہے تقریر دگر

مغربی اخلاق سے اب ہند میں پھیلا ہوا
مشرقی تہذیب کھسکی اور پیچھے کو باندھ کر

مشرقی بنگال میں ایسا ہوا بھاری فساد
سیکڑوں قربانیاں ہوئیں گلیں اک [illegible]

ریلوے کے سے تصادم کا جہاں میں زور و شور
ٹکریں لینے سے ہو جاتا ہے جانوں کا خطر

لڑ رہے ہیں اسلیے ہندو مسلماں آجکل
سرزمیں ہند میں کیسا مچا ہے شور و شر

ایک کہتا ہے کہ ماتا ہند کے پوتر ہیں ہم
دوسرا کہتا ہے مفتوحہ ہمارا ہے یہ گھر

ایک کہتا ہے ہوئی تقسیم بنگالہ خراب
دوسرا کہتا ہے میں مصلحت سے ہے اسقدر

واقعی ڈھونڈتی ہے اسطرح ہر قوم اپنا ہی مفاد
کچھ نہیں ہے دوسری قوموں کے نقصان پہ نظر

حیرت آباد تماشا جلوہ گاہ دہر ہے
طوطیانِ ہند راہ بستہ ہی گیرد مگر

قومی تبران

کیا کیا بگڑ رہے ہیں ہندی سنور سنور کے
زینے سے آ رہے ہیں نیچے اتر اتر کے

تعلیم سے ہے خالی تہذیب ان کی ناقص
ہیں دھوبیوں کے کتے نہ گھاٹ کے نہ گھر کے

یہ اختلاف قومی افسوس آ رہا ہے ہم کو
بٹھا لو اپنے گھر میں جھگڑے جہان بھر کے

قومی رفتار پر یہ پھبتی کہی یہ اچھی — اک ٹھنڈ سے کھڑے ہیں سوکھے ہوئے شجر کے
اب خوبیاں ہماری ہیں یا تراب بالکل — گویا مسافر و نہیں سامان ہیں سفر کے
واعظ بھی کس مزے سے کہتا ہے اپنے دل کی
ٹھہرا رہے ہیں تھے نادان ادھر اُدھر کے

سودیشی تحریک

پہلے ہم کھو چکے سب صنعت و حرفت اپنی — اور عادت بھی زمانہ ہوا یہ چھوٹ گئی
رہ گئی تھی جو باہم وہ آپس کی مروت بالکل — طوطا چشمی یہ زمانہ کی گلا گھونٹ گئی
متفق جتنے تھے سب ہو گئے آخر کو جدا — ایک سانچے کی جو ہانڈی تھی وہ یوں پھوٹ گئی
یاد دلوا دیا تقسیم نے بنگالہ کی — تم جو باندھے ہوئے دولت تھے کہیں چھوٹ گئی
پھر وہ دلوا دیا سمجھایا کہ خدا خیر کرے — آس مدت سے لگائے تھے وہ سب ٹوٹ گئی
پاس تھے درد جو پہلو میں اٹھا یا آ کر — بیکسی سینے کی حسرت کو بہت کوٹ گئی
اپنا بھلا روئے بیٹھ گیا چاک گئیں جب چڑیاں کھیت — آنکھ کھولو وہ زمانہ نہیں وہ لوٹ گئی
جوش پیدا ہوا ایسا کہ خدا خیر کرے — ہاتھ سے صبر و تحمل کی عنان چھوٹ گئی
کل تو توبہ کے لیے شیشہ سے توڑا تھا
آج شیشہ کے لیے توبہ سے ٹوٹ گئی

قومی چور

دولت کے کمانے کا کوئی ڈھنگ نہیں — محنت بھی کریں ہم کو کوئی ننگ نہیں
لیکن یہ ہے بہتر کہ بنیں قومی چور — لوٹا کریں ہر وقت مگر جنگ نہیں
ہو جائیں جو لڈو تو نہیں سبک کیا غم ہے — ہر ایک ترازو میں تو پاسنگ نہیں
دولت کے کمانے کے طریقے ہیں یہی — یہ رنگ زمانے کے ہیں نیرنگ نہیں

یہ شکر ہے ملتا ہے ایسوں کو بہت — قوموں کے خیالات ابھی تنگ نہیں
بیقاعدہ ہم کرتے ہیں خود کام شروع — تصنیف یہ وہ ہے جسکی فرہنگ نہیں

قوم کی حالت کا فوٹو

خراب آجکل ایسی ہے قوم کی حالت — کہ عام طور سے شاکی ہیں جسکے اہل نظر
وہ لوگ جو کہ ترقی کے آسمان پر تھے — پڑے ہوئے ہیں تنزل کے قعر میں اکثر
وہ قوم جسکی معرفت تمام دنیا تھی — وہ قوم جسکی جہاں میں نظیر تھی کمتر
پڑی ہوئی ہے مذلت میں اسطرح افسوس — کہ آج رونے بھی والا نہیں کوئی اُس پر
تمام ہند میں اس کی پکار ہے ہر سو — بتاؤ قوم ترقی کرے بھلا کیونکر
یہی تو ہوتا ہے پہلا سوال اُس کا بھی — کوئی رفارمر آکر جو دیتا ہے لکچر
کہ کھول دو کہیں قومی ترقیوں کے باب — ہیں بند اسکے سبب سے فلاحیت کے در
پر آہ، حل نہیں ہوتا ہے یہ معما بھی — کہ بی بہار کا بھی ہوگا اس چمن میں گذر
ہر اک جگہ پر اک انجمن بھی ہوتی ہے — ہر ایک جلسہ میں ہوتے ہیں چند نوحہ گر
یتیم خانہ کی بنیاد پڑتی جاتی ہے — ہر ایک جگہ پہ سوسائٹیاں ہیں جلوہ گر
مگر ترقی اسلام آہ کچھ نہ ہوئی — ہمارے مقصدِ اعلیٰ کے سٹ گئے جوہر
نہ کچھ وقار ہمارا جہاں میں باقی ہے — نہ کچھ ہماری ہے عزت میان اہل ہنر
حقوق ہوتے ہیں پامال اسطرح اپنے — مگر کسی کو بھی ہوتی نہیں ہے آہ خبر
سبب یہ ہے کہ مسلمان فرقہ بندی سے — مثالِ بازیٔ گنجفہ ہو گئے ابتر
یہ اتفاق سے باہم جو میل جول رکھیں — تو اسقدر نہ مصیبت ہو ان کی جانوں پر
ہمیں تو حکم ہے اسلام کا ہماری قوم — نہ خاندان کی ہے قائل نہ ملک کی خوگر
ہماری قوم جسے کہتے ہیں وہ مذہب ہے — عجم ہو ترک ہو ہندی ہو یا کوئی بربر
قبول کر لیا اسلام جس نے خوبی سے — ہماری قوم میں داخل وہ ہو گیا یکسر
اگر امیر ہے وہ تو ہمارا آقا ہے — اگر غریب ہے وہ تو ہمارا ہے افسر

صورتِ حال

کوئی بھی لیڈر نہیں ہے آجکل — فوج میں افسر نہیں ہے آجکل
مٹ گیا سڑکون سے سارا لکھنؤ — مفلسوں کا گھر نہیں ہے آجکل
میکشی مجبوریوں سے چھٹ گئی — پاس اپنے زر نہیں ہے آجکل
مس بنی ہیں ہند کی سب بیبیاں — حاجتِ زیور نہیں ہے آجکل
سب کے سب ٹینس میں ہوتے ہیں شریک — گنجفہ چوسر نہیں ہے آجکل
ٹوٹی پھوٹی جو نہ انگریزی بکے — وہ کوئی مسٹر نہیں ہے آجکل
آتشِ بغض و حسد ہے مشتعل — بند بابِ شر نہیں ہے آجکل
رشوتیں کھانے لگے اجلاس پر — حاکموں کا ڈر نہیں ہے آجکل
چہروں پہ کرزن فشن کا نور ہے — مونچھ کا چھپر نہیں ہے آجکل
مذہب و ملت سے ہیں بیزار سب — جنت و کوثر نہیں ہے آجکل
ورطۂ غم میں ہیں ابنائے جہاں — ناصر و یاور نہیں ہے آجکل
کسقدر ہے پنچ ذاتوں کو عروج — فرقِ خیر و شر نہیں ہے آجکل
وہ بہ پرِ پرواز رکھتا ہی نہیں — جسکے گھر موٹر نہیں ہے آجکل
خارج از تہذیب وہ القاب ہے — جسمیں لفظِ سر نہیں ہے آجکل
اُسکی عزت خاک بھی ہوتی نہیں — جو کوئی نوکر نہیں ہے آجکل
کون ایسا ہے کہ جسکو ہر گھڑی — فکرِ اخذِ زر نہیں ہے آجکل
لیڈیاں آزادیوں پر ہیں مصر — مقتدر شوہر نہیں ہے آجکل
جسکو انگریزی زبان آتی نہو — اسمیں کچھ جوہر نہیں ہے آجکل

رائیگاں حسرت ہوا اپنا کمال
پرسشِ جوہر نہیں ہے آجکل

صوبہ بہار کی فریاد

مائی لارڈ! آپ ذرا سُن لیں مصیبت میری
درد آمیز ہے دنیا میں حکایت میری

میں سوا آپکے فریاد کروں اب کس سے
آپکو بڑھ کے ہے ماں باپ سے الفت میری

بارہا آپ نے عزت مجھے بخشی ہے حضور
آپ کے ہاتھ میں اسوقت ہے عزت میری

مجھکو بنگالیوں کے ساتھ مقید نہ کرو
ورنہ ملجائیگی سب خاک میں عزت میری

مثلاً وہ شاد ہیں اور میں ہوں فصیح و ابلغ
اُنکی صورت میں نہیں ملتی ہے صورت میری

سر پہ ٹوپی ہے نہ پاؤں میں ہے جوتا اُنکے
یونہیں ہو جائیگی آخر کو بُری گت میری

ساتھ کوّوں کے نہ طوطی کو کرو قید قفس
اُنکا اعزاز ہے اس امر میں ذلت میری

آج تک مجھ میں ہیں موجود معزز احباب
آج تک دہر میں مشہور ہے صولت میری

لکھنؤ آگرہ کے ساتھ ملا دو مجھکو
گر بدلنا ہے کچھ انصاف سے حالت میری

صوبۂ متحدہ مجھکو بنا دو اے کاش
کہ انہیں شہروں سے ملتی ہے شباہت میری

بنگالیوں کی دوستی

یہ کیسی دوستی ہے اور کیا پاس محبت ہے
سر اک تقسیم بنگالہ پہ ناراضی ہے حجت ہے

وہ بنگالہ کا ٹکڑا الگ کیا گیا جا کے لندن میں
کہ جس سے دوسرے حصہ سے تمکو یہ عداوت ہے

غضب ہے قسمت بنگالہ پہ نالاں ہیں بنگالی
ستم ہے اپنے ہی ہم قوموں سے اسدرجہ رقابت ہے

نہیں بہتر سے ہو تم سب یا تم سے بہتر ہے بالکل
کہ ہندی ہو کے ہندستانیوں ہی سے عداوت ہے

ہوا معلوم جو گاتے ہو اپنا راگ گاتے ہو
کہ دشمن ملک کے ہو تم تمھاری یہ شرارت ہے

اگر آسام میں ہندی نہیں رہتے تو تم سمجھے
اگر ہندوستان ہے وہ تمھاری یہ حماقت ہے

حماقت ہے نہیں سمجھے بلکہ مذہب کا تعصب ہے
مسلمانوں کا نقصان چاہتے ہیں یہ جہالت ہے

بھلا ایسی جہالت کا کوئی کچھ بھی ٹھکانا ہے
مٹے جاتے ہو ذاتی فائدہ پر یہ تو حالت ہے

بھلا چاہے گا جو غیروں کا اُسکا بھی بھلا ہو گا
بُرا چاہے جو اپنے ملک کا اُسکو مذلت ہے

خطرناک دوست

اس سے پہلے تمام بنگالہ
ہو رہا تھا غریب اور تباہ

خاص کر انمیں جو مسلماں تھے
اُنکی حالت تھی اور بھی جاں کاہ

ایک تو نوکری نہ ملتی تھی
دوسرے قحط خاں کا خیمہ گاہ

نہ تجارت کی تھی تمیز اُنہیں
اور نہ دولت کما نیکی پرواہ

بے زری سے خراب حالت تھی
چاہ میں زر کی جھانکتے تھے چاہ

قحط سالی کے ہو رہے تھے شکار
غیر قوموں سے تھی نہ رسم نہ راہ

گو گورنمنٹ کی رعیت تھے
پر تھے محروم اُس کے فیض سے آہ

لاٹ کرزن نے کر دیا تقسیم
اُسکو وضو بے نیر براے رفاہ

سوکھے دہانوں میں آ گیا پانی
خوش ہوے سب کے سب ترقی خواہ

پا گیا صوبۂ جدید قرار
کھل گئی نوکری کی تازہ راہ

پر فلک کو یہ پھر خیال آیا
کہ مسلماں نہوں غریب تباہ

اُنکی بھی نوکری ہو دفتر میں
یہ بھی پائیں مراد خاطر خواہ

اسپہ ناراض ہو گئے احباب
یہ خدا اور یہ قصور ہے آہ

اب یہ ضد ہے کہ مسترد ہو جائے
پھر ہو بنگال اسی طرح پہ تباہ

پھر مسلماں بھوکے مر جائیں
نہ کہ دوبارہ اُٹھائیں خاطر خواہ

واے بر دوستاں کہ می خواہند
دوستاں را زوال نعمت و جاہ

جاپان کی سوشل حالت

جاپان کے اسباب ترقی سن لو — تم بھی کرو پیدا کوئی ایسی صورت
کچھ خاص و عوام میں وہاں فرق نہیں — بہتر ہے ہر اک قوم سے جسکی حالت
مزدور ہوں مفلس ہوں غریب و امیر — آپس میں ہر اک کی ہے مساوی عزت
گاڑی میں مسافر اگر آجاتا ہے — اعزاز سے سب کرتے ہیں اسکی عظمت
پہلو میں امیروں کے مزین ہیں غریب — الفت انہیں اُنسے، انہیں اُنسے الفت
خود شاہ ہیں اس امر کے پابند اتنے — ملجائے غریب اُنکو اگر بد قسمت

پہلے اُسے تعظیم سے کرتے ہیں سلام
یہ ہاتھ اٹھانے میں ہے حاصل سبقت

ایضاً

پہلے شاگرد تھا یہ یورپ کا — اب ہے جاپان روس کا دشمن
دھوم ہے اسکی جان نثاری کی — مرحبا اے حریف شیر افگن
واہ کیا جنگ زرگری کی ہے — نام دنیا میں ہو گیا روشن
فتح کی انبساط ہے سب کو — خوش نہیں پر فرانس اور جرمن
بن گیا ہے کمال صنعت سے — آج جاپان غیرت لندن
ایشیا آج فخر مغرب ہے — رشک تعلیم یافتہ کو دلن
بحر و بر میں شکست دی تو نے — تیغ زن تو ہے اے جراءت افگن
کہہ رہا ہے تمام یورپ یہ — کس نیاموخت علم تیر از من

کہ مرا عاقبت نشانہ نکرد

الناس باللباس

دل یہ کہتا ہے ہو لباس نفیس — جس میں پوشاک کی رہے نہ ہوس
کبھی بانات ہو کبھی مخمل — کبھی کمخواب ہو کبھی اطلس
کامدانی ہو جامدانی ہو — دل کو مرغوب ہے چکن ازبس
وہ ذری کار جوب نادر کار — دیکھکر خوش ہو ہر کس و ناکس
ہو گلہ ریشمی چکن کی سبک — اسمیں جالی کھلی ہوئی انفس
کرتہ وہ چارخانے کا باریک — چھن رہی ہو نسیم صبح نفس
ہو قبائے نفیس بوٹی دار — چپکن اچکن عبا قبا انفس
اور عمامہ ہو زریں کار — جو کہ ہو سر پہ ہر طرح چوکس
خاص ملبوس قیمتی نایاب — جوڑے ہر ایک طرح کے دس دس
بجلی دیکھے تو اس کو شرمائے — ہو سواری کے واسطے وہ فرس
داڑھی منڈوایئے برابر صاف — اس چمن میں نظر نہ آئے خس
منہ ہو آئینہ کی طرح شفاف — بیٹھنے پائے ناک پر نہ مگس
الغرض کیجئے بناؤ سنگار — روح جب تک نہ چھوڑے تن کا قفس
زندگی کا تو اعتبار نہیں — عیش کر لیں جہاں میں چار برس
لیکن اس سے نہیں مفاد مجھے — رائے کو اپنی لیتا ہوں واپس
کیونکہ فرماتے ہیں جناب شیخ — اک نصیحت مجھے مفید ازبس
روئے زیبا و جامۂ دیبا — صندل و عود و رنگ و بوئے و ہوس

این ہمہ زینت زناں باشد

شمع محفل

اشک کیوں آنکھ سے اے شمع ترے جاری ہے — بزم میں بیٹھی ہے تو بزم سے بیزاری ہے
روتی ہے زار و قطار آہ یہ غم کس کا ہے — محفل عیش و مسرت میں الم کس کا ہے
باعث گریہ و زاری نہ کھلا کچھ ہم پر — چشم نمناک تری رہتی ہے کیوں اشکوں سے تر
بزم آراستہ ہے بیٹھے ہیں سارے احباب — ہیں کنول جھاڑ ہزار آئینے بے حد و حساب
فرش بھی ایک تکلف سے قرینے سے بچھا — قطعہ رکھے گلدستے ہیں پھولوں کے مناسب ہر جا
صدر دالان میں ہے زینت محفل نوشاہ — گرد بیٹھے ہیں حسینان جہاں صورت ماہ
کتنی آراستہ محفل ہے تکلف سے تمام — چیدہ چیدہ ہیں حسین رشک پری ہیں گلفام
رقص سے ایک پری زاد لبھا لیتی ہے دل — کوکتی ہے کبھی کوئل سی میان محفل
فرحت دل کیلئے آتے ہیں جو آتے ہیں — مصروف گریہ و زاری تجھے سب پاتے ہیں
اسمیں کچھ شک نہیں تو ایک جہاندیدہ ہے — خلوتوں میں تجھے دیکھا ہے وہ سنجیدہ ہے
اگلی پچھلی نہیں ایسی کوئی صحبت باقی — جسمیں تو نور فشاں تھی نہ بصد رعنائی
بادشاہوں کے بھی دربار میں تو جاتی ہے — اور امیروں کے بھی پہلو میں جگہ پاتی ہے
آنکھ سے دیکھتی ہے منہ سے نہیں کہتی ہے — کان سے سنتی ہے جس بات کو چپ رہتی ہے
تو نے دیکھے ہیں وہ دربار مزین زر بار — تو نے دیکھے ہیں وہ اجلاس ثریا آثار
محفلیں دیکھی ہیں تو نے کہ نہ دیکھے کوئی — رونقیں دیکھی ہیں تو نے کہ نہ دیکھے کوئی
جشن نوشابہ میں بھی رنگ جمایا تو نے — لطف ہر عیش پرستی میں اٹھایا تو نے
بزم جمشید میں بھی جام کی رونق تو تھی — قصر غرناطہ کی اور شام کی رونق تو تھی
شاہ اکبر کے اکھاڑے کی تھی زینت تجھسے — تھی ہر اک بزم شب افروز کی عزت تجھسے
قرطبہ کی وہ عمارات طلا کار عجیب — تری پرنور تجلیوں سے ہیں شہرت کے قریب
فخر کیونکر نہ ہو بزم شعرا میں حاصل — وہ سناتے ہیں تجھے شعر سمجھکر عادل
اور تو اور سمجھتے ہیں جنہیں سب عابد — ق — احترام انکا مقدم ہے کہ ہیں وہ زاہد
بزم آراستہ کرتے ہیں وہ خلوت میں اگر — تو وہاں ہوتی ہے پہلے ہی سے تو جلوہ گر

چھپ کے عالم سے کیا کرتے ہیں جو مینوشی / تجھ سے لیکن نہیں ہوتی ہو فرارو پوشی
پایۂ تخت سلاطین کی ہے زینت تجھ سے / شورۂ شام اراکین کی ہے زینت تجھ سے
محفل عیش میں تو نور فشاں رہتی ہے / عشقبازوں کے خیالوں کی زباں رہتی ہے
کیا وہ دربار مکلف جسے اعجاز کہیں ق / دیکھکر جسکو سلاطین جہاں دنگ رہیں
آج مشہور جہاں بزم سلیمانی ہے / دیکھنے سے جسے بلقیس کو حیرانی ہے
اسکی رونق تری اپنے نور شعاعوں سے تھی / اسکی زینت تری دلچسپ اداؤں سے تھی
رام چندر کی جو سیتا سے ملاقات ہوئی ق / اور دشمن کو خطرناک وہاں مات ہوئی
اس خوشی میں کوئی جلسہ جو ہوا تھا برپا / اسکی زینت کا رنگا تیرے قدم نے نقشا
تجھ بغیر نہیں خلوت کا ہو آراستہ ایسا گھر ق / فرش قالین کا ہے بچھی ہو مسہری اسپر
جام رنگا ہے صراحی میں ہو لبریز شراب / اور گزک کے لیے موجود بطے کے کباب
ہم بغل یار سے معشوق پری پیکر ہے / راز وہ اسکا ترے سوا کون وہاں دلبر ہے
دیکھ جو سکتا نہیں یہ عیش کا جلسہ کوئی / چپ رہے صورت تصویر ہو ایسا کوئی
تو جو چاہے یہ وہ ہے اس بات سے انکار نہیں / تو نہو جسمیں وہ دربار میں دربار نہیں
آنکھ خوش کرتی ہے جو لوگ جلاتے ہیں تجھے / آج موصوف ہمہ وصف سے پاتے ہیں تجھے
عقل میں بات یہ آتی نہیں لیکن اصلا / بزم شادی کی شراکت میں یہ رونا کیسا
بارشہ یہ ہے کہ یکایک جو خوشی کی ہو خبر / اشک بھر آتے ہیں آنکھوں میں ہر اک کے اکثر
بس اسی طرح کی ہو جاتی ہو رقت تجکو / ورنہ شادی میں نہ تھی اسکی ضرورت تجکو
جو سمجھتے نہیں کہتے ہیں کہ تو روتی ہے / ہاں کو ہوتی نہیں جو تجکو خوشی ہوتی ہے

ایسی دیوانی تو اے شمع نہیں ہے کچھ تو
نکل آتے ہیں ترے فرط خوشی سے آنسو

کلام عشرت

تہذیب جو پھیلانے کو آئے انگریز ہمنے کہا رہنے دو تم اپنی تہذیب
وہ جہل ہی اچھا تھا کہ سستا تھا اناج یہ علم تو ہے قحط و گرانی کا ادیب

خوف مجکو اسقدر تھا بخت نا فرجام سے ہاتھ میں تسبیح لے لی گردش ایام سے
شاد ہو اے دل بقائے عمر و غم دائم نہیں دل لگی کرتی ہے دُنیا عاشق ناکام سے
ساقیا ساغر پیا پے دے کہ آئی ہے بہار شیشۂ دل ٹوٹ جائیگا سکوت جام سے

کس جگہ تاباں ترا جلوا نہیں آنکھ ہے تو تو لیں پردا نہیں
دونوں عالم میں ترا مہماں ہوں مجکو ہست و نیست کی پروا نہیں

خدا نے ذوق بخشا ہے جنھیں کچھ علم اردو کا بسر ہوتی ہے اُنکی زندگی کس کس مصیبت سے
ہمیں مرہم یہ افلاطوں کی حکمت کا پسند آیا کہ روزی ایک جو بڑھتی نہیں علم و فضیلت سے

ایکدن اور ایک شب کا عمر فانی نام ہے دن تو آخر ہو چکا اب انتظار شام ہے
عشق میں مفلس ہو یا زردار دونوں ایک ہیں اس تماشے میں کہاں تفریق خاص و عام ہے

افسوس کہ ہند کی وہ صورت نہ رہی شوریدہ سری سے خاک عزت نہ رہی
پنجاب کی شورش نے مٹایا کیا کیا اُجڑی ہوئی بستی کی وہ زینت نہ رہی

صد حیف کہ ہند میں وہ ساماں نہ رہا وہ حفظ کا وہ امن کا عنوان نہ رہا
چلتی ہے شب و روز بغاوت کی ہوا ساماں خورد و نوش غریباں نہ رہا

آج آزادی کے جو خواہاں ہیں دیوانے ہیں سب　　اسمیں ہندو یا مسلماں ہوں یہ بیگانے ہیں سب
کام آسکتا نہیں پولیٹکل ایجیٹیشن　　خود غرض اندھے اگر تھوڑے ہیں تو کانے ہیں سب

جاپان ترقی پہ نظر آتا ہے　　محنت سے ہر اک شخص ثمر کھاتا ہے
ہوتا ہے زمانے کا کبھی ایسا رنگ　　شاگرد سے اُستاد سبق پاتا ہے

سب ایک ہوں اب دل یہی للچاتا ہے　　تفریق سے بے چین ہوا جاتا ہے
اب ہند کی پھوٹ پڑ گئی ہے پھیکی　　خربوزے میں قند کا مزا آتا ہے

مشہور دلاوروں میں لاثانی ہے　　روس اُس سے کرے جنگ تو نادانی ہے
دریا میں رہے اور مگرمچھ سے بیر　　پانی کا تو بادشاہ جاپانی ہے

امید تھی نہ کسی کو بھی فتح پانے کی　　خدا نے رکھ لی ہے جاپان کی یہ بات بڑی
غرور و کبر بشر کے لیے نہیں زیبا　　کبھی کا دن ہے بڑا اور کبھی کی رات بڑی

سُن ہی شیخ غریب لیکن خیال کہنہ لیے ہوئے ہو　　کبھی نہ چھوڑیگا اپنا جھگڑا اگرچہ جاری ٹریم ہوئے
فقیر یہ تو لکیر کا ہے سنے گا کیونکر کسی کا کہنا　　گدھے کو موٹر سمجھ رہا ہے تو اونٹ پر حکم ریلوے ہے

وقفِ اولاد کے بارے میں پریوی کونسل　　ایک شبہے میں پڑا ہے وہ مٹایا جائے
فقہ اسلام میں اولاد کا ہے وقف بجا　　شرع کی خاص کتابوں میں دکھایا جائے

ایران کی آئین حکومت کی بدولت　　بے چینیاں پھیلی ہیں عجم اور عرب میں
شہ کہتے ہیں جو اُسکے ہے دستور مخالف　　دونوں کی غرض جان پڑی ایک غضب میں

ظلم و تعصب ایسی مذموم عادتیں ہیں　　دانش پہ آدمی کے جو پردہ ڈالتی ہیں

نا منصفی کی باتیں یہ جاہلی کی باتیں
اچھے بھلے بشر کو گھر سے نکالتی ہیں

آنکس کہ بہ تحریک سودلشی شیداست
کارش ہمہ برخلافِ کارِ عقلا است
حاصل نہ شود بجز خجالت زیں کار
سائے کہ نکو است از بہارش پیداست

یہ کوئی سخت کارزار نہیں
جنگ ترکی نہ رزم روسی ہے
جمع ہولی کے ہیں یہ ہلیارے
اور بوتل میں کچھ لہو سی ہے

ہولی کا زا فقط زبانی نکلا
افلاس بس اک رفیق جانی نکلا
سمجھے تھے گل لالہ بنے گا یہ ہند
جو رنگ اچھالا گیا پانی نکلا

ہولی میں یہ گوہر فشانی کیا ہے
دشنام ہے یا وِرد معانی کیا ہے
وہ رنگ اچھالو کہ کوئی کھیل بنے
بیہودہ فقط چرب زبانی کیا ہے

روزے کا ہے خیال نہ فکر نماز ہے
موٹر کا ذوق شوق ہوائی جہاز ہے
مایوس کیوں ہیں رحمت حق سے گناہگار
ہم دل شکستہ ہیں وہ شکستہ نواز ہے

علاجِ دردِ دلِ بے قرار ہو نہ سکا
یہ کام تجھ سے نسیم بہار ہو نہ سکا

اک مرے خوش ہونے سے سارا جہاں غمناک ہے
برق کے ہنسنے سے چھلنی سینۂ افلاک ہے
خاکساری کر کہ کچھ دنیا میں حاصل ہو فروغ
یاریوں بحر فنا سے ہو اگر بیڑا پار اک ہے
حق نے جو سنئے آدمی کو دی ہے وہ انمول ہے
کان سننے کیلئے ہیں سونگھنے کو ناک ہے

گذر ہوا مرا کل ایک کہنہ تکئے میں
گیا تھا ڈھونڈنے اک بوٹی کیمیا کیلئے
پڑا جو پاؤں کسی قبر پر تو ڈر کے کہا
معاف کر ہمیں اے شخص تو خدا کیلئے

وہاں قبرِ شکستہ سے یہ صدا آئی   اگرچہ وقت معیں نہیں قضا کیلئے
مگر غرور سے بچنا رہے مدام انساں   کہ کبر و ناز تو زیبا ہے کبریا کیلئے
اُٹھا کے سر جو چلے تھے کسی زمانے میں   فلک نے خوب عوض خاک میں ملا کیلئے

جب جوانی میں قدم رکھا، غرور آنے لگا   آئینے سے چار آنکھیں کرکے اترانے لگا

ہوئی نہ دل کو تسلی کسی طرح عشرت   بہار باغ کی جب لوٹ لی خزاں دیکھی

بڑوں کے واسطے اسباب شہرت وجہ نقصاں ہیں   یہ ماہِ نو نہیں ہے شیشۂ گردوں میں بال آیا

مغربی تہذیب پھیلانے لگی اپنا اثر   ہم بھی اب کہنے لگے گڈ مارننگ مائی ڈیر

مروّج ہند میں یورپ کی بولی ہونیوالی ہے   کہار اب کیا کریں، نابود ڈولی ہونیوالی ہے

عدالت میں تو اب جاتے ہوئے اشراف ڈرتے ہیں   سرِ دربار عملے والے سب جیبیں کترتے ہیں

جب انساں کو کچھ فضیلت ہو حاصل   تو لازم ہے اُس کو رکھے برقرار
رہیں نیکیاں عام لوگوں کے ساتھ   شریفوں کی صحبت کرے اختیار

بدچلن لوگوں سے ڈرنا چاہیئے   ہر طرح پرہیز کرنا چاہیئے
جمع جس کوچہ میں ہوں دس مسخرے   اس گلی سے درگذر نا چاہیئے

مشکِ نافہ ہمنشیں نیک ہے   پاس جو آئیگا وہ بس جائے گا
آدمی انگور کے سایہ میں جب   جا کے بیٹھے گا تو کچھ پھل پائے گا

تواضع اہل فن کی ہے علامت کہ شاخ بارور جھکتی ہے اکثر
زمیں میں جسقدر گہرائی ہوگی زیادہ ہوگا پانی اُس کے اندر

چند روزہ ہے فقط روح بدن میں آئی بوئے گل چار ہی دن کو ہے چمن میں آئی
پانی پانی ہوئے غیرت سے پریرو غنچے بے بلائے ہوئے شبنم جو چمن میں آئی
کاندہا عاشق کے جنازے کو جو اُس گل نے دیا بوئے عطرِ گلِ فردوس کفن میں آئی

جہاں میں ڈھونڈنے والے کو کیا نہیں ملتا مگر ہمیں دلِ بے مدعا نہیں ملتا
کہاں ہیں وقتِ مصیبت قرار و صبر و شکیب رفیق کوئی مزاج آشنا نہیں ملتا
بنا رہے ہیں وہ دل میں ہمارے گھر اپنا کہ اس سے بڑھ کے مکاں دوسرا نہیں ملتا
غرور زندگی مستعار بے جا ہے کسی کو مرہم زخم قضا نہیں ملتا
فراغ و صحبت احباب و یار و عہد شباب کہاں گئے کہ کسی کا پتا نہیں ملتا
بشر کو عاقبت کار کا خیال رہے بغیر نیک عمل کے خدا نہیں ملتا
ہجوم غم سے مرے دل میں کیا خوشی آئے یہ بھیڑ ہے کہ کہیں راستا نہیں ملتا
تمام کوچۂ جاناں کی خاک چھان آئے کہیں غریب دلِ مبتلا نہیں ملتا
ہوا ہے سرد زمانے سے دل یہ اے عشرت خوشی میں غم میں کسی میں مزا نہیں ملتا

بزم ابتر ہوئی نکلے جو وہ میخانے سے شیشے توڑے گئے پھینکی گئی پیمانے سے
حکما کہتے ہیں ہوتی ہے غذا جزو بدن ہم تو تحلیل ہوئے جاتے ہیں غم کھانے سے
آپ بھی جلتے ہیں غیروں کو جلانے والے صاف روشن یہ ہوا شمع کے جل جانے سے
محفل آباد رہے، خیر ہو خم کی ساقی ایک دو گھونٹ چھلکتے ہوئے پیمانے سے
قطع کر رشتہ تسبیح اگر دانا ہے کشتِ امید ہری ہو گی نہ اس دانے سے
میکشی ترک نہ مجھ رند سے ہو گی واعظ عہد شیشے سے ہے، پیمان ہے پیمانے سے
دیکھ لو چل کے ذرا سیر وہاں بھی عشرت دو قدم خانۂ اللہ ہے بت خانے سے

مسیح بنکے کوئی معجزہ دکھا دینا / جگر کا درد ہو کم جس سے وہ دوا دینا
کہیں کی دیکھکے تمکو بہشت میں حوریں / ہمیں بھی موہنی صورت ذرا دکھا دینا
فراق یار میں لذت نہیں ہے جینے کی / پلا کے زہر مجھے شام سے سُلا دینا
خدا غریب کی سُنتا ہے غیب سے فریاد / بہت ہے ہاتھ دعا کے لیے اُٹھا دینا
وہ فاتحہ کو جو آئے کہا یہ شوخی نے / چراغ قبر ذرا ہاتھ سے بجھا دینا
جو کوہِ طور پہ موسیٰ کو آئی تھی آواز / وہی صدا دم رخصت مجھے سنا دینا
یہ کہکے قتل سے میرے اُٹھائے ہاتھ اُسنے / کہ بے قصور کو لازم نہیں سزا دینا
کہیں نہ حشر میں بھی دید سے رہیں محروم / کیا ہے وعدہ تو صورت ہمیں دکھا دینا
سنیں وہ یا نہ سنیں اختیار ہے ان کو / ہمیں حقیقتِ دل فرض ہے سنا دینا
نہیں ہے کوچۂ الفت مقام آسایش / یہ بات حضرتِ عشرت کو بھی سنا دینا

بوسۂ تیغ دم قتل اگر مل جاتا / شکل غنچہ گل ہر زخم بدن کھل جاتا
ضبط نالہ جو نہ کرتا میں شب فرقت میں / تھرتھرا جاتی زمیں اور فلک ہل جاتا
دل میں زاہد کے بھی رہتی نہ ہوائے جنت / تیرے کوچے میں جو اے رشک شمایل جاتا
مجھسے نالوں کی اگر بحث عنادل کرتے / چیختے چیختے گلشن میں گلا چھل جاتا
ذائقہ عشق و محبت میں یہ حاصل ہوتا / لوگ کہتے کہ دل آیا ہے اگر دل جاتا

کفر کا نام نہ اندیشۂ اسلام آیا / سبکو بھولا وہ جسے یاد ترا نام آیا
خط کا اس قاتل عالم نے جو لکھا نہ جواب / نامہ بر لیکے مری موت کا پیغام آیا
دل شگفتہ ہوئے مستونکے بہار آپہنچی / پھول کا جام لیے ساقی گلفام آیا

ہر شہر ہر دیار میں مشہور ہو گیا / مجھ سے تو میرا نام بہت دور ہو گیا
وہ آفتاب حسن جو رونق فزا ہوا / محفل میں رنگ شمع کا کافور ہو گیا
اکدم میں آسماں و زمیں کا نشان نہ تھا / نالہ ہمارا ہمنفس صور ہو گیا
مرکر بھی عشق کی نہ گئی دل سے خو مرے / جنت میں جا کے شیفتہ حور ہو گیا

عشرت خفا خفا وہ رہے ہمسے کچھ دنوں   پھر اتحاد ربط بدستور ہو گیا

صبا کو رہتی ہے دن رات جستجو تیری   چمن چمن لیے پھرتی ہے گلگلو بُو تیری

مُردنی چھائی ہوئی ہے صورتوں پر آہ آہ   دل بھرا آتا ہے جلسیں اُنکی خالی دیکھئے
علم سے خالی ہیں تو وہ ہندی، صناعی سیکھئے   بیکسوں کی شکل پہ کچھ تو بحالی دیکھئے

جب سے ہوں پابند متروکات کی زنجیر میں   لطف اُردوے معلی ہے مری تحریر میں
رنگِ ناسخ ہے نہ طرزِ مومن و غالب پسند   ہے شکر ریزی مری بالکل زبانِ میر میں

ہمیں تو فخر ہے اپنی زباں کے جوہر پر   وہ اور ہونگے جو احسان دھر لیں سر پر
ہر ایک بات کا ہے لطف اپنی اُردو میں   یہ گُر وہ ہے کہ تفوق ہے جسکو شکر پر

قدر دانی کا سبق دُنیا میں گو مسدود ہے   لیکن اُردو کی ترقی آج تک موجود ہے

اُنکی نگاہِ ناز سے کیوں طور جل گیا   موسیٰ کا ارتباط رقابت سے کھل گیا
وہ آپ ہوں فراق میں یا اُنکی یاد ہو   کوئی نہ کوئی آکے مرے دلکو مل گیا
سچ تو یہ ہے رقیب نے ڈالا یہ تفرقہ   اقرارِ وصل کرکے وہ مجھسے بدل گیا
دل میرا مجھکو پھیر نہ دینا تھا توڑ کے   یہ چال وہ حسین شرارت سے چل گیا
موسیٰ سے کیوں حجاب کیا کوہ طور پر   کیا اور کوئی دیکھنے والا نکل گیا
اُلفت جتا کے یار کو مغرور کر دیا   اتنو مزاج اور بھی اُن کا بدل گیا
عشرت کٹھن ہے منزلِ الفت کا راستہ   دو ہی قدم میں پاؤں ہمارا پھسل گیا

کمسنی جاتی ہے تو عہدِ شباب آتا ہے   جو مری جان کو آتا ہے عذاب آتا ہے
خط جلاتے ہیں کہ قاصد پہ عتاب آتا ہے   دیکھئے کیا مری قسمت سے جواب آتا ہے

خلوتِ خاص میں شرمانے کا باعث کیا ہے
بے محل آپکو اسوقت حجاب آتا ہے

حسن کی اسکو پرکھ ہے نہ وفاداروں کی
آندھی کیطرح دل خانہ خراب آتا ہے

خط کے پرزے اڑے قاصد بھی وہاں قتل ہوا
منتظر ہم ہیں کہ نامے کا جواب آتا ہے

فضل کی اسکے نہ کچھ حد ہے نہ رحمت کا شمار
پھر ہمیں کیا ہے اگر روزِ حساب آتا ہے

فیضِ ساقی ازل سے ہیں سخن کے میخوار
اک نیا روز یہاں جامِ شراب آتا ہے

مہلت اکدم کی نہیں بحرِ فنا میں حاصل
جو حباب آتا ہے وہ نقش بر آب آتا ہے

انتہا ہو گئی عشرت کی بداعمالی کی
کہ فرشتوں کو بھی لکھنے میں حجاب آتا ہے

ہمارا جذب انھیں کھینچ لائے گا گھر سے
یہ کب امید تھی چھوٹے ہوئے مقدر سے

شہید کون ہوا قتل گہ میں خنجر سے
لہو جو روتی ہے تلوار چشم جوہر سے

بلائے جان ہے بخیلوں کیواسطے دولت
ہلاک ہو گیا قارون کثرتِ زر سے

وہ دو گھڑی جو عیادت کو میری آئے تھے
ابھی تلک آتی ہے بوئے عروس بستر سے

مٹے نہ سوزشِ دل آہ سرد سے یارب
یہ شمعِ بزم نہ ٹھنڈی ہو بادِ صرصر سے

غمِ فراق سے کیوں دل نہ ٹکڑے ٹکڑے ہو
کہ چور چور ہو شیشہ لڑے جو پتھر سے

جگر میں زخم کوئی پڑ گیا نیا شاید
لہو ٹپکتا ہے ہر وقت دیدۂ تر سے

جواب نامہ بھی بھیجا نہ یار نے عشرت
بہت خجل میں ہوا اپنے قلبِ مضطر سے

امام اپنی جماعت کا بنا جب پیرِ میخانہ
صدائے قلقلِ مینا ہوئی تکبیرِ میخانہ

ادھر توبہ شکن نکلی تو بہ ٹوٹے اسطرف کوزے
کلیدِ ابر قفلِ ابجدِ تقدیرِ میخانہ

کریں ہم بادہ کش گر قصد بھی صحرا نوردی کا
بنے موجِ شرابِ آتشیں زنجیرِ میخانہ

جنابِ شیخ ہم رندوں میں با ریشِ دراز آئے
زہے تقدیر مے خانہ زہے تقدیرِ میخانہ

بہار آنے دو حل ہو جائینگے مضمون لاینحل
بنے گا باغ میں ہر برگِ گل تصویرِ میخانہ

جنابِ شیخ کو بیٹھے بٹھائے آج کیا سوجھی
کھلے لفظوں میں اب ہونے لگی تحقیرِ میخانہ

بیان کوثر و تسنیم زاہد نے کیا ایسا
مری آنکھوں میں عشرت پھر گئی تصویرِ میخانہ

وہ گلستان مین بھی اس خوف سے کم آتے ہین　　بلبل و گل سے پے انصاف ہم آتے ہین
ایک ہاتھ آسکے گریبان مین ہے اک ہاتھ مین دل　　اس طرح معرکۂ حشر مین ہم آتے ہین
لے چراغان سر گور غریبان ہشیار　　قافلے سوے شبستان عدم آتے ہین
برہمن بت سے جو پاتا ہے مرادین اپنی　　یاد کیا کیا تیرے الطاف و کرم آتے ہین

ہلال بدر سے ہو وہ ترا جمال نہین　　کمال حسن خدا ساز کو زوال نہین

متاع نیک کی حاجت ہوئی جب قرب مرگ آیا　　کڑی ہین منزلین واجب ہوا زاد سفر رکھنا
کسی میکش کی اے گلرو چمن مین آمد آمد ہے　　نئے گلرنگ سے غنچون کو ساغر خوب بھر رکھنا

شکر خدا کہ آج مین اس گھر تک گیا　　یاور ہوئے نصیب ستارہ چمک گیا
باد صبا چمن مین ہوئی مورد عتاب　　غنچہ جو اسکے خواب مین کوئی چٹک گیا

امید قطع ہوئی ملگیا جواب صاف　　پھر آیا قاصد غمناک نامہ چاک ہوا

کشش عشق نے یہ کام کیا　　اس نے خود نامہ و پیغام کیا
دیکھکر مجکو جھک گئین شاخین　　بید مجنون نے بھی سلام کیا
حسن انکو تو عشق ہمکو دیا　　فرق مابین خاص و عام کیا

جنکو وحشت ہوتی ہے تعمیر ویران دیکھکر　　کیا کہینگے عالم گور غریبان دیکھکر
ہمنے پہچانا خدا کو روے جانان دیکھکر　　میزبان کا راز پایا رنگ مہمان دیکھکر
ان حسینون نے وفا کی ہے کسی سے دہر مین　　دل انھین دیتا ہے کیا اے دشمن جان دیکھکر
اک گناہ عشق ہے اللہ اکبر اسقدر　　ہاتھ کانون پر رکھین ہمکو مسلمان دیکھکر
خاک مین ملجائیگی اس باغ کی ساری بہار　　خوش نہو اربع عناصر کا گلستان دیکھکر
روتے ہین تکلیف حسن و عشق سے معشوق بھی　　اشک یوسف گر پڑے تنگی زندان دیکھکر

کی جنون مین انتہا کی پردہ پوشی عشق نے — دیدیا صحرا کا دامن مجھکو عریان دیکھکر
واہ کیا انصاف ہی منھہ پھیر لینا آپ کا — اپنے دربان سے مجھے دست و گریبان دیکھکر
آستینین کیون چڑھا لین وہ ہماری قتل پہ — شرم آتی ہو جنھین شمشیر عریان دیکھکر

اب تو وہ غیر کے مہمان ہوا کرتے ہین — سب مرے قتل کے سامان ہوا کرتے ہین

کہتی ہے میر بزم یہی شمع سحر کی — اے اہل جہان فکر کرو زاد سفر کی
دنیا تو حسینون کی محبت مین بسر کی — اب وقت سفر فکر ہے اللہ کے گھر کی
شیدا ہو کے دل عاشق مضطر مین رہینگے — توہین یہ بت کرتے ہین اللہ کے گھر کی
جوہر ہے اگر تجھ مین تو کر گوشہ گزینی — برباد نہ کر عزت و توقیر شہر کی
پھر کر نہین آتا عدم آباد سے کوئی — کچھ خیر خبر تک نہین ملتی ہے اُدھر کی

بیوفا تیری نظر کا رنگ یہ محفل مین ہے — اک چھری سینے مین ہو تو ایک برچھی دل مین ہے
سنتے ہین ہم نے بہت کچھ کوچۂ قاتل مین ہے — ہم بھی قسمت آزمائین یہ ارادہ دل مین ہے

جب ازل مین حسن اپنا آشکارا کر دیا — آگ سینے مین لگا دی عشق پیدا کر دیا
اُسنے جب چاہا کہ دیکھے اپنی صنعت کی بہار — خاک کا پتلا بنا کر اُسکو گویا کر دیا
تمکو پردے سے نکلنے مین اگر انکار تھا — مجھے شیدائی کیون عالم مین رسوا کر دیا

پوچھتے کیا ہو در دولت پہ کیا لائے ہین ہم — نقد عصیان لائے ہین عذر خطا لائے ہین ہم
سر مین سودائے محبت دل مین شوق دید ہے — روز اول سے یہی اک مدعا لائے ہین ہم
حشر مین پوچھیگا خالق تو یہی کہدینگے ہم — ساتھ اپنے عشق محبوب خدا لائے ہین ہم
دل ہمارا قبر تیرہ مین جو گھبرانے لگا — روح بولی نور ایمان کی ضیا لائے ہین ہم

ہم اسیران ہوا و حرص ہین دنیا قفس — سمجھے تھے جسکو نشیمن ہو وہی اپنا قفس

۲۸ن
۱ش

۱۰۹ سرم ۸۹۱ڪ

DUE DATE

~~3.11.76 Cm 19~~

۳۲۲۲۹۳